www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



باب : پنجم

# مرکزِ ملت

مسلمان بننے یا رہنے کے لئے خدائے واحد اور اس کے رسول محمد ﷺ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے رسول اللہ ﷺ پر کس قسم کے ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔

## مقامِ رسالت

مرکز ملت کے تصور پر غور کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ پہلے رسالت کے مقام کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

قران کریم سے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی مندرجہ ذیل حیثیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان مختلف حیثیتوں کو نمایاں کرنے کے لئے اگرچہ قرآن کریم میں بے شمار آیات وارد ہوئی ہیں مگر ہم بغرض اختصار ہر حیثیت کے لئے محض ایک دو آیات پر ہی اکتفا کریں گے۔

۱۔ منصبِ رسالت: ہر رسول مامور من اللہ ہوتا ہے اس میں اس کی اپنی مرضی کو کچھ عمل دخل نہیں ہوتا۔ ارشاد باری ہے:

﴿ اَللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ﴾ (الأنعام٦/ ١٢٤) اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ رسالت کسے عنایت فرمائے۔"

اور خاص رسول اللہ کے متعلق سورہ مزمل میں فرمایا:

﴿ إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَٰهِدًا ﴾ (المزمل٧٣/ ١٥) ہم نے تمہاری طرف رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہ ہے۔

۲۔ سب سے پہلا مومن: رسول سب سے پہلے خود خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی پر ایمان لاتا ہے اور اللہ کے پیغام یا احکام الٰہی کی اطاعت کرتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ اَتَّبِعْ مَآ أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ﴾ "جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے بذریعہ وحی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



(الأنعام٦/ ١٠٦) آتا ہے اس کی پیروی کرو۔"

اور آپ نے فرمایا:

﴿ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ﴾ (یونس ١٠/ ١٥) میں تو صرف اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

پھر اس کے بعد وہ دوسروں کو اس منزل من اللہ وحی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ﴾ (المائدة: ٥/ ٦٧) اے رسول جو کچھ تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا دوسرے لوگوں تک پہنچادو۔

**٣۔ ختم نبوت ورسالت:** رسول اللہ کے بعد نہ کوئی نبی آسکتا ہے۔ نہ رسول، ارشادِ باری ہے:

محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنا رسول بھی کہا ہے اور خاتم النبیین بھی جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ رسول بھی تھے اور نبی بھی نبی اعم ہے اور رسول اخص رسولوں کی تعداد انبیاء کے مقابلہ میں بہت کم ہے یعنی ہر رسول نبی تو یقیناً ہوتا ہے۔ مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ ارشادِ باری ہے:

﴿ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ﴾ (الأحزاب٣٣/ ٤٠) اور ہم نے کوئی رسول اور نہ ہی کوئی نبی ایسا بھیجا ہے کہ جب اس نے کوئی آرزو کی تو شیطان نے اس کی آرزو میں وسوسہ ڈال دیا۔

**نبی اور رسول میں فرق:** اس آیت سے صاف واضح ہے کہ رسول اور نبی دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں اور ان میں بنیادی فرق مندرجہ ذیل ہیں۔

١۔ رسول کے مبعوث ہونے سے پیشتر اس کی آمد کی خبر سابقہ نبیوں کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ جس کی وہ منادی کرتے ہیں۔ لیکن نبی کے لئے یہ بات ضروری نہیں ہوتی۔

٢۔ رسول اپنے ساتھ ایک نئی شریعت لاتا اور ایک نئی امت کی تشکیل کرتا ہے جب کہ نبی اپنے سے پہلے رسول کی مسخ شدہ تعلیم کی اصلاح کرتا اور پہلی ہی امت کے کردار کی اصلاح کے لئے آتا ہے۔

٣۔ لوگوں کی دستبرد سے رسول کی حفاظت اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہوتی ہے جب کہ انبیاء بغیر حق کے قتل بھی کئے جاتے رہے۔

ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ خاتم النبیین تھے (٣٣۔٤٠) جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خاتم الرسل بھی تھے۔

**٤۔ مبلغ رسالت:** رسول کی سب سے بھاری ذمہ داری تبلیغ رسالت ہے۔ ارشاد باری ہے:

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



﴿ ۞ يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُۥ ۚ وَٱللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ ٱلنَّاسِ ﴾ (المائدۃ ۵/ ٦٧)

اے رسول ﷺ جو ارشاد تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو۔ اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کا پیغام پہنچانے میں قاصر رہے اور اللہ تمہیں لوگوں سے بچائے رکھے گا۔

اس آیت سے واضح ہے کہ رسالت اور چیز ہے اور تبلیغ دوسری چیز۔ تبلیغ اعم ہے اور رسالت اخص' رسول اللہ ﷺ ان دونوں باتوں پر مامور تھے لیکن دوسرے لوگ صرف تبلیغ ہی کر سکتے ہیں۔ رسالت ختم ہو چکی لیکن تبلیغ تا قیامت جاری رہے گی۔

۵۔ شارح کتاب اللہ: ہر نبی اور رسول شارح کتاب بھی ہوتا ہے کیونکہ تعلیم صرف الفاظ کو دہرا دینے کا نام نہیں۔ وحی الٰہی کے الفاظ کو سمجھانے اور سکھلانے کا نام ہے۔ درج ذیل آیت اس حیثیت کو وضاحت سے پیش کرتی ہے:

﴿ وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ﴾ (النحل ١٦/ ٤٤)

"اور ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کی تاکہ جو کچھ لوگوں کی طرف نازل ہوا ہے اس کی وضاحت کر دو۔"

اس آیت کی رو سے آپ کو کتاب اللہ کی تشریح' تاویل' تعبیر اور تفسیر کا حق دیا گیا ہے پھر چونکہ یہ تاویل و تفسیر منشائے الٰہی کے مطابق ہوتی ہے۔ اور بصورت دیگر اس پر فوراً تنبیہ کی جاتی ہے لہٰذا یہی تاویل قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے اور باقی سب کچھ غلط اور ناقابل اعتماد۔

٦۔ شارع یا قانون دہندہ: رسول اللہ ﷺ صرف شارع ہی نہیں بلکہ شارع یا قانون دہندہ بھی ہیں۔ گو فی نفسہ قانون سازی کا حق صرف اللہ کو ہے تاہم اس سے متعلق مزید تشریعی قوانین بنانے اور بتانے کا حق آپ کو دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿ ٱلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ ٱلرَّسُولَ ٱلنَّبِىَّ ٱلْأُمِّىَّ ٱلَّذِى يَجِدُونَهُۥ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِى ٱلتَّوْرَىٰةِ وَٱلْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِٱلْمَعْرُوفِ وَيَنْهَىٰهُمْ عَنِ ٱلْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ ٱلْخَبَٰٓئِثَ ﴾ (الأعراف ٧/ ١٥٧)

"وہ لوگ جو نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جن (کے اوصاف کو) وہ اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ انہیں نیک کام کرنے کا حکم دیتا اور برے کاموں سے روکتا ہے۔ نیز وہ پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے۔"

ممکن ہے بعض دوست یہ سمجھیں کہ نبی صرف انہی چیزوں کو حلال و حرام ٹھہراتا ہے جو قرآن میں مذکور ہوئیں تو یہ خیال غلط ہے کیونکہ وہ چیزیں تو مذکور ہو چکیں۔ جب بھی حضور اکرم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم ایسی آیات کی تلاوت فرماتے تھے جن میں حلال و حرام اشیاء کا ذکر ہے تو وہ تو واضح ہو ہی جاتی تھیں۔ حضور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اکرم ﷺ کے اس حلال و حرام ٹھہرانے کے اختیار کو خصوصیت سے بیان کرنے سے صاف واضح ہے کہ آپ ﷺ کو قرآن میں مذکور حلال و حرام اشیاء کے [1] علاوہ بھی یہ اختیار دیا گیا تھا اگرچہ یہ اختیار بھی منشائے الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔

اس مضمون کی وضاحت درج ذیل آیت بھی کر رہی ہے:

﴿ قَٰتِلُوا۟ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَلَا بِٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ ﴾ (التوبۃ ۹/ ۲۹)

"جو لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور نہ ہی ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔ ان سے جنگ کرو۔"

ان آیات سے مندرجہ ذیل دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول کی حرام کردہ اشیاء کو حرام نہ سمجھنے والا کافر اور واجب القتال ہے۔

(۲) رسول اللہ کے احکام بھی ایسے ہی واجب الاتباع ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کے۔ بالفاظ دیگر سنتِ رسول شریعت کا مستقل حصہ ہے اور فقہ و اجتہاد کا مستقل ماخذ۔

**۷۔ مزکی یا تربیت کنندہ ۸۔ معلم کتاب و حکمت:** ارشاد باری ہے:

﴿ هُوَ ٱلَّذِى بَعَثَ فِى ٱلْأُمِّيِّـۧنَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتِهِۦ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ ﴾ (المنافقون ۶۲/ ۲)

"اور وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے (محمد ﷺ کو) رسول بنا کر بھیجا جو ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتے ان کو پاک کرتے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔"

اس آیت میں آپ کی تین حیثیتوں کا ذکر آیا ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ آیات کو لوگوں پر تلاوت کرنا اور یہی تبلیغ رسالت ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

(۲) اپنے متبعین کے نفوس کا تزکیہ کرنا یا ان کی اصلاح و تربیت کرنا۔ انہیں عقائد باطلہ اور اخلاق رذیلہ سے پاک کر کے ان کے افعال و اعمال کی نگرانی کرنا اور ان میں بلند سیرت و کردار کا پیدا کرنا ہے۔ اور:

---

[1] حیرت کی بات ہے کہ منکرینِ حدیث رسول اللہ کی شارع کی حیثیت سے انکار بھی کرتے ہیں۔ مگر اپنی عملی زندگی میں سے اپنائے بھی جاتے ہیں۔ وہ مچھلی اور انڈے بڑے شوق سے کھاتے ہیں اور انہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ قرآن کی رو سے یہ دونوں چیزیں میتہ کے ضمن میں آتی ہیں اور حرام ہیں۔ یہی صورت جگر اور تلی کے گوشت کی بھی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



(۳) اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تعلیم دینا ہے۔ یہ آیت بھی آپ کے شارحِ کتاب ہونے کی قوی دلیل ہے۔ معلم وہ نہیں ہوتا جو محض کسی کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دے بلکہ وہ ہوتا ہے جو اس کتاب کے معانی و مطالب کو بھی کھول کر بیان کرے۔ اس حیثیت سے آپ تمام امت کے استاد ہیں۔ جنہوں نے کتاب اللہ کی تشریح امت کو سکھلائی ہے۔

کتاب اللہ کے علاوہ آپ اپنے متبعین کو "حکمت" بھی سکھلاتے تھے اور یہ حکمت بھی منزل من اللہ ہوتی ہے بیشتر انبیاء پر یہ حکمت ہی نازل ہوئی ہے۔ کتاب نہیں اور رسولوں پر کتاب و حکمت دونوں چیزیں نازل ہوتی ہیں۔ حکمت سے مراد احکامِ الٰہی پر حسب منشائے الٰہی عمل پیرا ہونے کا طریق ہے۔ نیز ان احکام کو معاشرہ میں عملاً نافذ کرنے کے طریقے بھی اس میں شامل ہوتے ہیں (مزید تفصیل آگے چل کر اسی عنوان کے تحت آئے گی) رسول اللہ ﷺ جس طرح امت کو کتاب اللہ سکھلانے پر مامور تھے۔ اسی طرح حکمت سکھلانے پر بھی مامور تھے۔

۹۔ مطاع: متبعین رسول پر واجب ولازم ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿ وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ ﴾ (النساء ٤/ ٦٤) اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔

یعنی رسول کی بعثت کا مقصد ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور خاص رسول اللہ ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدۡ أَطَاعَ ٱللَّهَۖ ﴾ (النساء ٤/ ٨٠) اور جس نے رسول کی اطاعت کی تو بلاشبہ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول کی اطاعت کو اصل قرار دے کر اس کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے اور اس طرح اطاعت رسول کی اہمیت کو واضح فرما دیا ہے۔

**اللہ اور رسول کے مقام کا فرق:** رسول بھی دوسرے متبعین کی طرح اللہ کا بندہ ہی ہوتا ہے۔ (عَبۡدُهُۥ وَرَسُولُهُۥ) وہ اپنی طرف سے نہ کسی بات کا حکم دے سکتا ہے نہ اس کی دوسروں سے اطاعت کروا سکتا ہے۔ اللہ کے لئے عبادت اور اطاعت دونوں چیزیں لازم ہیں۔ جب کہ رسول کی صرف اطاعت لازم ہے۔ یہی اللہ اور رسول کے مقام کا فرق ہے۔ عبد ہونے کے لحاظ سے نبی اور عام مسلمان سب برابر ہوتے ہیں۔ فرق اگر ہو سکتا ہے تو صرف درجہ کا' نوع کا فرق نہیں ہوتا۔

**اطاعتِ رسول کی مستقل حیثیت:** منکرینِ سنت نے یہ ایک نکتہ یہ بھی پیدا کیا ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں۔ ان دونوں کی اطاعت دراصل کتاب اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ اسی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



لئے قرآن میں ان دونوں کی اطاعت کا ذکر اکٹھا ہی آتا ہے۔ اور بعد میں ضمیر بھی [1] واحد کا استعمال ہوتا ہے۔ ان حضرات کا یہ خیال بھی غلط ہے قرآن میں صرف رسول کی اطاعت کو ہی ضرور قرار دیا گیا ہے ایسی آیات ہم "شارع" کی بحث میں پیش کر چکے ہیں۔ چند مزید آیات ملاحظہ ہوں۔

﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا الزَّكَوٰةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٥٦﴾ ﴾

اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دیتے رہو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے (۲۴۔۵۶)

﴿ وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَٰغُ الْمُبِينُ ﴿٥٤﴾ ﴾ (النور ۲۴/ ۵۴)

اگر تم اس رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول کے ذمہ تو یہی بات ہے کہ وہ تمہیں واضح طور پر بات پہنچا دے۔ (۲۴:۵۴)

**۱۰۔ اتباعِ رسول ﷺ اور اُسوہ حسنہ:** اطاعت اور اتباع میں فرق یہ ہے کہ اتباع اعم ہے اور اطاعت اخص' اطاعت صرف کسی حکم کی ہوتی ہے جب کہ اتباع کسی کو کوئی کام کرتے دیکھ کر از خود اسی جیسا کام کرنے اور اسی کے پیچھے پیچھے چلنے کو کہتے ہیں۔ رسول اللہ کی صرف اطاعت ہی کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ آپ کی اِتباع کو بھی لازم وواجب اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

﴿ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ ﴾ (آل عمران ۳/ ۳۱)

(اے رسول لوگوں سے) کہہ دیں کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا (۳:۳۱)

اس آیت کا اندازِ بیان ملاحظہ فرمایئے۔ کجا یہ کہ لوگ اللہ کی محبت کے متلاشی ہیں اور کجا یہ کہ اتباع رسول سے اللہ تعالیٰ خود لوگوں سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ﴾ (الأحزاب ۳۳/ ۲۱)

اور تمہارے لئے اللہ کے رسول کی چال سیکھنا بہتر ہے۔ اس کے لئے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتا ہو۔ (۳۳:۲۱)

**آپ ﷺ کی اتباع تا قیامت ضروری ہے:** اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کی اتباع صرف آپ کے زمانہ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ تاقیامت آپ کی اتباع لازم وواجب ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہ رکھتا ہو یا بالفاظ دیگر کافر ہو۔

رہی یہ بات کہ آپ کی اتباع تا قیامت کیوں ضروری ہے تو اس کی وجوہ درج ذیل ہیں۔ ہر نبی اور رسول مبرا عن الخطا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس سے عملی میدان میں کوئی لغزش بھی ہو جائے تو وحی الٰہی اس کی فورا اصلاح کر دیتی ہے اور اس کی خطا معاف کر دی جاتی ہے کیونکہ۔

---

[1] حالانکہ اس ضمیر واحد کا مرجع رسول ہوتا ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



① (ا) رسول کو یا نبی کو احکام الٰہی کا نمونہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اگر اس میں کوئی جھول رہ جائے تو اس کی زد تمام امت پر پڑتی ہے۔

(ب) یہ عملی نمونہ جب تک پیش نہ کیا جائے احکامِ الٰہی کے سارے گوشے بے نقاب نہیں ہو سکتے۔

(ج) جب تک کسی کو یہ یقین نہ ہو کہ جو عملی نمونہ اس کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ فی الواقع احکامِ الٰہی کی صحیح تعبیر ہے۔ اس وقت تک اسے روحانی اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا جو ایمان کی روح رواں ہے۔

**اتباع صرف رسول ﷺ کی ہے اللہ کی نہیں:** جس طرح عبادت صرف اللہ کے لئے ہے اور اس میں نبی بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ اس طرح اتباع صرف رسول کی ہے۔ خدا کی نہیں۔ کیونکہ اتباع کسی کو دیکھ کر از خود اس کے پیچھے پیچھے چلنے کو کہتے ہیں لہٰذا اتباع ہو ہی رسول کی سکتی ہے اور جب قرآن کی بیسیوں آیات میں رسول کی اتباع کا بھی حکم موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دین وایمان کی تکمیل کے لئے رسول کی اتباع اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ خدا کی عبادت۔

**آپ کی اتباع سے انکار کفر ہے:** مندرجہ بالا تصریحات سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ آپ کی نافرمانی یا مخالفت کفر ہے اور اس سلسلہ میں بھی بے شمار آیات ودلائل قرآن کریم میں موجود ہیں چند ایک ملاحظہ فرمائیے۔

﴿ وَمَن يُشَاقِقِ ٱلرَّسُولَ مِنۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ ٱلۡهُدَىٰ وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيلِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ نُوَلِّهِۦ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصۡلِهِۦ جَهَنَّمَۖ وَسَآءَتۡ مَصِيرًا ﴿١١٥﴾ ﴾ (النساء٤/ ١١٥)

اور جو کوئی راہِ ہدایت واضح ہونے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرے اور مسلمانوں کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ کا اتباع کرے تو ہم اسے اسی راہ پر موڑ دیتے ہیں۔ جس پر وہ مڑ گیا ہم اسے جہنم داخل کر دیں گے جو برا ٹھکانا ہے۔ (۱۱۵:۴)

﴿ فَلۡيَحۡذَرِ ٱلَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنۡ أَمۡرِهِۦٓ أَن تُصِيبَهُمۡ فِتۡنَةٌ أَوۡ يُصِيبَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦٣﴾ ﴾ (النور٢٤/ ٦٣)

جو لوگ اللہ کے رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیئے کہ کہیں ان پر کوئی فتنہ یا دکھ دینے والا عذاب نہ آن پڑے۔ (۶۳:۲۴)

﴿ فَلَا تَنَٰجَوۡاْ بِٱلۡإِثۡمِ وَٱلۡعُدۡوَٰنِ وَمَعۡصِيَتِ ٱلرَّسُولِ ﴾ (المجادلة٥٨/ ٩)

(اے مسلمانو!) کسی گناہ' زیادتی یا رسول کی نافرمانی کے متعلق سرگوشیاں نہ کیا کرو۔ (۹:۵۸)

**ا۔ قاضی اور حاکم:** آپ قاضی اور منصف بھی تھے۔ آپ کے فیصلے کو بلاچون وچرا اور برضا ورغبت تسلیم کرنا ضروری ہے۔ آپ ﷺ کے فیصلے سے نہ اختلاف کیا جا سکتا ہے نہ اس کی اپیل ہو سکتی ہے گویا آپ کی غیر مشروط اطاعت لازم ہوتی ہے۔ ارشادِ باری ہے:۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ ﴾ (النساء٤/ ٦٥)

تمہارے پروردگار کی قسم! جب تک یہ لوگ تمہیں اپنے تنازعات میں منصف نہ بنائیں پھر آپ کے فیصلہ کو دل کی تنگی کے بغیر (برضا و رغبت) تسلیم نہ کریں مومن نہیں ہو سکتے۔

**۱۲۔ قابلِ ادب واحترام ہستی:** آپ ﷺ کی اطاعت میں ادب واحترام اور عقیدت و محبت کا عنصر ہونا بھی لازمی ہے چند آیات ملاحظہ فرمائیے۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿٢﴾ ﴾ (الحجرات٤٩/ ٢)

اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو' اس طرح ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

﴿ النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ﴾ (الأحزاب٣٣/ ٦)

پیغمبر مومنوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔

﴿ لِّتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ ﴾ (الفتح٤٨/ ٩)

تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اسے بزرگ سمجھو۔

﴿ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٥٦﴾ ﴾ (الأحزاب٣٣/ ٥٦)

اللہ اور اس کے فرشتے رسول پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی اس رسول پر دل وجان سے درود وسلام بھیجا کرو۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ادب واحترام میں آپ کے ساتھ محبت اور آپ کو دوسرے تمام انسانوں سے بلند وبالا شخصیت سمجھنے پر زور دیا گیا ہے۔

سو یہ ہے وہ مقامِ رسالت جسے ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ورنہ قرآن میں بیسیوں نہیں سینکڑوں ایسی آیات ہیں جو آپ ﷺ کے اس مقام کی وضاحت کے لئے روشن دلیلیں ہیں۔ اب آپ سوچ لیجئے کہ دنیا کا کوئی دوسرا شخص اس مقام پر فائز ہو سکتا ہے؟

## مرکزِ ملت کے تصور کا پس منظر

مرکزِ ملت کے تصور کا پس منظر یہ ہے کہ منکرین حدیث نے حدیث سے تو انکار کر دیا مگر اب قرآن کے احکام کی تعمیل کے طریق کار کا مسئلہ ان کے لئے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ انکار سنت تک تو ان سب کی راہ ایک تھی مگر آگے چل کر اس سے کئی راہیں پیدا ہو گئیں اور یہ لوگ کسی ایک مسئلہ میں بھی متحد نہ رہ سکے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اور تشتت وانتشار کا شکار ہو گئے۔ بالآخر حافظ اسلم صاحب جیراجپوری نے اس "امت" کے سامنے مرکز ملت کا تصور پیش کیا۔ اس پر عمل درآمد کی تو کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ تاہم آپ خود کسی نہ کسی حد تک مطمئن ہو گئے گویا اس تصور کے موجد آپ کی ذات والا صفات ہے آپ سے پہلے یہ اصطلاح آپ کو کہیں ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی۔ آپ نے جس انداز میں یہ تصور پیش فرمایا وہ ہم "مقام حدیث" سے درج کر رہے ہیں۔

**حافظ اسلم صاحب کا نظریہ مرکزِ ملت:** "چوتھی دلیل جو بڑے شدومد کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ یہ ہے کہ بیسیوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ [1] رسول ﷺ کا حکم دیا ہے۔ اگر حدیثیں دینی حجت نہ ہوں تو یہ اطاعت کس طرح ہوگی؟ دراصل یہی سب سے بڑی غلط فہمی ہے جو حدیثوں کو دین بنانے کا موجب ہوئی ہے۔ میں نے اس مبحث پر ایک مفصل مقالہ "اسلامی نظام" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہاں مختصراً صرف اس قدر لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی دو حیثیتیں تھیں۔

(۱) پیغمبری یعنی پیغامات کو بلا کم وکاست لوگوں کے پاس پہنچا دینا۔ اس حیثیت سے آپ ﷺ کی تصدیق کرنا اور آپ ﷺ پر ایمان لانا فرض کیا گیا۔ یہ پیغمبری آپ کی ذات پر ختم ہو گئی۔

(۲) امامت یعنی امت کا انتظام اس کو قران کے مطابق چلانا اس کی شیرازہ بندی ان کے باہمی قضایا کے فیصلے تدبیر مہمات اور جنگ وصلح جیسے اجتماعی امور میں ان کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ۔ اس حیثیت سے آپ ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم قرار دی گئی".....

**مرکزِ ملت کی وضاحت:** "یہ امامت کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کے لئے قائم ہوئی قیامت تک کے لئے مستمر ہے جو آپ ﷺ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ ہمیشہ رہنی چاہیئے۔ قرآن میں اطاعت رسول کے جو احکام ہیں آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب امامت کے لئے ہیں جس میں آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں۔ ان کی اطاعت رسول ﷺ کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ قرآن میں جہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے مراد امام وقت یعنی مرکزِ ملت کی اطاعت ہے۔ جب تک رسول اللہ ﷺ امت میں موجود تھے۔ ان کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت تھی (اور یہ امت ہمیشہ آپ کی ہی امت رہے گی کیونکہ آپ کے اوپر ایمان لائی ہے) اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت ہوگی۔ اطاعت رسول کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے بعد جو کوئی ان کے نام سے کچھ کہہ دے ہم اس کی تعمیل کرنے لگیں....."

---

[1] یہاں آپ نے اطاعتِ رسول ﷺ کا ذکر کیا اتباعِ رسول عمداً چھوڑ گئے کیونکہ اتباع خدا کی ہو ہی نہیں سکتی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



"دین کی ضروریات قرآن کی اتباع اور امامت وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں۔ امام کے ساتھ منتخب افراد ہوں گے جن کی مشاورت سے وہ اس کو حسب اقتضائے زمانہ قرآن کے مطابق چلائے گا اور اس میں وحدت مرکزی قائم رکھے گا اور متفرق نہ ہونے دے گا۔" (م۔ح' ص:۱۳۰)۔

یہ ہے اس "اسلامی نظام" کا خلاصہ جسے ہم نے مصنف ہی کے لفظوں میں پیش کر دیا ہے۔ اس اقتباس میں آپ نے درج ذیل امور پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) رسول اللہ ﷺ کی صرف دو حیثیتیں تھیں ایک بحیثیت رسول دوسرے بحیثیت حاکم حالانکہ ہم قران سے آپ کی بارہ حیثیتیں پیش کر چکے ہیں۔

(۲) پیغمبری والی حیثیت ختم ہو گئی ہے۔ حاکمیت والی باقی ہے بعد میں آنے والا ہر حاکم چونکہ رسول کا قائم مقام ہے لہٰذا اس کی اطاعت رسول کی اطاعت اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے گویا اس بعد میں آنے والے حاکم یا مرکز ملت کی اطاعت اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت ہے۔

(۳) یہ مرکز ملت قران کو سامنے رکھ کر حسب اقتضآت زمانہ شریعت سازی کرے گا۔

(۴) اور اس مرکز ملت کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ یہ وحدت مرکزی کو بھی قائم رکھے گا۔

**کیا مرکزِ ملت کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے؟:** یہ نظریہ درج ذیل وجوہ کی بناء پر غلط ہے۔

① رسول مامور من اللہ ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرے کسی کو یہ مقام حاصل نہیں۔ مرکز ملت یا تو منتخب شدہ ہوگا۔ یا بزور بازو برسراقتدار آئے گا۔ ان دونوں صورتوں میں غلطی کا امکان ہے۔

② رسول تمام امت کے لئے اسوہ ہوتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کی سیرت وکردار میں کوئی جھول رہ جائے تو بذریعہ وحی اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ مگر مرکزِ ملت کے لئے اصلاح کی یہ صورت ممکن نہیں۔

③ قرآن اور نبی کی سیرت وکردار یہ دو چیزیں مل کر شریعت بنتی ہے اور یہ دوسری چیز بھی یا تو منزّل من اللہ ہوتی ہے یا منشائے الٰہی کے مطابق ہوتی ہے۔ گویا جہاں کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے وہاں پوری شریعت بھی منزّل من اللہ ہوتی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ﴾ (المائدۃ: ۵/ ۴۸)
تم میں سے ہر امت (یعنی یہود ونصاری اور مسلمانوں) کے لئے ہم نے شریعت اور طریقہ مقرر کیا۔

﴿ ثُمَّ جَعَلْنَٰكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ ٱلْأَمْرِ فَٱتَّبِعْهَا ﴾ (الجاثیۃ ۴۵/ ۱۸)
پھر ہم نے آپ کو امر (اقامتِ دین) میں ایک شریعت پر قائم کیا سو اسی کی اتباع کرو۔

گویا قرآن کی رو سے اللہ کی کتاب اور نبی کے ارشادات وافعال مل کر شریعت بنتے ہیں۔ لیکن غیر نبی کے اقوال وارشادات جن پر خدا کی وحی کی مہر نہ ہو وہ کیسے شریعت بن سکتے ہیں؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



۲۔ رسول کی قائم مقامی: نبی کی بارہ مختلف حیثیتیں ہم قرآن سے پیش کر چکے ہیں۔ جن میں مرکز ملت کو صرف ایک حیثیت حاکمیت کی نصیب ہوتی ہے اور دو مزید حیثیتیں (یعنی "شارح" اور "شارع") حافظ اسلم صاحب اسے عطا فرما رہے ہیں۔ جس کا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کیونکہ وہ نبی نہیں ہوتا۔ باقی نو حیثیتیں اس میں سرے سے مفقود ہوتی ہیں نہ وہ مامور من اللہ ہوتا ہے۔ نہ باذن اللہ مطاع' نہ اسوہ حسنہ' نہ مزکی' نہ معلم کتاب حکمت' نہ اس کا ادب واحترام ہمارے ایمان کا جزو ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ جھگڑنے یا اس کا فیصلہ نہ ماننے کی صورت میں ایمان میں کچھ خلل واقع ہوتا ہے۔ نہ ہی یہ مرکز ملت مسلمانوں کے درود وسلام کا مستحق نہ ہی مرکزِ ملت کے نمائندگان کی بیویاں مومنوں کی مائیں تو پھر رسول اللہ کے جملہ اختیارات اسے کیونکر تفویض کئے جاسکتے اور وہ آپ کا قائم مقام کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

۳۔ اقتضآتِ زمانہ: اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ اقتضآت زمانہ ہیں کیا؟ جن کی منکرین حدیث نے رٹ لگا رکھی ہے۔ آئمہ فقہاء نے انہیں اقتضآت زمانہ کا لحاظ رکھ کر ہی تو قرآن وسنت کی روشنی میں اپنی اپنی فقہیں مرتب کی ہیں اور آج کے اقتضآت کا لحاظ رکھ کر نئی فقہ بھی مرتب کی جاسکتی ہے پھر آخر سنت کے انکار کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے۔؟ کیا منکرین حدیث یہ تو نہیں چاہتے کہ اقتضآت زمانہ کے نام پر انہیں قرآن کی تاویل وتعبیر میں بے لگام آزادی حاصل ہو جائے؟ جس کے معلق حافظ (صاحب یہ فرما رہے ہیں کہ "سنت ہمیں ماضی سے وابستہ کر دیتی ہے" (م۔ح۔ ص ۱۳۰)۔

اور اقتضآتِ زمانہ سے غالباً آپ کی مراد یہ ہے کہ موجودہ دور کے غالب رجحانات مثلاً عورتوں کی ہر میدان میں آزادی وسیاسی اور معاشی حقوق' آزادانہ' اختلاط' موسیقی وثقافت ساز ومضراب اور معاشی لحاظ سے کمیونزم نظام کو نہ صرف اسلام میں داخل کیا جائے بلکہ قرآن کی تفسیر وتشریح ہی ایسی پیش کی جائے جس سے یہ چیزیں عین اسلام کی روح ثابت ہوں۔ دراصل یہی کچھ یہ لوگ چاہتے ہیں اور چونکہ اس راہ میں سنت حائل ہے لہٰذا ان کا سارا زور اسی رکاوٹ کو دور کرنے میں صرف ہوتا ہے کیونکہ احادیث رسول انہیں "ماضی سے وابستہ کر دیتی ہیں"

۴۔ مرکزی وحدت: رہا یہ تصور کہ اگر مرکزِ ملت قائم ہو جائے تو امت میں اختلاف ختم ہو جائیں گے اور مرکز ملت کے ساتھ مرکزی وحدت بھی قائم ہو جائے گی تو ہمارے خیال میں یہ حافظ صاحب کی ایسی "خیالی جنت" ہے جس کا عملی دنیا میں وقوع پذیر ہونا ناممکنات سے ہے اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں۔

(۱) آج کے دور میں بھی مسلمانوں کی پچانوے فیصد آبادی سنت کو شرعی قانون کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے ان حالات میں نہ ایسا مرکز ملت قائم ہو سکتا ہے اور نہ اس خیالی مرکزی وحدت کا امکان ہے لہٰذا نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

(۲) اب ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ تمام مسلمان سنت کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



ہوتا ہے کہ اس وقت کم وبیش پچاس ممالک میں مسلمان حکمران ہیں۔ وہ ایک مرکز ملت قائم کرنے پر کیسے رضامند ہو جائیں گے۔ بصورت دیگر وہ اپنے اپنے ممالک میں الگ الگ مراکز ملت قائم کریں گے اور قرآن کو سامنے رکھ کر اپنے اپنے ملک کے لئے الگ الگ شریعتیں تیار کریں گے اور پھر یہ سلسلہ صرف ایک دور تک محدود نہیں تا قیامت جاری رہے گا۔ اندازہ فرمایئے کہ اس طرح تیار شدہ شریعتوں کی تعداد کتنی ہوگی؟ پھر چونکہ ہر ملک شریعت سازی کے وقت اپنے ملک کے اقتضآت کو بھی ملحوظ رکھے گا لہٰذا ان شریعتوں میں اختلاف ناگزیر ہوں گے اور بحث وجدال اور تشتت وانتشار کے کئی نئے میدان کھل جائیں گے۔

(۳) مسلمانوں کی پچانوے فی صد آبادی سنت کو شرعی حجت تسلیم کرتی ہے۔ اور سنت نے ہر فریضہ کی بجا آوری کے لئے ایک متعین شکل سامنے رکھ دی ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کریم کی آیات کی تفسیر وتاویل میں جو کچھ اختلافات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ اب اگر سنت کو پیچھے ہٹا کر محض لغت کی بناء پر قران کی تفسیر وتاویل کی جائے گی تو اس میں جس قدر اختلافات ممکن ہیں اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں پھر اگر لغوی تفسیر وتاویل میں اقتضآت زمانہ کا بھی اضافہ کر لیا جائے جو ہر آن بدلتے رہتے ہیں تو قرآن جس طرح بچوں کا کھیل بن جائے گا اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ سنت کو شرعی حجت ماننے کا ہی طفیل ہے۔ کہ آج دنیائے اسلام میں پانچ چھ فرقوں کا وجود پایا جاتا ہے اور کروڑوں اور اربوں مسلمان کسی ایک فقہ پر جمع ہو گئے ہیں۔

## نظریہ مرکزِ ملت اور طلوعِ اسلام کے دوسرے نظریات کا تصادم

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ مرکز ملت کا نظریہ طلوع اسلام کے بعض بنیادی نظریات سے کیونکر متصادم ہے اور وہ بنیادی نظریات درج ذیل ہیں۔

**۱۔ ظنی چیز دین نہیں بن سکتی:** مقام حدیث میں آپ کو اکثر جابجا ایسے فقرات ملیں گے۔

1. چونکہ احادیث یقینی نہیں ظنی ہیں لہٰذا یہ دین نہیں قرار پا سکتیں"
2. "دین یقینی ہونا چاہیئے۔ ظنی چیز دین نہیں ہو سکتی" دین وہی ہو سکتا ہے جو ظنی اور قیاسی نہ ہو"
3. "یقینی چیز صرف قرآن کریم ہے اور بس۔ قرآن کریم سے پیشتر کی تمام کتب سماوی کو بھی قرآن کریم نے ظنی اور قیاسی قرار دے کر ناقابل اعتماد ٹھہرایا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ:

① جن جزئیات کی تعیین یہ مرکز ملت فرمائے گا وہ ظنی ہوں گی یا یقینی؟ یقینی تو اس لئے نہیں ہو سکتیں کہ قرآن کریم میں یہ جزئیات موجود نہیں؟ اور آپ کا دعوی یہ ہے کہ قرآن کریم کے سوا دنیا میں کوئی چیز یقینی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ جزئیات دین کا حصہ نہیں بن سکتیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



② یہ جزئیات جو اقتضآت زمانہ کے تحت طے پائیں گے۔ ظاہر ہے کہ حالات زمانہ میں تغیر و تبدل کی وجہ سے ان میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہے گا پھر جو چیز خود تغیر و تبدل' ردو بدل اور ترمیم و تنسیخ کی زد میں ہو۔ وہ یقینی کیسے قرار دی جا سکتی ہے اور جو چیز یقینی نہیں وہ دین کیونکر بن سکتی ہے؟

۲۔ فرقہ سازی اور فرقہ پرستی شرک ہے: دوسرا دعویٰ جسے طلوع اسلام اکثر دہراتا رہتا ہے وہ یہ ہے کہ فرقہ سازی اور فرقہ پرستی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔ یہ بات ہمیں بھی تسلیم ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ۔

مختلف ممالک اسلامی کے مراکز ملت جو اپنے اپنے احوال و ظروف کے مطابق جزئیات متعین کریں گے۔ ان میں اختلافات کا ہونا لازمی امر ہے کیونکہ پاکستان کے احوال و ظروف اور ضروریات اور طرح کی ہیں۔ سعودی عرب کی اور طرح کی۔ غرض ایران' افغانستان عراق وغیرہم سب کے احوال و ظروف ایک دوسرے سے مختلف ہیں پھر ہر ملک کے باشندگان یقیناً اس بات پر بھی مصر ہوں گے کہ ان کی طے کردہ جزئیات ہی زیادہ قابل اعتماد اور درست ہیں اور ایسے تعصب کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے اور یہی چیز فرقہ بازی' فرقہ سازی اور فرقہ پرستی کی بنیاد ہے پھر ان فرقوں کی تعداد اتنی ہی نہ ہوگی جتنے ممالک ہیں بلکہ ہر زمانے میں ان کی تعداد میں خاصا اضافہ بھی ہوتا رہے گا۔ اس طرح مرکز ملت کا یہ کارنامہ ایک ایسے مستقل شرک کی بنیاد رکھ دے گا۔ جس سے امت کبھی نجات نہ پا سکے گی۔

۳۔ دین و دنیا کی تفریق: طلوع اسلام کا یہ کہنا ہے کہ دین و دنیا میں تفریق اور ثنویت' پیشوائیت اور ملوکیت کی ملی بھگت کی پیداوار ہے اور یہ مجوسیوں کے ذریعہ سے اسلام میں داخل ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ جو جزئیات یہ مرکز ملت طے فرمائے گا۔ وہ دین ہوگا یا دنیا؟ وہ دین تو ہو نہیں سکتا جیسا کہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں حافظ اسلم صاحب کے قول کے مطابق دین تو ۱۴۰۰ سال پہلے مکمل ہو چکا لہٰذا مرکز ملت کا یہ کام دنیوی نوعیت کا ہوگا اور دین و دنیا کی یہ ثنویت ایسی ہوگی جو مرکز ملت' پیشوائیت اور ملوکیت کی ملی بھگت کے بغیر ہی سرانجام دیا کرے گا۔

۴۔ شریعت اور شریعت سازی: طلوع اسلام کے نزدیک شریعت کی تعریف یہ ہے:

"اس (قرآن) کے اصول محکم اساس پر مبنی ہیں (جسے فطرت اللہ کہا جاتا ہے اور) جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان اصولوں کی جزئیات مختلف حالات کے تقاضوں کے ساتھ ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ ان بدلنے والی جزئیات کو شریعت کہا جاتا ہے۔" (طلوع اسلام اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۲۶)

طلوع اسلام کی یہ بیان کردہ تعریف ہی سرے سے غلط ہے۔ ہم پہلے قرآن کی دو آیات سے ثابت کر چکے ہیں کہ ہر امت کے لئے اور خود مسلمانوں کے لئے شریعت خود اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دی ہے لہٰذا مرکز ملت کی ان متعین کردہ جزئیات کو شریعت کے علاوہ کوئی اور ہی نام دیا جا سکتا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



پھر جب طلوع اسلام اس مرکزِ ملت کے دائرہ سے باہر نکلتا ہے تو اس کا دعوی یہ ہوتا ہے کہ قانون سازی کا حق صرف اللہ کو ہے حتی کہ کسی نبی اور رسول کو بھی یہ حق نہیں دیا گیا۔ (یہ بحث اپنے مقام پر ملے گی) اب سوال صرف یہ ہے کہ کیا یہ مرکزِ ملت خدا ہوگا؟ طلوع اسلام کا دعوی تو یہ ہے کہ خدا + رسول = مرکز ملت ہے۔ اب رسول کو تو قانون سازی کا حق ہے ہی نہیں۔ جس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مرکزِ ملت "خدا" ہی ہو سکتا ہے پھر جتنے مرکزان ملت ہوں گے۔ اتنے ہی خدا بھی ہوں گے اور یہ مجسم ومحسوس خدا ہر زمانے میں بدلتے بھی رہیں گے۔

## اطاعتِ رسول ﷺ کا پرویزی مفہوم

جناب پرویز صاحب اطاعتِ رسول سے کیا سمجھتے ہیں؟ فرماتے ہیں:

"مقلد ائمہ ہوں یا مقلد روایات۔ تقلید کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم رسول اللہ یا صحابہ کبار یا آئمہ فقہ کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ رسول اللہ وصحابہ کبار یا آئمہ فقہ کسی کے مقلد نہیں تھے۔ وہ مسائل زندگی کا حل خود سوچتے تھے۔ آپ بھی اپنے مسائل زندگی کا حل خود تلاش کیجئے" [1]

تقلید دراصل نبی کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی غیر مشروط اور بلا دلیل اطاعت کا نام ہے جو جائز نہیں۔ اقتباس بالا میں آپ نے نہایت چابکدستی سے تقلید کا لفظ ائمہ وفقہاء کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اس سے بڑھ کر رسول اللہ کی اطاعت پر بھی استعمال کر کے تقلید جیسے بدنام لفظ سے دھوکہ دینے اور مسلمانوں کو اطاعت رسول ﷺ سے برگشتہ کرنے کی جسارت کی ہے اور اس سے بھی قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ کیا خود سوچنے میں سارے مسائل کا حل موجود ہے؟ اگر "خود سوچنے" ہی کی بات تھی تو نبی ﷺ نے افک کے معاملہ میں مہینہ بھر کیا سوچا؟ اور اتنی پریشانی کیوں برداشت کی؟ جنگ تبوک سے پیچھے رہنے والوں پر پورے پچاس دن کیوں سختی کی جاتی رہی؟ آپ ﷺ نے خود سوچ کر اس کا حل کیوں نہ پیش فرمایا؟

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دادی اپنے پوتے کے ترکہ کا حصہ لینے آئی تو آپ نے اس کا خود کیا حل سوچا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے تمام اہل شوری کے علی الرغم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کس بات نے نامساعد حالت میں لشکر اسامہ کو بھیجنے اور مانعین زکوۃ سے جنگ لڑنے پر آمادہ کیا؟ یہ اور ایسے بے شمار واقعات ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مسائل "خود سوچنے" یا مشورہ کرنے سے ہی حل نہیں ہو پاتے، انہیں ہر مقام پر کتاب وسنت سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی اور وہ یہ روشنی حاصل کرتے رہے؟ اور سنت سے روشنی حاصل کرنے اور اس کی اتباع کا نام تقلید نہیں۔

---

[1] اسباب زوالِ امت، ص ۱۰۱۔ از پرویز صاحب۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



ائمہ فقہاء بھی ہر معاملہ میں کتاب وسنت کو اپنے اجتہاد کا ماخذ قرار دیتے تھے۔ اگر کتاب کے ساتھ سنت کو بھی ماخذ قانون بنانے کو آپ تقلید کا نام دے دیں تو بلاشبہ وہ سبب مقلد تھے۔ ان ائمہ میں امام ابو حنیفہؒ مشکوک احادیث کو قبول کرنے میں نسبتاً سختی برتتے تھے' تاہم ان کے اس قول: "اگر رسول اللہ ﷺ کی حدیث مل جائے تو میرے قیاس کو چھوڑ دو" سے دو باتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔

(۱) وہ احادیث رسول ﷺ کو شرعی قانون کا ماخذ تسلیم کرتے تھے۔

(۲) اپنی تقلید سے لوگوں کو روکتے تھے۔

اور امام ابو حنیفہؒ پر ہی کیا موقوف ہے۔ سب ائمہ فقہاء اپنی تقلید سے منع کرتے رہے۔ اب اگر ان ائمہ کے متبعین ان کی تقلید کرنے لگ جائیں تو اس میں ائمہ کا کیا قصور؟

سنتِ رسول ﷺ کی پیروی سے برگشتہ کرنے کے بعد پرویز صاحب اسوہ حسنہ کو ہی سرے سے غائب کر دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو جو اس ذات گرامی سے عقیدت ومحبت ہے اسے بھی کلیتاً ختم کر دینا چاہتے ہیں' لکھتے ہیں۔

مقامِ رسالت پرویز صاحب کی نظر میں: "توحید کے بعد رسالت حضور ختم المرسلین پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن رسول پر ایمان لانے سے مفہوم اس کی ذات پر ایمان نہیں کیونکہ اس کی ذات تو مکان وزمان کے حدود کی پابند ہوتی ہے اور ملتِ اسلامیہ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے ابدیت سے ہمکنار ہے"..... رسالتِ محمدیہ پر ایمان سے مقصود اس کتاب پر ایمان ہے جو حضور ﷺ کی وساطت سے امت کو ملی۔" (فردوسِ گم گشتہ۔ ص:۳۸۳)

چلئے' حضور اکرم ﷺ کی ذات پر ایمان لانے کا بھی قصہ پاک ہوا اور رسالت محمدیہ پر ایمان لانے کا بھی حضرت محمد ﷺ ایک ڈاکیہ یا زیادہ سے زیادہ ایک مبلغ کی حیثیت سے آئے اور قرآن امت کے حوالہ کیا اور دنیا سے رخصت ہوئے۔ اب ان کے اس اسوہ حسنہ کی ضرورت بھی کیا ہے؟ وہ بھی گئے ساتھ نبوت بھی رخصت ہوئی اور رسالت بھی کیونکہ آپ ﷺ خاتم النبیین بھی تھے اور خاتم المرسلین بھی۔

نبی اور رسول میں جو فرق ہوتا ہے اس کی تفصیل ہم پہلے بتا چکے ہیں لیکن پرویز صاحب کی تعلیمات کے مطابق نبی اور رسول میں کچھ فرق نہیں جو نبی ہے وہ رسول بھی ہے اور جو رسول ہے وہ نبی بھی۔ فرماتے ہیں:

"نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ایک قوت ہے دوسری اس کی عملی تفسیر یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ایک ہی شخصیت کو کہیں نبی کہا گیا ہے اور کہیں رسول" (سلیم کے نام سولہواں خط ص ۲۶۴)

مگر رسالت بدستور جاری ہے: ایک طرف تو آپ یہ فرماتے ہیں کہ نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ لیکن دوسری طرف آپ اس "ایک ہی حقیقت" کے دونوں رخوں کو جدا جدا کرنا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



چاہتے ہیں۔ یعنی نبوت کو تو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں اور رسالت کو جاری رکھنا چاہتے ہیں فرماتے ہیں:

"نبوت شخصیت کی مظہر ہوتی ہے اور رسالت آئیڈیالوجی کی نقیب۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد نبوت ختم ہو گئی مگر رسالت باقی رہ گئی۔ اسی لئے کہ اب انقلاب کا مدار رسالت پر تھا نہ کہ شخصیتوں پر۔ آئیڈیالوجی حروف و نقوش کی شکل میں محض مجرد تصور ہوتی ہے۔ اس کی عملی صورت نظام کہلاتی ہے لہٰذا یوں سمجھ لو کہ ختم نبوت کے بعد اشخاص کی جگہ نظام نے لی۔ مگر رسالتِ محمدیہ قیامت تک کے لئے باقی ہے۔ لیکن مسلمان اس سے دور ہی نہیں بلکہ اس کی راہ میں روک بنا کھڑا ہے۔ ختم نبوت کی لم مدت ہوئی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اس لئے اس نے رسالت کو ایک عرصہ سے پس پشت ڈال رکھا ہے۔" (سلیم کے نام چودھواں خط' ص۲۳۱)۔

اب دیکھئے اس اقتباس میں رسالت محمدیہ کو کیسے غلط معنی پہنائے جا رہے ہیں۔ اگر رسالت محمدیہ باقی ہے اور قیامت تک آپ ﷺ رسول ہیں تو اس لحاظ سے نبوت محمدیہ بھی باقی ہے کیونکہ آپ ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آنے کا پھر جب آپ ﷺ خاتم النبیین اور ختم المرسلین ہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ نبوت اور رسالت دونوں ختم ہو چکے ہیں۔ البتہ اس رسالت کی تبلیغ کا کام باقی ہے جو آپ ﷺ سے لے کر آج تک ہوتا رہا اور آئندہ قیامت تک ہوتا رہے گا اور تبلیغ و رسالت میں جو فرق ہے وہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔

شیخ ابنِ عربی نے بھی حضور اکرم ﷺ کی دو الگ الگ حیثیتیں قرار دیں۔ ایک نبوت دوسرے ولایت' پھر اس نے یہ فلسفہ پیش کیا کہ ولایت نبوت سے افضل ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ خاتم الانبیاء تھے اور خاتم الاولیاء کی گدی شیخ موصوف نے خود سنبھال لی۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے رسالت کو تو ختم کیا مگر نبوت کو جاری رہنے دیا اور بتدریج اس نشست پر خود براجمان ہوئے۔ اب پرویز صاحب نبوت کو ختم کرتے ہیں لیکن رسالت کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ حضور اکرم ﷺ کی سنت یا اسوہ حسنہ ان سے عقیدت و محبت ختم کرنے کے بعد رسالت کی نشست پر پرویز صاحب خود براجمان ہونے کے لئے کیسے راہ ہموار کرتے ہیں" فرماتے ہیں۔

## اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت سے مراد:

"چونکہ نظام دین میں اللہ کے احکام مرکز سے نافذ ہوتے تھے اور یہ مرکزی قوت نافذہ رسول کی مخصوص شخصیت میں تھی' اس لئے ان مرکزی احکام کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت قرار دیا گیا..... لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکزی نظام دین (Central Authority) ہے جہاں سے احکام قرآنی نافذ ہوں" (معراج انسانیت ۔ ص:۶۱۶)....." ان تصریحات سے واضح ہے کہ نظام قرآنی میں اطاعت مرکزِ ملت کی ہے اور چونکہ یہ مرکز قوانینِ خداوندی کی تنفیذ کرتا ہے اور پہلا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



مرکز رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی تھی اس لئے قرآن کریم میں مرکز ملت کو اللہ اور رسول کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے" (معراج انسانیت۔ ص:۶۳۱)

اب ظاہر ہے کہ یہ مرکز ملت بھی کوئی "شخص" یا اشخاص ہی ہوں گے جن کو اللہ اور رسول دونوں کے جملہ حقوق تفویض کئے جا رہے ہیں۔ اس کی تشریح بزم طلوع اسلام کے ایک معزز رکن ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی زبانی سن لیجئے تاکہ کچھ شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔ آپ طلوع اسلام کنونشن میں خطاب فرماتے ہیں' عنوان ہے "طلوع اسلام نے ہمیں کیا دیا؟"

زندہ رسول: "عملی انتظام کی سہولت کیلئے امت اپنے میں سے بہترین افراد کو نمائندہ بنا کر ﴿ فِيكُمْ رَسُولٌ ﴾ کے سلسلہ کو قائم رکھتی ہے اور یہ کہ رسول کی زندگی کے بعد ﴿ فیکم رسول ﴾ (۴۹-۷) سے مراد ملت کی مرکزی اتھارٹی ہے جو رسول کا فریضہ یعنی "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" ادا کرتی ہے اور یہ کہ رسول کے بعد صرف مرکز ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ دینی امور میں فیصلہ دے۔" (طلوع اسلام' جون ۱۹۵۹ء)

یہ تو اس مرکز ملت شخصیت کا ایک پہلو تھا کہ وہ فی الواقع زندہ اور جیتا جاگتا رسول ہے' جو ہمارے درمیان موجود ہے۔ اب اس مرکز ملت کے خدا ہونے کے پہلو پر بھی انہی ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا ارشاد ملاحظہ فرمایئے:

"اگر کسی فرد سے لغزش ہو جائے تو مسجد کے گوشے میں استغفراللہ کہنے سے معافی نہیں مل سکتی' بلکہ اس فرد کو خود چل کر مرکزی اتھارٹی کے پاس آنا ہوگا اور معذرت پیش کرنا ہوگی"

(طلوع اسلام کنونشن میں ڈاکٹر موصوف کا خطاب بعنوان پاکستان کا مسئلہ' طلوع اسلام جولائی ۱۹۶۳ء)

اب ادارہ طلوع اسلام کے ایک اور معزز رکن جناب محمد علی خاں بلوچ کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمایئے؟

بلوچ صاحب نے جب اپنی آنکھوں سے یہ حقیقت دیکھ لی کہ مرکز ملت یعنی جناب پرویز صاحب فی الواقع "رسول اکرم" کی نشست پر براجمان ہو گئے ہیں تو آپ کو غالباً پرویز صاحب کی یہ ادا پسند نہیں آئی۔ فرماتے ہیں۔

---

① یہ الفاظ سورہ حجرات کی آیت نمبرے سے لئے ہیں' اس سورہ میں صحابہ کرام کو حضور اکرم ﷺ کے ادب واحترام کے آداب سکھائے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے خطاب فرماتے ہیں:

﴿ وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ ﴾ (۴۹-۷) "اور جان رکھو کہ تم میں خدا کے پیغمبر ہیں اگر بہت سی باتوں میں وہ تمہارا کہا مان لیا کریں تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔"

اب آیات بالا کے اس ٹکڑے میں سے ﴿ فیکم رسول ﴾ کے لفظ نکال کر اس سے مراد یہ لی جائے کہ ہر دور میں ایک رسول کی موجودگی ضروری ہے' جب تک مسلمان اس دنیا میں موجود ہیں تو پھر حضور ختم المرسل کیسے ہوئے؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**زندہ رسول پرویز صاحب ہی ہیں:** غالباً ہماری طرح آپ حضرات میں سے بہت سوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے اس وجہ اشتراک کے پردہ میں کہ جس طرح رسول اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں نوع انسانی کو قرآن کریم کی دعوت دی تھی۔ آج کل اسی طرح گلبرگ لاہور کی کوٹھی نمبر۲۵بی میں جناب پرویز صاحب بھی قرآن کی دعوت دے رہے ہیں۔ جناب پرویز صاحب اپنے آپ کو آنحضرت ﷺ کے بلند مقام پر فائز کر کے ان تمام آیات کو جو آنحضرت ﷺ سے متعلق ہیں' اپنی ذات پر منطبق فرما لیتے ہیں پھر جو آیات قرآنی مخالفین اسلام اور کفار سے متعلق نازل ہوئیں انہیں نہایت چابکدستی سے اپنے مخالفین پر چسپاں کر دیتے ہیں' حالانکہ کجا حضور ختمی مرتبت علیہ السلام اور کہاں جناب پرویز

چہ نسبت خاک را بہ عالم خاک

دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں پیدا کی جا سکتی....."

"کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جناب پرویز احساس کمتری کا شکار ہیں اور اس طرح وہ خود کو رسول اکرم کے مقام بلند پر فائز کر کے اپنے لئے عوام کی نگاہوں میں غلط طریقہ پر کچھ جھوٹا وقار حاصل کرنے کی سعی نا مشکور فرماتے ہیں یا انہیں ارشاداتِ نبوی ﷺ سے نفرت کرتے کرتے خود ذات نبوی ﷺ سے بھی ایک قسم کی کد ہو گئی ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس واعظم کو ایک آدمی کی سطح پر بلکہ خود کو انہی کی سطح پر کھینچ لے آنے پر مصر ہیں۔ دونوں صورتوں میں جو نسی صورت بھی ہو ہر صورت قابل اعتراض اور لائق نفرین ہے" (حدیث دل گدازے ص۳۰)

**غلام احمد قادیانی اور غلام احمد پرویز:** اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غلام احمد قادیانی اور غلام احمد پرویز میں صرف نام کی ہی مشابہت نہیں اور بھی بہت سی باتوں میں مشابہت پائی جاتی ہے مثلاً:

۱۔ قادیانی صاحب بھی ابتداءً ختم نبوت کے قائل تھے۔ پرویز صاحب نے بھی نبوت اور رسالت کو ایک ہی سکہ کے دو رخ قرار دے کر حضور اکرم ﷺ کو ختم الانبیاء اور ختم المرسلین تسلیم کیا ہے۔

۲۔ قادیانی صاحب نے بعد میں یہ کہہ کر "ہمارا مذہب تو یہ ہے جس دین میں نبوت کا سلسلہ نہ ہو وہ مردہ ہے۔ (حقیقت النبوۃ۔ ص:۳۷۲) نبوت کا دروازہ کھول دیا اور پرویز صاحب نے یہ کہہ کر کہ "ملتِ اسلامیہ ابدیت سے ہمکنار ہے" کہہ کر رسالت کا دروازہ کھول دیا۔

۳۔ دونوں صاحبان نے بتدریج نبوت اور رسالت کی گدی پر قبضہ جمایا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قادیانی صاحب جب اپنی سابقہ تحریروں کے علی الرغم لوگوں سے خطاب فرماتے ہیں تو زبان مبہم اور الہامانہ استعمال کرتے ہیں لیکن پرویز صاحب پیچیدہ اور فلسفیانہ زبان استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ دونوں نے خدا کے تصور میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ قادیانی صاحب تو خدا کو اتنا اجاگر کرتے ہیں کہ وہ خدا اسے دیکھتے ہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی دکھلا سکتے ہیں۔ بقول میاں محمود خلیفہ ثانی۔

"ایسی صورت میں تو ایک ہی علاج ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کے کلے پکڑ کر ان کی آنکھیں اوپر کو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اٹھا دی جائیں اور کہا جائے کہ وہ خدا ہے جس نے اپنے تازہ نشانات سے دنیا پر اپنے وجود کو ثابت کیا۔" (الفضل قادیان ۱۹ جولائی ۱۹۳۶ء) جب کہ پرویز صاحب خدا کو اتنا گم کر دیتے ہیں کہ خدا کو محض ایک تجریدی تصور کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

۵۔ قادیانی صاحب نے قادیان کو ارض حرم قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

زمین قادیاں ارضِ حرم ہے ہجوم خلق سے اب محترم ہے

تو پرویز صاحب نے اپنی جائے سکونت کو حرم کعبہ اور مکہ سب کچھ ہی قرار دے دیا فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد حرم کی پاسبانی ہے' سیاسی معاہدات نہیں۔ واضح رہے کہ حرم' کعبہ' مکہ [1] سے مراد سعودی عرب کا دارالسلطنت نہیں بلکہ دین کے نظام کا مرکز ہے۔ جہاں سے قرآنی قوانین نافذ ہوں گے" (طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۵۱)

اور یہ تو آپ بزم طلوعِ اسلام کے معزز اراکین کی شہادتوں سے معلوم کر ہی چکے ہیں کہ وہ مرکز آپ ہی کی ذات والا صفات ہے۔

۶۔ دونوں پر امتِ مسلمہ کے سب فرقوں نے متفقہ طور پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ قادیانی جماعت تو مسلم اقلیت قرار دی جا چکی ہے۔ پرویز صاحب پر جب فتویٰ لگایا گیا تو فرماتے ہیں۔

"ان حضرات (علماء) کو یا کسی اور کو یہ اتھارٹی کہاں سے مل جاتی ہے کہ وہ کسی کے کفر اور اسلام کا فیصلہ کریں؟ علماء کے یہ معنی ہیں کہ انہوں نے کسی مدرسہ سے کچھ کتابیں پڑھی ہیں تو کیا ان کتابوں کے پڑھ لینے سے کسی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ جسے چاہیں کافر قرار دے دیں؟" (کافرگری ص ۱۲۳ از پرویز صاحب)

۷۔ لیکن ان دونوں صاحبان نے خود کافرگری کا یہ حق جی بھر کر استعمال کیا ہے۔ قادیانی صاحب اپنی نبوت پر ایمان نہ لانے والوں کو یا باقی سب مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے اور پرویز صاحب کی کافرگری محمد علی بلوچ صاحب کے اقتباس سے واضح ہے۔ آپ نے خود بھی قرآنی نظامِ ربوبیت میں اس نظام پر ایمان نہ لانے والوں کو کئی مقام پر کافر بنا دیا ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

**مرکزِ ملت کا یہ منشور غلط ہے:** اب سوال یہ ہے کہ کیا واقعی اللہ اور رسول سے مراد مرکز ملت یا اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد مرکزِ ملت کی اطاعت ہے۔؟ بالفاظ دیگر کیا مرکزِ ملت اللہ اور رسول کا مقام سنبھال سکتا ہے؟ تو یہ تصور بوجوہ غلط ہے۔ جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ مکہ نہ دورِ نبوی میں دار السلطنت تھا نہ ہی بعد میں بنا اور نہ ہی آج دار السلطنت ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



رسول اللہ کے بعد پہلے مرکزِ ملت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ نے اپنے آپ کو نہ تو اللہ اور رسول سمجھا نہ محض رسول' سمجھا تو خلیفہ رسول سمجھا۔ زندگی بھر اسوۂ رسول کو سامنے رکھا اور اس پر سختی سے کاربند رہے۔ یہی حال دوسرے خلفاء راشدین (مراکز ملت) کا رہا تو آج اسوہ حسنہ کو سامنے سے ہٹا کر قرآنی احکام کی تفصیل و تشریح کے اختیارات کسی مرکزِ ملت کو کیسے تفویض کئے جاسکتے ہیں؟

**اللہ اور رسول کی الگ الگ اطاعت کا تصور :** پرویز صاحب نے یہ تصور بھی پیش کیا ہے کہ مسلمان اللہ کی اطاعت سے مراد قرآن کی اطاعت لیتے ہیں اور رسول کی اطاعت سے مراد احادیث کی اتباع یہ ایک ایسا الزام ہے جو سراسر بے بنیاد ہے۔ مسلمانوں میں اللہ اور رسول کی الگ الگ اطاعت کا کوئی تصور نہیں بلکہ رسول کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت عبارت ہے۔ قرآن اور اسوہ حسنہ سے۔ اس طریق اطاعت کے بغیر اللہ کی اطاعت کا کوئی تصور مسلمانوں میں موجود نہیں۔ قرآن کے الفاظ پر پھر غور فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ "جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی" یہ نہیں فرمایا کہ جس نے اللہ کی اطاعت کی تو اس نے گویا رسول کی اطاعت کی۔

اب اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کی تشریح بھی پرویز صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمایئے۔

**اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم کی نئی تشریح :**

"اس آیت مقدسہ میں عام طور پر اولی الامر سے مراد لئے جاتے ہیں ارباب حکومت (مرکزی اور ماتحت سب کے سب) اور اس کی تشریح یوں کی جاتی ہے کہ اگر قوم کو حکومت سے اختلاف ہو جائے تو اس کے تصفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن (اللہ) اور حدیث (رسول) کو سامنے رکھ کر مناظرہ کیا جائے اور جو ہار جائے فیصلہ اس کے خلاف ہو جائے۔ ذرا غور فرمایئے کہ دنیا میں کوئی نظام حکومت اس طرح سے قائم بھی رہ سکتا ہے کہ جس میں حالت یہ ہو کہ حکومت ایک قانون نافذ کرے' اور جس کا جی چاہے اس کی مخالفت میں کھڑا ہو جائے اور قرآن وحدیث کی کتابیں بغل میں داب کر مناظرہ کا چیلنج دے دے۔ اس آیت مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے جس میں اللہ اور رسول سے مراد ہی مرکز ملت ہے اور اولی الامر سے مفہوم افسرانِ ماتحت۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مقامی افسر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو بجائے اس کے کہ وہیں مناقشات شروع کر دو امر متنازع فیہ کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر دو' اسے مرکزی حکومت کی طرف (Refer) کر دو۔ مرکز کا فیصلہ سب کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ یعنی اس نظام میں مقامی افسروں کے فیصلوں کے خلاف عدالت عالیہ میں مرافعہ (اپیل) کی گنجائش باقی رکھی گئی ہے۔" (معراجِ انسانیت - ص:۶۲۵ -

(۶۲۶)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اقتباس بالا میں کئی ایک مغالطے ہیں اور کئی وجوہ سے غلط ہے' مثلاً۔

۱۔ اللہ سے قرآن اور رسول سے مراد احادیث قطعاً غلط ہے۔ کتاب اللہ کے احکام کی تعمیل بھی عین اللہ اور رسول کی اطاعت ہے اور اسوہ حسنہ جو کتاب اللہ کے احکام کی عملی شکل ہے' کی پیروی بھی عین اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ اللہ کے احکام اور آپ ﷺ کا اسوہ حسنہ یہ دونوں چیزیں ہمیں کتاب اللہ میں بھی ملتی ہیں اور احادیث میں بھی۔

۲۔ حیرانگی کی بات ہے کہ جن خلفائے راشدین کو پرویز صاحب مرکزان ملت قرار دے کر اللہ اور رسول کی گدی پر براجمان کر کے انہیں یہ اعزاز عطا فرما رہے ہیں ان کو خود ساری عمر اس اعزازی مسند کی خبر تک نہیں ہوئی اور..... اس بات کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ یہ مرکزِ ملت (مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ) خود عدالتوں میں حاضر ہوئے اور لطف کی بات یہ ہے کہ فیصلے بھی ان کے خلاف ہی ہوئے۔ انہیں اس بات کی سمجھ ہی نہ آئی کہ اللہ اور رسول تو ہم خود ہیں۔ ہماری اطاعت ہی اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔

۳۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مرکز ملت کی شخصیت بھی اولو الامر میں شامل ہے۔ جن سے جھگڑا کیا جا سکتا ہے وہ رسول یا اللہ اور رسول نہیں بن جاتے' کیونکہ ان سے تو اختلاف اور جھگڑا ایمان سے ہی خارج کر دیتا ہے جب کہ اولو الامر سے اختلاف اور جھگڑا ہونے سے ایمان میں کچھ حرج واقع نہیں ہوتا۔

۴۔ مرکزِ ملت قطعاً عدالت مرافعہ نہیں۔ اگر ایسی ہی بات ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عدالت میں حاضر ہونے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔

۵۔ عدالتِ مرافعہ (جیسی اور جس درجہ کی بھی ہو) وہ کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہے۔ اس پر مرکزِ ملت کی شخصیت اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات فی الواقع عدالتِ مرافعہ تھی۔ اس لحاظ سے نہیں کہ وہ مرکز ملت تھے بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ اللہ کے رسول تھے۔ ان وجوہات کی بناء پر مرکزِ ملت کو رسول کی گدی پر بٹھانا اور اسے اولو الامر کے زمرہ سے خارج کر دینا ایک ایسا غلط تصور ہے جس کی تائید قرآن' حدیث اور تاریخ کسی سے بھی نہیں ہوتی۔

**علمائے دین اور "پیشوائیت" میں فرق:** پرویز صاحب کی مختلف تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایسے علمائے دین سے سخت دشمنی ہے جو قرآن کی تاویل و تعبیر میں اسوہ حسنہ اور دیگر ائمہ فقہاء سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ آپ انہیں ہندوؤں یا عیسائیوں کی پیشوائیت کے بدنام لفظ سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ مزعومہ پیشوائیت اور علمائے دین میں کئی لحاظ سے فرق ہے۔ مثلاً۔

۱۔ پیشوائیت میں علم دین کی اجارہ داری ایک مخصوص طبقہ یا خاندان سے متعلق ہوتی ہے جب کہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اسلام میں کوئی شخص بھی خواہ وہ جولاہا یا چمار ہی کیوں نہ ہو۔ علم حاصل کر کے علماء کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔

۲۔ پیشوائیت میں یہ طبقہ معاشرتی لحاظ سے بلند مقام پر فائز ہوتا ہے جب کہ اسلام میں بزرگی کا معیار محض علم نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

۳۔ پیشوائیت میں اس طبقہ کی آراء کو سند سمجھا جاتا ہے جب کہ اسلام میں کوئی بات جو کتاب وسنت کے خلاف ہو خواہ کتنے ہی بڑے امام کی ہو۔ سند نہیں ہوتی اور اسے زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔

**تاریخ سے ایک مرکزِ ملت کی مثال:** بہرحال آپ علمائے دین کے پیچھے اس لئے پڑے ہیں کہ یہ لوگ قرآن کی من مانی تاویل و تفسیر میں آڑے آجاتے ہیں۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ادارہ طلوع اسلام کو ایک ایسا کردار نظر آیا ہے جس نے علمائے دین کی زبان بند کر دی تھی۔ یہ شخصیت شہنشاہ اکبر اعظم کی ہے دیکھئے صفدر سلیمی صاحب مصنف "پاکستان کا معمارِ اول سرسید" اس کی تعریف میں کیسے رطب اللسان ہیں۔ آپ پہلے ملا بدایونی کی کتاب منتخب التواریخ سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"اس کے بعد کوئی ایسا مسئلہ جس میں مجتہدین کی آرا ایک دوسرے سے مختلف ہوں اور سلطان اپنی خداداد بصیرت کی بناء پر رعایا کی بہبود اور سیاسی مصالح کے پیش نظر ان باہم متعارض ومتضاد آراء میں سے کسی ایک کو اختیار کر کے اس کے مطابق احکام صادر کر دے تو ان احکام کی اطاعت ہم پر اور تمام رعایا پر فرض ہو گی۔ نیز اگر سلطان کوئی نیا حکم جاری کرنا چاہے تو ہم پر اور دیگر رعایا پر اس کی اطاعت بھی فرض ہوگی بشرطیکہ وہ حکم قرآن پاک کی آیات کے مطابق ہو اور اس سے مقصود رعایا کی بہبود ہو۔"

اس اقتباس کے بعد اب صفدر سلیمی صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔

"اس سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کو قرآن کی حدود میں مقید رکھا گیا تھا اور یہ چیز عین اسلام کے مطابق ہے اور فقہاء کی بحث میں فیصلے کا حق رئیسِ مملکت کو حاصل ہونا اسلام کی قانون سازی کے اصول کے عین مطابق ہے۔ اسلام میں علماء یا کسی اور کو قاضی کا منصب حاصل نہیں ہوتا۔ فیصلے کا اختیار یا تو مملکت کی طرف سے مقرر کردہ جج کو ہوتا ہے۔ یا خود حکومت کی مرکزی اتھارٹی کو اس شرط کے ساتھ کہ ان کا فیصلہ قرآن کے خلاف نہیں ہوگا۔ اکبر کا یہ فیصلہ ان دونوں شرطوں کو پورا کرتا ہے اور اسلام کے عین مطابق ہے..... علماء نے اکبر کے خلاف جو طوفان برپا کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انہیں ان کے صحیح مقام پر رکھنا چاہتا تھا اور انہوں نے جس انداز کی تھیا کریسی قائم کر کے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ وہ اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔ یہ چیز اکبر کے دور کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ تاریخ میں جس شخص نے بھی یہ کوشش کی کہ علماء کو ان کے مقام سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ انہوں نے بیشتر اس کی مخالفت کی؟ (طلوع اسلام اگست ستمبر ۱۹۶۴)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**شہنشاہِ اکبر کی خداداد بصیرت :** اب دیکھئے کہ اس سلطان کی خداداد بصیرت یہ تھی کہ وہ آفتاب پرست تھا۔ شب و روز یعنی ۲۴ گھنٹے میں چار دفعہ سورج کے سامنے ہاتھ باندھ کر پوجا پاٹ کرتا تھا۔ ماتھے پر تلک لگاتا تھا۔ محل سرا میں ہندو بیوی تھی' مندروں میں جا کر عبادت کرتا تھا۔ کیا یہ سب افعال و اعمال قرآن کے مطابق ہیں؟ پھر اس کے ایسے اعمال و افعال صرف اپنی ذات تک محدود نہ تھے۔ وہ دین الٰہی کا بانی تھا جو ظاہر ہے کہ دین اسلام سے کوئی جداگانہ چیز تھی۔ اس نئے دین کی نشر و اشاعت کے لئے وہ تمام ذرائع حکومت استعمال میں لاتا رہا۔ یہی وہ سلطان ہے جس کے دربار اور حرم میں ہر وقت السلطان ظل اللہ کا نعرہ گونجتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں اکبر جیسا ملحد کوئی پیدا نہیں ہوا۔ مگر طلوع اسلام اسے صرف اس لئے خراج عقیدت پیش کر رہا ہے کہ آپ کے پیش کردہ تصور مرکزِ ملت کا وہ پیکر محسوس تھا اور علماء کو اس نے ان کے جائز مقام پر رکھا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ طلوع اسلام اس بات کی وضاحت فرما دیتا کہ علماء کا جائز مقام ہے کیا؟ کیا علمائے دین کا جائز مقام یہ ہے کہ ان کی اس حد تک زبان بندی کر دی جائے کہ کوئی مرکزِ ملت اپنی "قرآنی بصیرت" کے مطابق جو بھی من مانی تاویلات کرتا پھرے تو انہیں آواز نکالنے کی جرأت بھی نہ ہو۔

ادارہ طلوعِ سلام نے ملوکیت کو بھی اپنی اکثر تحریروں میں ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور اکبر تو بادشاہ ہی نہیں شہنشاہ تھا جس کا باپ بھی بادشاہ تھا وہ خود بھی بادشاہ تھا اور اس کا بیٹا بھی بادشاہ وہ ظل اللہ علی الارض بھی تھا اور مشرک و بت پرست بھی' لیکن ان سب قباحتوں کے باوجود ادارہ طلوعِ اسلام کو اکبر کی یہ ادا--- کہ وہ علماء کو ان کے جائز مقام پر رکھتا تھا--- اتنی پسند آئی کہ اس کی تعریف میں ڈونگرے برسانے لگے ہیں۔ کیا یہی ان کی قرآنی بصیرت کا تقاضا ہے؟

## چند ضمنی گوشے

**رسول اللہ سے پرویز صاحب کی محبت و عقیدت؟ :** پرویز صاحب کی بزم کے ایک معزز "رکن محمد اسلام صاحب" پرویز صاحب کے رسول اللہ سے قلبی لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے پرویز صاحب کی درج ذیل تحریر پیش کرتے ہیں جو انہوں نے شاہکار رسالت میں لکھی ہے۔

"ان حالات میں عین ممکن تھا کہ اسلام سے برگشتہ ہو جاتا۔ لیکن میری انتہائی خوش بختی کہ اس ورطہ "لا" میں ایسا جاذبہ موجود رہا جو ان طلاطم خیزیوں میں میری کشتی کا لنگر بن گیا اور وہ جاذبہ تھا حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اعظم و اقدس کے ساتھ میری بے پناہ عقیدت ہی نہیں محبت۔ میرا ایمان تھا کہ ایسی ہستی جس نے انسانوں کی داخلی اور خارجی دنیا میں ایسا تحیر انگیز انقلاب برپا کر دیا۔ نہ تو (معاذ اللہ) فریب خوردہ ہو سکتی ہے نہ فریب کار۔ اس لئے جب آپ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید نہ میری نہ کسی اور انسان کی فکری تخلیق ہے بلکہ یہ خدا کا کلام ہے تو مجھے اس دعوی کو یونہی نہیں جھٹک دینا چاہیئے' انتظار کرنا چاہیئے تا آنکہ میں قرآن کو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



خود سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔ بس یہ تھا ایک سہارا جس نے مجھے ان طوفانوں میں تھامے رکھا اور میرے پاؤں میں لغزش نہ آنے دی۔ کس قدر احسان عظیم ہے اس ناچیز پر اس آفتابِ عالم تاب کا جس کی رحمۃ للعالمینی کے تصدق مجھے منزل ملی مدعا ملا۔" (طلوع اسلام' ص ۱۶' جون سن ۸۵)

اب دیکھئے جہاں تک آپ کے داخلی اور خارجی دنیا میں انقلاب برپا کرنے آپ کے ملہم من اللہ اور صادق ہونے کا تعلق ہے تو ان باتوں کا غیر مسلم بھی صرف اعتراف ہی نہیں کرتے بلکہ خراج عقیدت بھی پیش کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا محض اعتراف اور خراج عقیدت سے آپ ﷺ سے محبت کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کا آپ سے محبت وعقیدت کا یہ تقاضا نہیں کہ آپ کی اطاعت بھی کی جائے؟ رسول اللہ کا تو واقعی پرویز صاحب پر یہ احسانِ عظیم تھا۔ لیکن آپ نے اس احسان عظیم کا بدلہ یہ دیا کہ رسول اللہ کی اطاعت اور اتباع دونوں باتوں کو دین سے خارج قرار دیا اور کہا کہ:

"اللہ اور رسول کی اطاعت سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول کی دو الگ الگ اطاعتیں ہیں۔ اللہ کی اطاعت قرآن کے ذریعے اور رسول کی اطاعت احادیث کے ذریعے سو اول تو یہ بنیاد ہی صحیح نہیں۔ قرآن کی تعلیم کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اطاعت صرف خدا کی' کی جا سکتی ہے اس کے علاوہ کسی اور کی نہیں" (مقام حدیث۔ ص:۶۳)

جہاں تک اس اقتباس کے پہلے حصہ "اللہ کی اطاعت قرآن کے ذریعے اور رسول کی اطاعت (احادیث کے ذریعے) کا تعلق ہے تو یہ سراسر بے بنیاد الزام ہے۔ جس کا جواب ہم دے چکے ہیں دوسرے حصہ میں آپ نے صاف طور پر رسول کی اطاعت واتباع دونوں باتوں سے انکار کر دیا ہے حالانکہ صرف اور صرف رسول کی اطاعت کا حکم بھی قرآن کریم کی بہت سی آیات سے ثابت ہے۔

**اطاعتِ رسول کا نیا مفہوم:** رسول اللہ کا واقعی تمام مسلمانوں پر احسانِ عظیم ہے کہ انہوں نے ہدایت کی راہ دکھلائی اور اسی احسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ صلوا علیہ وسلموا تسلیما یعنی ایک آپ کے حق میں اللہ کی رحمت کی دعا کیا کریں اور دوسرے ان کی اطاعت میں بدل وجان سر تسلیم خم کر دیں اور پرویز صاحب رسول کی اطاعت سے کلیتاً انکار کر کے فرمائیں کہ اطاعت صرف ایک ہے اور وہ خدا کی ہے۔ اور اگر وہ رسول کی اطاعت کا ذکر کریں بھی تو اس طرح کرتے ہیں کہ رسول اللہ بھی قرآنی احکام کی جزئیات صحابہ کے مشورہ سے طے کرتے تھے۔ آپ بھی مرکزِ ملت کی صورت میں اسی طرح مشورہ سے قرآنی احکام کی جزئیات طے کر لیں۔ بس یہی رسول کی اطاعت ہے اور یہی رسول کی سنت کی اتباع ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تو یہ کہا تھا کہ جس نے رسول کی اطاعت کی' اس نے اللہ کی اطاعت کی" یہ نہ کہا تھا کہ جس نے کتاب اللہ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔" پھر یہ اللہ کی اطاعت بذریعہ کتاب اللہ اور کتاب اللہ کی جزئیات کی تعیین بذریعہ مرکزِ ملت کا فلسفہ قرآن کی رو سے حرام قرار پاتا ہے۔ جسے آپ سنتِ رسول

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



یا رسول اللہ کی اتباع قرار دے رہے ہیں۔ ارشادِ باری ہے:

**مرکزِ ملت کی اطاعت حرام ہے:**

﴿ اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ﴾ (الأعراف ۷/ ۳)

اس چیز کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور اس کے علاوہ کسی ولی کی اتباع نہ کرو۔

اب دیکھئے کہ ہم قرآن کے علاوہ سنت کی اتباع اس لئے کرتے ہیں کہ ہم سنت رسول کو منزل من اللہ سمجھتے ہیں اور نیز اس لئے بھی اللہ تعالیٰ نے صرف رسول کی ذات کو قابل اتباع نمونہ قرار دیا ہے اور کسی کو نہیں۔ مگر مرکز ملت جو قرآنی احکام کی جزئیات طے کرے گا' وہ بہرحال نہ منزل من اللہ ہیں اور نہ ہی "مرکزِ ملت" کو اسوہ حسنہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے مرکز ملت کی جزئیات بما انزل اللہ میں شامل نہیں لہٰذا اس کی بنیاد پر فیصلے کرنے والے ظالم بھی ہیں۔ فاسق بھی اور کافر بھی (۵:۴۴۔۴۵۔۴۷) اور آیت بالا کی رو سے مشرک بھی۔

**تشریعی امور میں مشورہ کبھی نہ کیا گیا:** اور ہم دعوی سے یہ بات کہتے ہیں کہ آپ نے تشریعی امور کی جزئیات مثلاً نمازوں کی تعداد کیا ہو۔ اوقات کیا ہوں۔ ترکیب کیا ہو۔ زکوۃ کن لوگوں پر عائد ہو اور کتنی ہو اور کس کس چیز پر ہو؟ حج کے ارکان ومناسک کیونکر بجالائے جائیں۔ جنگ میں عورتوں اور بچوں' بوڑھوں اور بیماروں کے قتل دیت وورراثت میں احکام وغیرہ وغیرہ میں کبھی مشورہ نہیں کیا تھا۔ مشورہ صرف تدبیری امور میں ہوتا تھا۔ جیسے میدان جنگ کا انتخاب اور طریق کار یا قیدیوں سے کیا سلوک کیا جائے وغیرہ وغیرہ ہمارے ذخیرہ روایات میں یہ نقص ضرور ہے کہ اس میں وضعی اور ضعیف روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ دور نبوی کا کوئی معمولی سے معمولی واقعہ بھی تاریخ وسیر کی کتابوں میں درج ہونے سے رہ گیا ہو لہٰذا اگر رسول اللہ نے تشریعی امور میں بھی مشورہ کیا ہوتا تو اس کا ضرور اندراج ہوتا۔ ہم طلوع اسلام سے قطع نزاع کے لئے صرف ایک اسی بات کا حوالہ چاہتے ہیں۔ خواہ کسی ضعیف سے ضعیف تر روایت سے ہو۔

**انکارِ رسالت:** طلوع اسلام اکثر یہ دعوی بھی دہراتا رہتا ہے کہ اس پر منکرِ حدیث' منکرِ سنت اور منکرِ رسالت کا الزام بے بنیاد اور مخالفین کا پروپیگنڈہ ہے۔ طلوع اسلام ہر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتا ہے جو قرآن کے خلاف نہ ہو اور اس سے حضور اکرم ﷺ کی سیرت یا صحابہ کبار کا کردار داغدار نہ ہوتا ہو اب دیکھئے کہ یہ حدیث کہ رسول اللہ نے نقد بچت پر چالیسواں حصہ' بارانی فصل پر بیسواں حصہ اور چاہی فصل پر دسواں حصہ زکوۃ وصول کی تھی۔ یہ حدیث طلوع اسلام کے قائم کردہ معیار پر پوری اترتی ہے۔ یہ نہ تو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



قرآن کے خلاف ہے نہ اس سے سیرتِ نبوی ﷺ یا صحابہ پر کوئی حرف آتا ہے۔ کیا اس صحیح حدیث یا سنت رسول کو طلوعِ اسلام قابلِ حجت تسلیم کرتا ہے۔ اگر اب وہ اس کے جواب میں یہ کہہ دے کہ اس وقت تو واقعی رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا ہوگا۔ لیکن آج کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ آج یہ باتیں مرکزِ ملت طے کرے گا تو بتایئے کہ ایسا ماننے کا فائدہ بھی کیا ہے؟ یہ کچھ تو غیر مسلم بھی تسلیم کرتے ہیں اور اگر یہی صورت حال ہو تو پھر آخر انکار حدیث' انکار سنت اور کسے کہتے ہیں؟

خسرو پرویز اور غلام احمد پرویز: رسول اللہ ﷺ سے پرویز صاحب کے بغض کا اس سے زیادہ واضح ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ نے اپنے نام کے..... ساتھ پرویز کا لاحقہ پسند فرمایا ہے اور اپنی شخصیت کو نام سے زیادہ اسی لاحقہ سے متعارف کرایا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ خسرو پرویز ایران کا وہ بدبخت بادشاہ تھا جس نے آپ کے نامہ مبارک کو چاک ہی نہیں کیا بلکہ اپنے صوبیدار یمن باذان کو حکم بھیجا کہ اس رسول کو گرفتار کر کے میرے پاس لائے۔ باذان نے دو آدمی یہ حکمنامہ دے کر مدینہ بھیجے۔ آپ نے انہیں فرمایا کہ جس شخص کے پاس تم مجھے لے جانا چاہتے ہو وہ تو رات کو اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ چنانچہ ان آدمیوں نے واپس جا کر باذان کو یہ بات بتائی دریں اثناء ایران سے بھی ایسی ہی اطلاع مل گئی تھی باذان آپ کا یہ معجزہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا اور اس طرح یمن میں اسلام خوب پھیلا۔

خسرو پرویز نے نامہ مبارک کو چاک کیا تو رسول اللہ نے دعا کی کہ اللہ اس کی سلطنت کو بھی ایسے ہی پارہ پارہ کر دے۔" چنانچہ عہد فاروقی میں ہی ساسانی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔

خسرو پرویز کی اسی رسول دشمنی کی بنا پر ہر وہ مسلمان جس کے دل میں رسول اللہ کی ذرہ بھر بھی محبت ہو اپنا نام یا لقب پرویز کرنا گوارا نہیں کرتا۔ بلکہ اگر ہو تو اسے بدل دیتا ہے۔ اب اگر پرویز صاحب اس لاحقہ سے اتنی محبت کریں کہ اپنی تصنیفات پر صرف پرویز کا لفظ لکھ کر اسے ذریعہ تعارف بنائیں تو یہ بات رسول اللہ سے عقیدت و محبت کی دلیل ہے یا بغض و عناد کی؟

## حجیّتِ حدیث کے دلائل

سادہ الفاظ میں حجیت حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث صحیح ثابت ہو جائے اسے واجب الاتباع سمجھنا لازمی ہے۔ مرکز ملت کے اس باب میں ذیلی عنوانات کے تحت حدیث کی حجیت کے کئی دلائل مذکور ہو چکے ہیں۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ایسے دلائل کو ذرا تفصیل سے نئی ترتیب کے ساتھ یکجا طور پر پیش کر دیا جائے۔ بعد ازاں حجیت حدیث کے کچھ عقلی دلائل بھی پیش کئے جائیں گے۔ انشاء اللہ۔

فرار کی راہیں: اس سلسلہ میں یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ منکرینِ حدیث کے ان دلائل کو پیش نظر رکھا جائے۔ جنہیں وہ حجیتِ حدیث کے ابطال یا تردید کے طور پر پیش فرمایا کرتے ہیں اور وہ درج

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



ذیل ہیں۔

(۱) قرآن کریم میں جہاں کہیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا اکٹھا ذکر آیا ہے تو اس سے مراد ہے کتاب اللہ کی اطاعت رسول کے ذریعہ۔ گویا اصل اطاعت اللہ ہی کی ہے اور ایسی اطاعت ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اطاعتیں دو نہیں ہو سکتیں۔ اللہ اور رسول کی الگ الگ اطاعت کا تصور ہی غلط ہے۔

(۲) رسول اللہ نے قرآنی احکام پر اس دور کے تقاضوں کے مطابق عمل کر کے دکھایا اور صحابہ کرام ﷺ نے آپ ﷺ کی اطاعت کی پھر جب حالات میں تبدیلی آگئی تو خلفائے راشدین نے حالات کے مطابق رسول اللہ کی عملی تعبیر میں تبدیلی [1] پیدا کر لی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی بے شمار تبدیلیاں کیں لہٰذا آئندہ بھی ہم رسول اللہ کی عملی تعبیر میں زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جہاں جہاں ضرورت سمجھیں تبدیلیاں کر سکتے ہیں اور یہ اختیار مرکز ملت کو حاصل ہے۔

(۳) رسول اللہ کی اتباع یا آپ کے اسوہ حسنہ کی اتباع کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آپ ﷺ اپنی زندگی کے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں خود سوچتے تھے اور اس سلسلہ میں صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح آپ بھی مرکز ملت کی مشاورت کے ذریعہ قرآن کی روشنی میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل خود سوچئے۔ بس یہی اسوہ حسنہ کی اتباع ہے۔

(۴) صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بحیثیت رسول ﷺ نہیں بلکہ بحیثیت حاکم وقت کرتے تھے کیونکہ آپ رسول ہی نہیں بلکہ حاکم وقت بھی تھے۔ اس لحاظ سے بھی آپ کی اطاعت عارضی اور وقتی ہی قرار پاتی ہے۔ رسول اللہ کی دائمی اطاعت امت کو ماضی سے وابستہ کر دیتی ہے۔

## طلوع اسلام کے اعتراضات کے جوابات قرآن سے

اب دیکھئے مندرجہ بالا چاروں دلائل ایسے ہیں جن پر یہ حضرات قرآن کریم سے ایک بھی ایسی آیت پیش نہیں کر سکتے جو قطع نزاع کے لئے برہان کا درجہ رکھتی ہو۔ یہ ملحدانہ تصورات ان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں۔ جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ ہم انہیں ملحدانہ افکار کا قرآن سے رد پیش کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] ایسی تبدیلیوں کا جائزہ اس کتاب کے پانچویں حصہ کے باب "خلفائے راشدین کی شرعی تبدیلیاں" میں پیش کیا گیا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



## اللہ اور رسول کی الگ الگ اور مستقل یعنی دو اطاعتوں کا ثبوت

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (الأعراف ۷/ ۱۵۷)

جو لوگ اس رسول کی جو امی ہے پیروی کرتے ہیں جن کے اوصاف وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ رسول انہیں اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاک اور ستھری چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو (ان کے سر یا گلے میں) تھے اتارتا ہے اور جو لوگ ایسے نبی پر ایمان لائے اور ان کی رفاقت کی اور انہیں امداد دی اور جو نور اس کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ اس کی پیروی کی تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔

اس آیت سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ آیت کے ابتدائی حصہ میں صرف رسول کی اتباع کا ذکر آیا ہے لہٰذا اکیلے رسول کی بھی اطاعت واتباع واجب ہے۔

۲۔ رسول اللہ کو اس آیت کی رو سے حلال وحرام ٹھہرانے کا اختیار ثابت ہوتا ہے۔ جب کہ بعض دوسری آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حلت وحرمت کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ایسی آیت کی تطبیق کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی حلت وحرمت کے یہ اختیارات اپنے نبی کو تفویض فرمائے ہیں جو وحی خفی کے بغیر ممکن نہیں۔ گویا یہ آیت منکرین حدیث کے نظریہ کے علی الرغم وحی خفی کے وجود پر بھی ایک واضح دلیل ہے۔

۳۔ آیت کے آخری حصہ میں وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ میں نور سے مراد کتاب اللہ ہے جو آپ کے ساتھ نازل کی گئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے رسول کی اتباع کا الگ ذکر کیا اور کتاب اللہ کی اتباع کا الگ۔ گویا کتاب اللہ اور رسول اللہ کی الگ الگ اتباع کا تصور قرآن کریم سے ہی ثابت ہوتا ہے۔

۴۔ جو لوگ رسول اللہ کی بھی اتباع کریں اور کتاب اللہ کی بھی وہی کامیاب ہیں اور جو لوگ رسول کی اطاعت کو آپ کی زندگی تک محدود کر دیں۔ یا اس سے انکار کریں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

﴿ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾ (آل عمران ۳/ ۵۳)

اے ہمارے پروردگار! ہم اس کتاب پر ایمان لائے جو تو نے اتاری اور رسول کی اتباع کی۔ پس تو ہمیں ماننے والوں میں لکھ لے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس آیت میں بھی کتاب اللہ کی اطاعت اور رسول کی اتباع کو دو مستقل اور الگ الگ حیثیتوں سے ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وحی پر عمل اتباع رسول ہی سے ممکن ہے۔

**اصل اطاعت رسول کی ہے اور وہ رسول ہونے کی حیثیت سے ہے:** ارشاد باری ہے۔

﴿ وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ ﴾ (النساء٤/ ٦٤) اور ہم نے جو رسول بھیجا اس لئے بھیجا کہ اللہ کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر رسول کی اطاعت ضروری ہے خواہ اس پر کتاب نازل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ موسیٰ علیہ السلام پر کتاب تورات اس وقت نازل ہوئی جب فرعون موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی وجہ سے غرق ہو چکا تھا۔ یہ بات وحی خفی' اکیلے رسول کی اطاعت اور حجیت حدیث پر بڑی قوی دلیل ہے اور اس بات پر بھی کہ اللہ کے حکم کے مطابق رسول کی اطاعت اس کے رسول ہونے کی حیثیت سے کی جاتی ہے نہ کہ اس کے حاکم وقت ہونے کی حیثیت سے۔ سب رسول حاکم وقت نہیں ہوتے جب کہ اطاعت ہر ایک کی واجب ہے۔

﴿ مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدۡ أَطَاعَ ٱللَّهَۖ ﴾ (النساء٤/ ٨٠) جس شخص نے رسول کی اطاعت کی تو بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس نے رسول کی اطاعت کی تو اللہ کی اطاعت اس میں از خود شامل ہو گئی۔ بالفاظ دیگر رسول کی اطاعت عام ہے اور اللہ یا کتاب اللہ کی اطاعت خاص ہے۔ کتاب اللہ میں احکام بہت تھوڑے اور مجمل ہیں۔ اطاعت رسول سے ہی کتاب اللہ کے احکام کی بجا آوری ممکن ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو اطاعت رسول کا ہی اصولی طور پر حکم دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ اللہ کی اطاعت تو رسول کی اطاعت سے ہی ممکن ہے اور رسول ہی کی اطاعت میں اللہ کی اطاعت شامل ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبانی کہلوایا

﴿ قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ ﴾ (آل عمران٣/ ١٣) (اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کے دعوی کا معیار صرف رسول اللہ کی اتباع ہے۔ اسی پیمانہ سے کسی بندہ کی اپنے پروردگار سے محبت کے دعوی کو ماپا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اتباع رسول کا یہ پیمانہ اس قدر بار آور ہے کہ ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ خود محبت کرنے لگتا ہے۔ اس آیت میں بھی اکیلے رسول کی اتباع کا ذکر کیا گیا۔ کتاب اللہ کا نہیں۔ یہی حدیث کی پیروی یا حجیت حدیث ہے کیونکہ آپ کے اعمال وافعال کا تفصیلی ذکر حدیث میں ہے۔ قرآن میں نہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



## اطاعتِ رسول ہی اصل ہدایت ہے:

﴿ وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا ۚ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿٥٤﴾ ﴾ (النور ٢٤/ ٥٤)

اگر تم رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول کے ذمہ تو یہی بات ہے کہ وہ تمہیں واضح طور پر بات پہنچادے۔

﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٥٦﴾ ﴾ (النور ٢٤/ ٥٦)

اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دیتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

## اقوال وافعالِ رسول حجتِ شرعیہ ہیں:

﴿ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ (النساء ٤/ ١٦٥)

(اللہ کے) رسول ہیں خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ پر حجت نہ رہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف رسولوں کا ذکر کر کے یہ بات سمجھائی ہے کہ وہ بغیر کتاب کے بھی لوگوں پر حجت ہوتے ہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴿١٥﴾ ﴾ (الأسراء ١٧/ ١٥)

اور ہم عذاب نہیں دیتے جب تک پہلے پیغمبر نہ بھیج لیں۔

یہاں بھی کتاب کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ پیغمبر کا ذکر فرمایا۔ گویا پیغمبر کی اطاعت اتنی ضروری ہے کہ اس سے انکار پر لوگوں پر حجت قائم ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کر دیتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوال وافعال رسول کی اتباع واجب ہے۔ جسے اصطلاحاً حجیت حدیث کہا جاتا ہے۔

۱۰۔ مشرکین بتوں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر یہ بت اللہ کے شریک ہیں تو

﴿ ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤﴾ ﴾

میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب یا علمی روایت لاؤ۔ اگر تم سچے ہو۔ (الأحقاف ٤٦/ ٤)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کو حجت یا دلیل قرار دیا ہے (۱) کتاب یعنی کتاب اللہ (۲) علمی روایات یا اقوال وافعال رسول یہ بھی واضح رہے کہ دورِ نبوی اور خیر القرون میں لفظ علم کا اطلاق احادیث رسول پر ہی ہوتا تھا۔ یہ آیت بھی حجیت حدیث پر برہانِ قاطع ہے۔

## رسول کی اطاعت دائمی ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

بلاشبہ تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ (کی ذات) میں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



﴿ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ﴾ (الأحزاب ۳۳/ ۲۱) عمدہ نمونہ ہے۔ اس شخص کے لئے جو (اللہ کے سامنے حاضر ہونے) اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہے۔

اب دیکھئے آخرت پر ایمان اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا عقیدہ صرف صحابہ کرام کے لئے ہی نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں سب کے لئے ضروری اور ان کے ایمان کا حصہ ہے اور اللہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں بہرحال رسول کی زندگی کو آئیڈیل کے طور پر اپنے سامنے رکھنا' اور اس کی اتباع کرنا ضروری ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ کی اطاعت وقتی اور عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے۔

﴿ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ﴾ (المنافقون ۶۲/ ۲۔۳)

وہی تو ہے جس نے امی قوم میں سے ہی ایک رسول مبعوث فرمایا جو اس پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھتا اور ان کی زندگی سنوارتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے اور رسول کی بعثت ان لوگوں کے لئے بھی ہے جو ان سے ابھی نہیں ملے ہیں۔

یہ آیات صاف طور پر بتا رہی ہیں کہ رسول اللہ کی بعثت نہ تو صرف عرب قوم تک محدود ہے اور نہ صحابہ کے دور تک بلکہ ﴿ آخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ﴾ سے وہ تمام مسلمان مراد ہیں جو ان آیات کے نزول تک ایمان نہیں لائے تھے۔ خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب۔ نیز وہ صحابہ کے دور کے بعد کسی بھی دور سے تعلق رکھتے ہوں۔ گویا ان آیات کی رو سے آپ کی بعثت تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے اور ابد تک ہے جس کا لازمی نتیجہ آپ کی دائمی اطاعت پر منتہی ہوتا ہے۔

نیز درج ذیل آیات بھی آپ کے تمام بنی نوع انسان کے لئے اور تا ابد مبعوث ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

﴿ تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝ ﴾ (الفرقان ۲۵/ ۱)

بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لئے ڈرانے والا ہو۔

اس آیت میں لفظ عالمین سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بحیثیت رسول ﷺ آپ کی اتباع صحابہ تک محدود نہیں بلکہ اس میں اس دور کے لوگ بھی شامل ہیں اور بعد میں آنے والے ادوار کے بھی۔ نیز اس آیت میں عالمین کے ساتھ نذیراً کا لفظ آپ کی اطاعت کو دائمی قرار دیتا ہے۔

﴿ وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ﴾ (الأنعام ۶/ ۱۹)

اور میری طرف یہ قرآن نازل کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ میں تمہیں ڈراؤں اور ان لوگوں کو بھی جن تک

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



یہ قرآن پہنچے۔

اس آیت میں وَمَنْ بَلَغَ کے مفہوم کی وسعت کا اندازہ لگا لیجئے۔ کہ اس میں کیسے تمام بنی نوعِ انسان شامل ہو جاتی ہے۔

﴿ وَمَآ أَرْسَلْنَـٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ﴾ (سبأ ۳٤/ ۲۸)

اور ہم نے آپ کو تمام بنی نوعِ انسان کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ﴾ (الأعراف ۷/ ۱۵۸)

(اے نبی! کہہ دو کہ) اے بنی نوع انسان میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

یہ دونوں آیات بھی آپ کی رسالت کے لئے آپ کی اطاعت تمام بنی نوع انسان کے لئے اور ابد تک کے لئے پھیلا دیتی ہیں۔

## اتباعِ رسول ﷺ کے منکرین کے لئے وعید

### اتباع رسول کا منکر کافر ہے:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا۟ فِىٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا ۝٦٥ ﴾ (النساء ٤/ ٦٥)

پس تیرے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک ایماندار نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے تنازعات میں آپ کو حاکم تسلیم نہ کریں۔ پھر آپ کے فیصلہ کے متعلق اپنے دلوں میں تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پورے طور پر اس فیصلہ کو تسلیم نہ کرلیں۔

اب دیکھیے آپ نے جو بھی فیصلے فرمائے وہ بہرحال کتاب اللہ میں مذکور نہیں۔ لیکن ان فیصلوں کی غیر مشروط اور برضا ورغبت اطاعت کو اصل ایمان قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآنی احکام کی وہی تعبیر قابل حجت ہے جو آپ نے پیش فرمائی لہٰذا آپ کے فیصلے یا آپ کی تعبیر سے انکار وانحراف ایمان سے دستبردار ہونے کے مترادف ہے۔

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا۟ بَيْنَ ٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا۟ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝١٥٠ أُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْكَـٰفِرُونَ حَقًّا ﴾ (النساء ٤/ ۱۵۰-۱۵۱)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان (اطاعت میں) تفریق ڈالیں اور کہتے ہیں کہ ہم ایک کو تو مانتے ہیں اور دوسرے کو نہیں مانتے اور کفر وایمان کے درمیان ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہی لوگ پکے کافر ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات خالصتاً منکرینِ حدیث کے لئے ہی نازل ہوئی ہیں کیونکہ ہم نے ایسا کوئی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



شخص نہیں دیکھا جو اللہ کو نہ مانے مگر اس کے رسول کو مانتا ہو۔ البتہ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو اللہ کو تو مانتے ہیں یعنی اس کے احکام کو واجب التعمیل سمجھتے ہیں۔ لیکن رسولوں کو نہیں مانتے۔ اسی طبقہ میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو زبانی طور پر تو رسالت کا اقرار کرتے ہیں مگر عملاً ارشاداتِ نبوی یا افعال واعمال رسول کو واجب الاطاعت یا واجب الاتباع نہیں سمجھتے گویا رسول کو نہ ماننا خواہ زبان سے ہو یا عمل سے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں۔

## اتباعِ رسول سے روگردانی منافقت ہے:

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ﴿٦١﴾ ﴾ (النساء٤/ ٦١)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ تمہاری طرف آنے سے پہلو تہی کر جاتے ہیں۔

اب دیکھئے اس آیت میں دینی احکام کا ماخذ دو چیزیں بتائی گئی ہیں ایک کتاب اللہ دوسرے رسول کی تشریحات یا فیصلے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ رسول تک آنے سے گریز کرتے ہیں تو ایسا شیوہ منافقین کا ہی ہو سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسے کتاب اللہ شرعی حجت ہے اسی طرح سنت رسول بھی حجتِ شرعیہ ہے۔

## رسول کا مخالف جہنمی ہے:

﴿ وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿١١٥﴾ ﴾ (النساء٤/ ١١٥)

اور جو کوئی راہ راست کی وضاحت کے بعد رسول سے کنارہ کش رہے اور اہل ایمان (صحابہ) کے علاوہ کوئی دوسری راہ اختیار کرے تو ہم بھی اسے اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اس کو جہنم میں ڈال دیں گے جو بدترین ٹھکانہ ہے۔

دیکھئے اس آیت میں بھی کتاب اللہ کا کہیں ذکر نہیں۔ صرف رسول کی عدم اطاعت اور مخالفت کا ذکر ہے جو جہنم میں داخلہ کا موجب بن گئی نیز اس آیت میں ہدایت سے مراد قرآن پر رسول اللہ کے عمل کرنے کا طریق ہے جسے صحابہ نے اختیار کیا۔ اب جو شخص اس راہ کے علاوہ کوئی بھی دوسری راہ اختیار کرے گا۔ یا اس راہ میں اختلاف پیدا کرے گا تو وہ جہنمی ہے۔ یہ آیت بھی حجیتِ حدیث پر قوی دلیل ہے۔

﴿ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿٢٧﴾ ﴾ (الفرقان٢٥/ ٢٧)

اور جس دن ظالم اپنے دونوں ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا۔ اے کاش میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس آیت میں کتاب کا ذکر نہیں بلکہ رسول کے راستہ کا ذکر ہے جو حدیث سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ حدیث کو چھوڑنے کی وجہ سے جب ایسے شخص کو جہنم کا عذاب سامنے نظر آتا ہوگا تو وہ حسرت سے یہ الفاظ کہے گا۔

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦٣﴾﴾ (النور ۲۵/ ۶۳)

جو لوگ رسول کے حکم کا خلاف کرتے ہیں انہیں اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ ان پر کوئی آفت نہ آن پڑے یا ان پر کوئی دردناک عذاب نازل ہو۔

اس آیت میں رسول کی اطاعت نہ کرنے والے کے لئے اخروی عذاب کے علاوہ دنیا میں ہی عذاب کے احتمال کی وعید سنائی گئی ہے۔ یہاں بھی رسول کی اطاعت یا مخالفت کا ذکر ہے۔ کتاب اللہ کی اطاعت کا ذکر نہیں ہوا۔

نتائج: مندرجہ بالا آیات سے درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ اللہ کی اطاعت کا الگ طور سے بھی حکم آسکتا ہے اور رسول کی اطاعت کا الگ اور مستقل حیثیت سے بھی۔ گویا اطاعتیں ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ جس طرح اللہ کی اطاعت کی مستقل اور دائمی حیثیت ہے۔ اسی طرح رسول اللہ کی اطاعت کی بھی الگ، مستقل اور دائمی حیثیت ہے۔ اگرچہ یہ بات ناممکن ہے کہ رسول اللہ کی منشاء کے خلاف کسی بات کا حکم دے۔

۲۔ اللہ کی اطاعت کا طریقہ بھی رسول کے ذریعہ ہی معلوم ہو سکتا ہے لہٰذا رسول کی اطاعت کو اصل قرار دیا گیا۔ یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی۔ اس لحاظ سے اطاعت ایک شمار ہوگی اور وہ رسول کی ہوگی۔ جس میں اللہ کی اطاعت از خود شامل ہوگی۔

۳۔ رسول کی اطاعت عام ہے۔ اللہ کی اطاعت خاص ہے۔ رسول کی اطاعت میں اللہ کی اطاعت شامل ہوتی ہے جب کہ کتاب اللہ کی اطاعت رسول کی اطاعت کے بغیر ناممکن ہے۔

۴۔ جو لوگ احکام الٰہی کی اطاعت رسول اللہ کے مقرر کردہ راستہ کے علاوہ خود ساختہ طریقہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جہنمی ہیں اور دنیا میں عذاب کے مستحق ہوتے ہیں۔

## حجیّتِ حدیث کے عقلی دلائل

حجیتِ حدیث سے متعلق اب تک ہم نے قرآن کریم سے نقلی دلائل پیش کئے تھے۔ اب چند عقلی دلائل بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

۱۔ صحابہ کی قرآن فہمی: قرآن کریم رسول اللہ پر نازل ہوا۔ جسے آپ نے امت کو پہنچایا اور سکھایا ہی نہیں بلکہ اس پر عمل کر کے بھی دکھایا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ کی قرآن کریم کی عملی تفسیر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



وتعبیر قرآن نازل کرنے والے کی منشاء کے مطابق تھی یا خلاف؟ اگر خلاف سمجھیں تو اس کی سب سے پہلی زد تو اللہ تعالیٰ پر ہی پڑتی ہے کہ اس نے رسول ہی ایسا کیوں انتخاب کیا جو اس کی منشاء کو سمجھ بھی نہ سکتا تھا اور دوسری زد خود اسلام اور مسلمانوں پر کہ اگر ان کی بنیاد ہی غلط تھی تو عمارت کیسے درست ہو سکتی ہے؟ لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رسول اللہ کی عملی تعبیر و تفسیر جو آپ نے صحابہ کرام کو سکھائی اور دکھائی تھی۔ اللہ کی منشاء کے عین مطابق تھی۔ اب جو شخص اس تفسیر و تعبیر سے اختلاف کرتا ہے یا اسے حجت نہیں سمجھتا تو اس کو اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اس کی ایسی تاویلات امت میں تفرقہ وانتشار کی فضاء تو پیدا کر سکتی ہیں لیکن قبول عام کا درجہ کبھی حاصل نہیں کر سکتیں کیونکہ یہ بات عقلاً محال ہے کہ کوئی شخص قرآن کے معانی تفسیر اور عملی تعبیر صحابہ کرام اور تابعین سے بہتر سمجھ سکے۔

۲۔ تعاملِ امت: حجیتِ حدیث کی دوسری عقلی دلیل تعاملِ امت ہے۔ اسلام کے بنیادی احکام کی تعمیل دور نبوی سے لے کر آج تک کروڑوں انسانوں کے واسطہ سے ہم تک پہنچی لیکن اس کے اصول ومبادیات میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ فروعی اختلاف اگر کچھ ہیں تو وہ ایسے ہیں جو اجتہاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اختلاف صرف ان مسائل میں ہے جو کتاب وسنت سے بہ نص صریح ثابت نہیں ہوتے۔ تعامل امت سے بھی یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ جس طرح کتاب اللہ حجت شرعیہ ہے۔ اس طرح رسول اللہ کی احادیث بھی حجت شرعیہ ہیں۔

۳۔ موضوعات کا وجود: موضوع احادیث کا وجود حجیتِ حدیث پر ایسی زبردست عقلی دلیل ہے جس سے منکرین حدیث بھی انکار نہیں کر سکتے۔ سوال یہ ہے کہ اگر احادیث حجت شرعیہ نہیں ہیں تو موضوع احادیث گھڑنے کا فائدہ کیا تھا؟ کھوٹے سکے تو تبھی بنائے جاتے ہیں جب اصلی سکے بازار میں کچھ قدر و قیمت رکھتے ہوں۔ اور جس چیز کی بازار میں کوئی قدر و قیمت نہ ہو اس کی نقل اتارنے کی آخر کون پاگل کوشش کرے گا؟ یہ بات تو منکرین حدیث بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ایک دور آیا۔ جب موضوعات کا سیلاب امڈ آیا تھا جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس وقت تک امت کی اکثریت احادیث کی حجیت کی قائل تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے۔ کہ منکرینِ حدیث جو حجیت حدیث کے ابطال میں گوناگوں قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں۔ اندر سے خود بھی حجیت حدیث کے قائل ہوتے ہیں۔ ابتدائی ادوار میں مشہور معتزلی خطیب جاحظ موضوع احادیث گھڑا کرتا تھا حالانکہ معتزلہ ہی وہ ابتدائی فرقہ ہے جس نے حدیث کی حجیت سے انکار کیا تھا اور آج کل ادارہ طلوع اسلام بھی اپنی بات کو مستند بنانے کے لئے کئی اقوال وافعال رسول اللہ کے ذمہ لگا کر وضع حدیث کا ارتکاب کر رہا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے اسی کتاب کے حصہ دوم کا باب" وضع حدیث اور وضاعین)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



باب: ششم

# قرآنی نظامِ ربوبیت

قرآنی نظام ربوبیت کے موجد غلام احمد پرویز صاحب ہیں۔ آپ کے لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً آپ کا ذہن ملکیت زمین سے برگشتہ ہوا۔ اس وقت آپ زمین کے علاوہ دیگر اشیاء کے حق ملکیت کے منکر نہیں تھے پھر جوں جوں آپ کا ذہن کیمونزم کو قبول کرتا گیا۔ آپ نے آہستہ آہستہ دوسری اشیاء کے انفرادی حق ملکیت سے انکار کر دیا۔ آپ کی مختلف ادوار میں لکھی ہوئی تحریروں میں اسی لئے تضاد واقع ہوا ہے جس کی چند ایک مثالیں آپ اس مضمون میں بھی ملاحظہ فرمالیں گے پھر جب آپ کے ذہن نے کیمونزم کو پوری طرح قبول کر لیا تو تیسرا مرحلہ اس کیمونزم کو اسلامی بنانے اور اسے قرآن سے ثابت کرنے کا تھا۔ جس کے لئے آپ کو خاصی کدو کاوش کرنا پڑی۔ تقریباً تمام متداول شرعی اصطلاحوں کے مفہوم کو بدل دیا اور قرآنی نظام ربوبیت کے نام سے ایک کتاب لکھ کر اپنی اس خواہش کو پورا کیا۔

ہم اس موضوع کو دو ابواب میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے باب میں عدم حقِ ملکیت کے متعلق وہ دلائل اور ان کا جائزہ ہے جو اشتراکیت زدہ حضرات کی طرف سے پہلے بھی پیش کئے جاتے رہے ہیں اور اب پرویز صاحب نے بیان فرمائے ہیں۔ دوسرے باب میں نظریہ نظامِ ربوبیت اسے اسلامی بنانے کے طریقے اور پرویز صاحب کا تفسیری انداز ہدیہ ناظرین کیا جانے لگا۔

## ۱۔ ملکیتِ زمین

فطری قانون حقِ ملکیت: قدرتی اشیاء سے فائدہ اٹھانے کا فطری طریقہ یہ ہے کہ جس نے اس سے فائدہ اٹھانے میں پہل کر لی وہ اس کا حقدار سمجھ لیا گیا۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ جنگل میں عموماً درختوں کے پتے، شاخیں اور دیگر لکڑیاں بے کار پڑی رہتی ہیں۔ اب کوئی شخص انہیں اکٹھا کر کے ایندھن کے طور گھر لے آتا ہے یا انہیں منڈی میں لے جا کر فروخت کر دیتا ہے تو اس کا یہ حق تسلیم کیا جائے گا۔ ایندھن کو اکٹھا کرنے یا اس پر قبضہ کرنے سے پیشتر یہ حق سب انسانوں کے لئے برابر تھا کہ جو کوئی اسے اکٹھا کر کے اس پر اپنا قبضہ جما لے تو یہ اس کی ملکیت سمجھی جائے گی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اب اگر ایک شخص ایندھن کو اکٹھا کر دیتا ہے لیکن اسے یونہی جنگل میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کرتا تو پھر بھی اس کا حق ملکیت ختم ہو جائے گا۔ اب جو شخص پہلے آکر اس پر قبضہ جمالے گا وہ اسی کی ملکیت تصور ہوگا۔ لیکن اگر پہلے شخص کا جس نے اکٹھا کرنے کی محنت کی ہے--- قبضہ بحال ہو اور کوئی دوسرا شخص یہ جھگڑا ڈال دیتا ہے کہ اس میں سے آدھا مجھے دے دو یا سارا ہی چھین لیتا ہے تو دوسرا شخص غاصب متصور ہوگا جس نے پہلے شخص کے حقِ ملکیت کو چھیننے یا اس میں جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یا اگر پہلے شخص نے یہ ایندھن اکٹھا کر کے اپنے گھر میں محفوظ کر لیا ہے اور کوئی دوسرا شخص پہلے شخص سے آنکھ بچا کر اس کا محفوظ کیا ہوا ایندھن اٹھالے جاتا ہے تو وہ چور سمجھا جائے گا۔

**حقِ ملکیت کے عوامل:** گویا دو چیزیں کسی انسان کی حقِ ملکیت کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ ابتدائی محنت اور اس پر قبضہ اور حفاظت۔

اب دیکھئے کسی شخص کو ایسی چیز کہیں گری پڑی مل گئی ہے یا اسے خود اٹھا کر اس نے محفوظ کر لیا ہے جس سے وہ تو فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور وہ اس کے لئے بیکار ہے اور ایک مدت تک یونہی پڑی رہتی ہے لیکن کوئی دوسرا شخص اس چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے تو اس پہلے شخص کو چاہیئے کہ وہ چیز اس شخص کو ازراہ احسان دے دے جو اس کو سمجھتا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے کیونکہ کسی بھی چیز کی اصل غرض وغایت اس چیز سے انتفاع یا فائدہ اٹھانا ہوتا ہے ۔ اب اگر پہلا شخص وہ چیز از خود دوسرے کے حوالے نہیں کرتا تو دوسرے لوگ اسے ایسا کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کسی چیز پر ابتدائی محنت اور قبضہ جمانے کے باوجود کوئی شخص اس سے انتفاع کی اہلیت نہیں رکھتا تو یہ عدم انتفاع اس کے حق ملکیت کے ساقط کرنے کا باعث بن سکتا ہے گویا ابتدائی محنت اور قبضہ تو ملکیت کے حق میں مفید ہیں۔ انتفاع اس حق کو مضبوط بناتا ہے اور عدمِ انتفاع اس حق کو کمزور کر دیتا ہے۔

ایسے ہی حقِ ملکیت سے متعلق پیدا ہونے والے جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے حکومتیں قانون بناتی ہیں۔ زمین بھی چونکہ ایک قدرتی عطیہ ہے لہٰذا اس سے انتفاع کے لئے بھی یہی قدرتی اصول لاگو ہوتے ہیں۔ حکومت کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ۔

۱۔ جو شخص جتنی زمین کو زیر کاشت لا کر اس سے فائدہ حاصل کر رہا ہے وہ اس کے قبضہ میں رہنے دے۔

۲۔ جس شخص نے کسی قطعہ زمین پر قبضہ جما رکھا ہے لیکن وہ اس کو زیر کاشت نہیں لاتا یا بالفاظ دیگر اس سے فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ حکومت اس سے زمین واپس لے کر کسی ایسے شخص کو دے دے جو اسے زیر کاشت لانے کی اہلیت رکھتا ہو۔

۳۔ حکومت کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ بے کار پڑی ہوئی زمین سے کچھ حصہ کسی ایسے شخص کو عطا کر دے جو اسے زیر کاشت لا کر فائدہ اٹھا سکے اور حکومت کا یہ عطیہ بھی دو اغراض پر مبنی ہوتا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



(ا) محض زمین سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے کسی کاشتکار کو دے دی جائے۔
(ب) کسی شخص کو محض حکومت کی خدمات کے صلہ میں عطا کر دی جائے تاکہ وہ اسے زیر کاشت لا کر اس سے فائدہ حاصل کرے۔

انسان کی ابتدائی زندگی سے لے کر موجودہ دور تک زمین کی ملکیت سے متعلق یہی اصول لاگو رہے ہیں کسی مملکت کے قبضہ میں جتنی زمین ہوتی ہے اس پر ابتدائی حق تو حکومت ہی کا سمجھا جاتا رہا ہے بعد میں حکومت انہی مندرجہ بالا اصولوں کے تحت زمین کے حق ملکیت کے فیصلے کرتی ہے۔

**حق ملکیت کا اسلامی تصور:** اسلام نے آکر یہ تصور پیش کیا کہ ہر چیز کا خالق ومالک اللہ تعالیٰ ہے لہٰذا یہ کائنات بشمول زمین سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے ارشاد باری ہے:

﴿ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ﴾ "اور زمین اور آسمانوں کی وراثت خدا ہی کے لئے ہے" (الحدید ۵۷/ ۱۰)

تو یہ اس لحاظ سے ہے کہ اگر ایک مالک زمین بیچ دیتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہی اور اگر مرجاتا ہے تو اولاد اس کی زمین کی وارث بن جاتی ہے۔ ان میں سے کوئی ایسا مالک نہیں جو فانی نہ ہو' صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جسے بقائے دوام ہے لہٰذا وہی زمین وآسمان کا خالق ومالک بھی ہے اور وارث بھی۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ زمین ہی نوع انسان کا مستقر اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے بنائی ہے لہٰذا اسلام نے زمین پر انسانوں کا حق بھی تسلیم کیا ہے۔ اجتماعی طور پر بھی اور انفرادی طور پر بھی۔ زمین پر اجتماعی حق ملکیت یا حکومت کے حق کے لئے درج ذیل آیت ملاحظہ فرمائیے:

﴿ أَنَّ ٱلْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ ٱلصَّٰلِحُونَ ﴿١٠٥﴾ ﴾ "بے شک میرے نیکو کار بندے زمین کے وارث ہوں گے۔" (الأنبیاء ۲۱/ ۱۰۵)

اور انفرادی ملکیت کے لئے درج ذیل آیت ملاحظہ فرمائیے۔

﴿ إِنَّ ٱلْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ ﴾ "بے شک زمین اللہ کی ہے اور اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے۔" (الأعراف ۷/ ۱۲۸)

گویا وہ تصورِ ملکیت زمین جو ابتدا سے چلا آرہا تھا اس میں صرف یہ اضافہ کیا ہے کہ زمین کا اصل مالک ووارث اللہ تعالیٰ ہے۔ تمہاری محنت کو بار آور بھی وہی کرتا ہے لہٰذا انسانوں کو چاہیئے کہ زمین اور اس سے پیدا شدہ کھیتی کو خدا ہی کے احکام کے مطابق استعمال کیا جائے یعنی پیدا شدہ کھیتی سے اللہ کا حق بھی ادا کیا جائے اور کسی دوسرے کی زمین کو ناجائز طور غصب بھی نہ کیا جائے۔ رہا زمین پر انفرادی یا اجتماعی حق ملکیت تو اسے اسلام نے جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔

یہ تو تھا حق ملکیت کے متعلق وہ تصور جو قرآن سے حاصل ہوتا ہے اور جس کی تائید وتوثیق احادیث اور تاریخ سے بھی ہوتی ہے۔ مگر جب سے روس میں اشتراکی نظام قائم ہوا ہے اور اس نے دوسرے ملکوں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



میں اس نظام کے بپا کرنے کے لئے فضا کو سازگار بنانے کے لئے اپنے ایجنٹ چھوڑ رکھے ہیں تو اشتراکیت نوازوں نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگانا شروع کر دیا ہے چونکہ یہ اشتراکی نظام زمین اور اسی طرح دوسری اشیاء پر انفرادی حق ملکیت تسلیم نہیں کرتا لہٰذا ان حضرات نے قرآن سے حق ملکیت زمین کے عدم جواز کا کھوج لگانا شروع کر دیا۔ یہ مسئلہ کوئی ایسا تو ہے نہیں جو انسانی زندگی کے کسی تاریک گوشہ سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ مسئلہ انسان کی معاش سے تعلق رکھتا اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو زمین کی ذاتی ملکیت کو ناجائز یا حرام قرار دینا مقصود ہوتا تو قرآن میں ایسے واضح احکام نازل کئے جاتے جن سے سابقہ مروجہ حق ملکیت کی تردید کی جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قرآن میں کوئی ایسا واضح حکم موجود نہیں۔ قرآن نے بے شمار مروجہ عادات ورسوم کی واضح الفاظ میں تردید بھی کی ہے' حرام بھی کیا ہے اور اصلاح بھی فرمائی ہے۔ جیسے شراب' سود' تعدد ازواج' میراث' طلاق اور ایلاء وغیرہ۔ لیکن ذاتی حق ملکیت کے متعلق تردید تو درکنار اس کی توثیق ضرور فرمائی ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

**متشابہات سے استفادہ:** ہوتا یہ ہے کہ جب کسی باطل نظریہ کو قرآن سے ثابت کرنے کی ضرورت درپیش ہو تو واضح احکامات کو چھوڑ کر متشابہ آیات کو اپنی خواہشات ونظریات کا ہدف بنایا جاتا ہے اور اسی بات سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ هُوَ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ عَلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ مِنْهُ ءَايَٰتٌ مُّحْكَمَٰتٌ هُنَّ أُمُّ ٱلْكِتَٰبِ وَأُخَرُ مُتَشَٰبِهَٰتٌ ۖ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَٰبَهَ مِنْهُ ٱبْتِغَآءَ ٱلْفِتْنَةِ وَٱبْتِغَآءَ تَأْوِيلِهِۦ ۗ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُۥٓ إِلَّا ٱللَّهُ ۘ وَٱلرَّٰسِخُونَ فِى ٱلْعِلْمِ ﴾ (آل عمران ۳/ ۷)

"وہی اللہ ہی تو ہے جس نے آپ ﷺ پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور (وہی) اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ [1] ہیں تو جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کا اتباع کرتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور اس کی تاویل کریں حالانکہ ان کی تاویل اللہ ہی جانتا ہے۔ اور (یا پھر وہ لوگ) جو علم میں دستگاہِ کامل رکھتے ہیں"

---

[1] محکمات وآیات ہیں جن کے معنی ایک ہی ہوں اور صاف اور واضح ہوں اور متشابہات وہ آیتیں ہیں جن میں کئی معنوں کا احتمال پایا جاتا ہو اور مطلب کے کئی پہلو ہوں حقیقت میں مراد تو ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ مگر الفاظ اور ان کی ترکیب ایسی ہوتی ہے کہ دوسرے معنوں کا بھی احتمال پایا جاتا ہے۔ ایسی آیتوں کے معنی اپنی رائے سے نہ کرنے چاہئیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس سے رسول اللہ ﷺ اور ان کے اصحاب نے کیا سمجھا۔ اس معیار کو نظر انداز کر کے اگر اپنی رائے سے تاویل کی جائے تو اس کے لئے وعید شدید آئی ہے کیونکہ یہی تفسیر بالرائے گمراہی کا اصل سبب ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ متشابہات سے اِستنباط کرنا اور محکمات کو نظر انداز کرنا ان لوگوں کا کام ہے جن کے دل میں ٹیڑھ ہو۔ بالفاظ دیگر جو لوگ کوئی باطل نظریہ قرآن سے کشید کرنا چاہتے ہوں۔

۲۔ اس طرح کی تاویل کا حق صرف ایسے لوگوں کو ہو سکتا ہے جن کا اوڑھنا' بچھونا ہی دینی علوم اور ان پر عمل ہو۔

اس واضح حکم کے باوجود ان دوستوں نے متشابہات ہی کو اپنی تاویل کا نشانہ بنایا ہے۔ اب جن آیات یا واقعات سے عدم جواز حق ذاتی ملکیت زمین ثابت کیا جاتا ہے ہم اس کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

## عدم جوازِ ملکیت زمین پر طلوعِ اسلام کے دلائل کا جائزہ

۱۔ **قرآنی آیات سے:** جن قرآنی آیات سے یہ مسئلہ استنباط کیا جاتا ہے ان میں سرفہرست تو ﴿ اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ ﴾ یا ﴿ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ ہی ہیں جنہیں ہم "حق ملکیت کا اسلامی تصور" کے ذیلی عنوان کے تحت پیش کر چکے ہیں' لہٰذا ان پر اب مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ تیسری آیت جو اس سلسلہ میں بڑی شدومد سے پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے:

﴿ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ﴾ (فصلت ۴۱/ ۱۰)

"اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سامان معیشت مقرر کیا۔ چار دن (Periods) میں اور تمام طلبگاروں کے لئے یکساں۔"

آیت بالا میں دو الفاظ سواء اور سائلین ذو معنی ہیں۔ اسی وجہ سے آیت کے ترجمے مختلف حضرات نے مختلف کئے ہیں۔ تاہم ہم نے وہی معنی درج کئے ہیں جو ہمارے ان دوستوں کے حسب پسند ہیں۔

**لفظ سئل کے معانی:** سئل کا لفظ پوچھنا اور مانگنا دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً

۱۔ بمعنی پوچھنا جیسے فرمایا

﴿ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ﴾ (۶۷-۸) "دوزخ کے داروغہ ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہ آیا تھا؟

۲۔ بمعنی مانگنا جیسے فرمایا۔

﴿ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾ (۲-۲۷۳) "وہ لوگوں سے چمٹ کر نہیں مانگتے"

سئل کا لفظ قرآن کریم میں ۶۷ دفعہ استعمال ہوا ہے۔ ۵۲ مقامات پر پوچھنے کے معنوں میں آیا ہے اور ۱۵ مقامات پر مانگنے کے معنوں میں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**لفظ سواء کے معانی:** اسی طرح سواء کا لفظ بھی بنیادی طور پر دو معنی کا حامل ہے (۱) استقامت اور (۲) دو چیزوں کے درمیان برابری اور اعتدال (مقائیس اللغة لابن الفارس) اور قرآن میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً:

۱۔ اِستقامت کے لئے ﴿ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَاءِ الصِّرَاطِ ﴾ (۳۸-۲۲) اور ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیجیے۔ یہاں سواء کا لفظ مستقیم کے معنوں میں آیا ہے جیسے سورہ فاتحہ میں فرمایا: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ (۱-۵) "ہم کو سیدھی راہ پر چلا"

۲۔ برابری اور اعتدال کے لئے جیسے فرمایا: ﴿ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَءَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ ﴾ (۲-۶) آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کے لئے برابر ہے۔

﴿ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴾ (۴۴-۴۷) فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ اس گنہگار کو پکڑو اور کھینچتے ہوئے اسے دوزخ کے بیچوں بیچ لے جاؤ۔

اب دیکھئے ﴿ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ﴾ کے مندرجہ ذیل معنی ہمیں تراجم میں ملتے ہیں۔

۱۔ برابر ہے واسطے پوچھنے والوں کے" (شاہ رفیع الدین)

۲۔ سب مانگنے والوں کے لئے ہر ایک کی طلب اور حاجت کے مطابق (تفہیم القرآن مودودی صاحب)

۳۔ ٹھیک جواب پوچھنے والوں کو (احمد رضا خاں)

۴۔ تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر (پرویز صاحب۔ قرآنی نظام ربوبیت)۔

اور یہ اختلاف معانی متاخرین تک ہی محدود نہیں' مقتدمین میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً ابن عباس رضی اللہ عنہ قتادہ اور سدی یہ معنی بیان کرتے ہیں "پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا" اور ابن زید اس کا یہ معنی بتاتے ہیں "ہر ایک کی طلب وحاجت کے مطابق" بحوالہ تفہیم القرآن حاشیہ آیت مذکورہ)۔

**برابری کس کس کی اور کس بات میں؟:** اب ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ صرف پرویز صاحب کا ترجمہ ہی صحیح ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ضرورت مند' طلبگار یا حاجت مند صرف انسان ہی نہیں دوسری مخلوقات مثلاً حیوانات' چرند' پرند' کیڑے' مکوڑے سب ہی خوراک کے محتاج ہیں اور سب کے لئے یہ خوراک زمین ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت:

﴿ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴾ "اور زمین کو مخلوقات کے لئے بچھایا۔"

(الرحمن ۵۵/ ۱۰)

سے بھی واضح ہے تو کیا یہ ساری مخلوق زمین یا پیداوار زمین میں برابر برابر کی حصہ دار ہوگی جیسا کہ ہمارے یہ دوست کہتے ہیں؟ آخر انفرادی ملکیت سے زمین نکال کر اس کی پیداوار کو صرف انسانوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے تو دوسری مخلوق کو ﴿ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ﴾ کے زُمرہ سے نکالنے کی کیا دلیل ہے؟

اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمین سب مخلوقات میں برابر تقسیم ہو یا اس کی پیداوار؟ اور کیا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



یہ ممکن بھی ہے واضح سی بات ہے کہ اس زمین کی پیداوار سے انتفاع میں تو سب مخلوقات ایک جیسا حق رکھتی ہے جیسا کہ ابتدا میں ایندھن کی مثال سے واضح کیا گیا ہے کہ ہر وہ شخص جو زمین کو زیر کاشت لا کر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے میں برابر ہے تو اس برابری کا مطلب صرف یہ ہوا کہ بے کار زمین کو زیر کاشت لانے کا ہر شخص کو ایک جیسا حق حاصل ہے۔ اس میں کسی خاص گروہ یا نسل یا خاندان کا کوئی امتیاز نہیں۔ بس یہی اس آیت کا مطلب ہے۔ اگر حکومت زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر اپنی تحویل میں لے لے تو یہ ﴿ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِينَ ﴾ کیسے ہوئی؟ پھر اگر حکومت اس کی پیداوار کو اپنی مرضی سے افراد کو دیتی یا ان میں تقسیم کرتی ہے تو بھی عملی طور پر ﴿ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِينَ ﴾ کے تقاضے پورے کرنا ناممکن ہے۔

**سیاق وسباق کا طریق:** کسی آیت کے مخصوص معانی متعین کرنے کا پہلا طریقہ تو تصریف آیات ہے۔ تصریف آیات سے جو نتیجہ نکلا وہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آیت زیر غور کو سیاق وسباق کے اندر رکھ کر معلوم کیا جائے کہ یہاں کون سے معنی فٹ بیٹھتے ہیں۔ آیت محولہ بالا سورہ حم السجدہ کی دسویں آیت ہے۔ اب اس سورہ کی آیات ۸ تا ۱۲ ملاحظہ فرمائیے:

﴿ قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٩﴾ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ﴿١٠﴾ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ﴿١١﴾ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿١٢﴾ ﴾ (فصلت ۴۱/ ۹-۱۲)

"کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا' اور دوسروں کو) اس کا مدمقابل بناتے ہو۔ وہی تو سارے جہانوں کا مالک ہے اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سامان معیشت مقرر کیا (سب) چار دن میں (اور تمام) طلبگاروں کے لئے یکساں پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو خدا نے اس (آسمان) اور زمین سے فرمایا' کہ تم دونوں آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے' انہوں نے کہا ہم خوشی سے آئے پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کے کام کا حکم بھیجا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں یعنی ستاروں سے مزین کیا اور (شیطانوں سے) محفوظ رکھا۔ یہ زبردست اور خبردار کے مقرر کئے ہوئے اندازے ہیں"

ہم اس کتاب کے آغاز میں بتا چکے ہیں کہ انسانی تاریخ کا ایک بنیادی اور اہم سوال یہ بھی ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کیونکر ہوئی؟ ان آیات میں اسی سوال کا جواب دیا جا رہا ہے جو سائلین کے اطمینان کے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



لئے کافی ہے۔ اب ان آیات میں سے ﴿ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِين ﴾ والی آیت نکال کر اسے مخصوص معنی میں محصور کر کے اس سے انفرادی ملکیت زمین کا عدم جواز ثابت کرنا ہمارے خیال میں قرآن کریم کے انداز کا منشاء پورا نہیں کرتا اور جن علماء نے ﴿ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ﴾ کا ترجمہ "برابر ہے۔ طلبگاروں کے لئے" کیا ہے وہ بھی اس سے وہ مفہوم مراد لیتے جو ہمارے اشتراکیت پسند حضرات متعین کرتے ہیں۔

چوتھی آیت جس سے یہ مسئلہ استنباط کیا جاتا ہے' درج ذیل ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ﴾ (الحجر ۱۵/ ۲۰)

(۱) "اور ہم نے اس (زمین) میں تمہارے اور جن کے تم رازق نہیں ہو گزارے کے اسباب پیدا کئے ہیں۔" (ثناء اللہ امرتسری)

(۲) اور ہم نے معیشت کے اسباب فراہم کئے تمہارے لئے بھی اور ان بہت سی مخلوقات کے لئے جن کے تم رازق نہیں ہو۔ (تفہیم القرآن)

گویا اس آیت میں بھی ﴿ مَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ﴾ سے مراد وہ انسان مراد نہیں "جن کے پاس اپنی زمین نہیں" بلکہ انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات مراد ہے۔ البتہ شبیر احمد عثمانی نے س کا ترجمہ "جنہیں تم روزی نہیں دیتے" کر کے حاشیہ پر "باندی غلام' چوپائے اور خدام وغیرہ لکھا ہے۔

اب اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ یہاں ﴿ مَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ﴾ سے مراد صرف انسانوں کا نادار طبقہ ہی ہے جو زمین کا مالک نہیں تو بھی اس سے ملکیت زمین کا عدم جواز کب ثابت ہوتا ہے؟ یہاں تو ایک اصول بیان کیا جا رہا ہے کہ "ہم نے سب کے لئے زمین میں سامانِ معیشت بنا دیا ہے" زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ امراء کو چاہیئے کہ ناداروں کی ضروریات بھی پوری کریں اور یہ بات اسلامی تعلیمات کے بالکل مطابق ہے اور اس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔

## قرآن سے ملکیت زمین کے دلائل

اس سلسلہ میں دو آیات پہلے پیش کی جا چکی ہیں چند مزید آیات یہ ہیں۔

﴿ وَدَاوُۥدَ وَسُلَيْمَٰنَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِى ٱلْحَرْثِ ﴾ (الانبیاء ۲۱/ ۷۸)

اور داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام جب وہ کھیتی کے مقدمہ کا فیصلہ کر رہے تھے۔

﴿ أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُۥ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ لَهُۥ فِيهَا مِن كُلِّ ٱلثَّمَرَٰتِ وَأَصَابَهُ ٱلْكِبَرُ وَلَهُۥ

"بھلا تم میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس میں نہریں بہہ رہی ہوں اور اس میں اس کے لئے ہر قسم کے میوے موجود ہوں اور اسے بڑھاپا آپکڑے اور اس کے ننھے ننھے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَأَصَابَهَآ إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ﴾ (البقرة٢/ ٢٦٦)

بچے ہوں تو (ناگہاں) اس باغ پر آگ کا بھرا ہوا بگولا چلے وہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے"

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾﴾ (الكهف١٨/ ٣٢)

"اور ان سے دو شخصوں کا حال بیان کرو جن میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ عنایت کیے تھے اور ان کے گرداگرد کھجوروں کے درخت لگادیے تھے اور ان کی درمیان کھیتی پیدا کردی تھی"

ان تصریحات سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ ملکیتِ زمین سے متعلق جو تصور پہلے سے چلا آرہا تھا قرآن کریم نے اسے بدستور برقرار رکھا ہے۔ اگر ملکیت زمین کے مسئلہ میں ترمیم کرنا مقصود ہوتا تو اس کے لئے واضح اور قطعی احکام امتناع کا نازل ہونا ضروری تھا جیساکہ شراب' ترکہ' سود' پردہ' کثرتِ ازواج اور طلاق وغیرہ کے متعلق نازل ہوئے ہیں بلکہ یہ مسئلہ تو اور بھی زیادہ بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔

۲۔ تاریخ اور طلوعِ اسلام: قرآن کے بعد ان حضرات نے احادیث اور تاریخ سے بھی اِستشہاد کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ علاقوں کی زمینوں کو قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس واقعہ کی حقیقت کچھ اس طرح ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب عراق وایران کا بہت سا علاقہ فتح ہوا تو خمس بیت المال کے لئے اور باقی اموال غنیمت کو مجاہدین میں تقسیم کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی صوابدید کی بنا پر یہ چاہتے تھے کہ اموالِ منقولہ کو تو مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے لیکن مفتوحہ زمینوں کو بیت المال کی تحویل میں دے دیا جائے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے پیش نظر مندرجہ ذیل امور تھے۔

۱۔ اگر مجاہدین میں یہ زمینیں تقسیم کر دی گئیں تو مجاہدین زراعت کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور عسکری قوت میں کمی ہو جائے گی۔

۲۔ ایک وسیع علاقہ مسلمانوں کے زیر نگین آچکا ہے۔ اس کی سرحدوں کی حفاظت پر بے شمار اخراجات کی ضرورت ہے۔ اگر یہ زمینیں بھی مجاہدین میں بانٹ دی جائیں تو اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟

۳۔ آپ مملکت اسلامیہ کو ایک فلاحی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق "اگر مجھے پچھلے مسلمانوں کا خیال نہ ہوتا تو میں جو بستی فتح کرتا اسے فتح کرنے والوں میں بانٹ دیتا' جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو بانٹ دیا تھا۔" (کتاب المزارعہ باب اوقاف اصحاب النبی وارض الخراج)۔

چنانچہ اس مسئلہ پر شدید اختلاف واقع ہوا۔ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ بن عوف' حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور تمام فوجی حضرات اس حق میں تھے کہ یہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم ہونا چاہئیں جیساکہ فتح خیبر کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم فرمائی تھیں۔ تاہم بہت سے صحابہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہم خیال بھی تھے۔ اور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آپ کو اس سلسلہ میں اتنا پریشان کیا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دعا کرتے تھے۔

((اللھم اکفنی بلالاً))

"اے اللہ! مجھے بلال رضی اللہ عنہ سے نجات دے۔" (کتاب الخراج' امام ابو یوسف)

آپ نے اس سلسلہ میں کئی بار اہل شوریٰ اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجالس مشاورت بھی بلائی لیکن معاملہ طے ہونے میں نہ آتا تھا اور آپ اس سلسلہ میں بہت پریشان رہتے تھے۔ تائید ایزدی سے آپ کو اموال غنیمت سے متعلق ایک آیت کا ٹکڑا یاد آگیا جو کہ اس معاملہ میں نص قطعی کا درجہ رکھتا تھا اور جس کی وسعت کے اس گوشہ کی طرف پہلے کسی کا ذہن منتقل نہ ہوا تھا۔ آیت کے ٹکڑے کے الفاظ یہ تھے۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُ وْمِنْ بَعْدِهِم ﴾ (یعنی اموال غنیمت میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں) چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک اجلاس عام بلایا اور اس معاملہ کے متعلق اس آیت سے استدلال پیش کیا تو عامۃ الناس آپ کے ہمنوا ہو گئے۔ چنانچہ ان نئی مفتوحہ زمینوں کو بیت المال کی ملکیت قرار دیا گیا۔

اب دیکھئے اس واقعہ سے بھی فقط اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ نئی مفتوحہ زمینیں تو قومی ملکیت میں لے لی گئیں اور سابقہ زمینیں جو پہلے مالکوں کے قبضہ میں تھیں' وہ ان کے پاس رہیں۔ گویا اس واقعہ سے بھی زمین کی انفرادی ملکیت کا جواز ثابت ہوتا ہے' نہ کہ عدم جواز کسی مالک کی زمین حکومت کو غصب کرنے کا ہرگز اختیار نہیں۔

(۲) آج بھی اگر ایسے حالات پیش آجائیں تو اسلامی مملکت کے سربراہ کو ایسا کرنے کا اختیار ہے کہ وہ نئی مفتوحہ زمینوں کو سرکاری زمین قرار دے جیسا کہ آج کل بھی یہی دستور ہے۔

(۳) جو فیصلہ بھی کیا جائے اس کی دلیل قرآن سے پیش کرنا اور اس کے متعلق مشورہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس ایک واقعہ کے بغیر ان حضرات کو ملتِ اسلامیہ کی پوری تاریخ سے کوئی مثال ایسی نہیں مل سکی جس سے یہ حضرات کچھ فائدہ اٹھا سکیں۔ البتہ ایسے واقعات سے پوری تاریخ بھری پڑی ہے جن سے حق ملکیت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

**۳۔ بائیبل اور طلوعِ اسلام:** قومی ملکیت کے جواز پر قلم اٹھاتے ہوئے (کسی صاحب کے استفسار پر) پرویز صاحب نے بائبل سے انتظامِ یوسفی کو بھی تائید کے طور پر پیش کیا ہے۔ گو اسنادی معیار کے لحاظ سے بائیبل کا مقام حدیث سے بہت پست ہے اور قرآن نے اسے تحریف شدہ بھی قرار دیا ہے۔ تاہم جہاں سے قومی ملکیت کی تائید میں کچھ مل جائے وہی غنیمت ہے۔ آپ پہلے بائیبل کی عبارت نقل فرماتے ہیں پھر اس پر تبصرہ پیش کرتے ہیں۔

**انتظامِ یوسفی:** "اور ہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی اس لئے کہ کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی سرزمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی۔ یوسف نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



سرزمین میں موجود تھی۔ اس غلہ کے بدلہ میں جو لوگوں نے مول لیا جمع کی اور یوسف اس نقدی کو فرعون کے گھر لایا اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی تو سارے مصریوں نے آکر یوسف سے کہا کہ ہم کو روٹی دے کہ ہم تیرے ہوتے ہوئے کیوں مریں؟ کیونکہ نقدی چک گئی۔ یوسف نے کہا کہ اپنے چوپائے دو اگر نقدی چک گئی کہ میں تمہارے چوپایوں کے بدلے تمہیں دوں گا' وہ اپنے چوپائے یوسف علیہ السلام کے پاس لائے اور یوسف علیہ السلام نے گھوڑوں اور بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلوں اور گدھوں کے بدلے ان کو روٹیاں دیں اور اس نے ان کے سب چوپایوں کے بدلے میں انہیں اس سال پالا جب وہ سال گزر گیا وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا نقد خرچ ہو چکا ہمارے خداوند نے ہمارے چوپایوں کے گلے بھی لے لئے' سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بندوں اور زمینوں کے سوا کچھ نہیں رہا۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے ہلاک کیوں ہوں؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے اور یوسف نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لئے مول لی کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کہ کال نے ان کو بہت تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی۔ رہے لوگ سو اس نے انہیں شہروں میں مصر کی اطراف ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انہیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔ تب یوسف نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کیلئے مول لیا۔ لو یہ بیج تمہارے لئے ہے کھیت میں بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہوگا کہ تم پانچواں حصہ فرعون کو دو گے اور چار حصے کھیت میں بیج بونے کو اور تمہاری خوراک اور ان کی جو تمہارے گھرانے کے ہیں اور تمہارے بچوں کی خوراک کیلئے ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں' ہم اپنے خداوند کی نظر میں مورد رحم ہوں اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے اور یوسف علیہ السلام نے ساری مصر کی زمین کیلئے یہ آئین بنایا جو آج کے دن تک مقرر ہے کہ فرعون پانچواں حصہ لے گا مگر صرف کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی"

بائیبل کتاب پیدائش باب ۴۷ سے یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ:

"اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب علت مرض پر غور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمینیں حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں' اس طرح تمام مزروعہ زمین انفرادی ملکیت سے نکل کر قومی ملکیت میں آگئی۔ اس کے بعد حضرت یوسف نے اس زمین کو کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آسانیاں بہم پہنچائیں تاکہ وہ خود کاشت کر سکیں۔ یہ کاشتکار اپنی محنت کے ماحصل کے مالک آپ تھے۔ صرف پیدائش کا پانچواں حصہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



حکومت کو دینا پڑتا تھا تاکہ اس سے مملکت کا نظام چل سکے۔ اب زمیندار کاشتکار کی محنت میں شریک نہیں تھے' اس طرح حضرت یوسف نے ان موٹی موٹی گایوں کو ذبح کر دیا جو دبلی گایوں کو کھائے جا رہی تھیں۔" (قرآنی فیصلے ص:۳۶۰۔۳۶۲)

**طلوع اسلام کی علمی دیانت؟:** گو آپ نے یہ اقتباس نقل کرنے میں بھی حک واضافہ سے کام لیا ہے تاہم اسے سردست ہم نظرانداز کر رہے ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور کہیں گے کہ اس سے اگلی آیت آپ نے درج نہیں فرمائی جو اس طرح ہے۔

"اور اسرائیلی ملک مصر میں جن کے علاقہ میں رہتے تھے اور انہوں نے اپنی جائیدادیں کھڑی کر دیں اور وہ بڑھے اور بہت زیادہ ہو گئے۔" (حوالہ ایضاً۔ آیت نمبر ۲۷)

**نتائج:** اب ہم ان نتائج پر نظر کریں گے جو آپ نے بائبل کی آیات سے لئے ہیں۔

۱۔ آپ کے خیال میں ملک مصر میں قحط کا سبب زمین پر زمینداروں کی ملکیت تھی جب کہ قرآن کریم میں فرعون مصر کا خواب کہ "سات موٹی گائیں سات دبلی گایوں کو کھا گئیں" کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بتائی تھی کہ پہلے سات سال رزق کی خوب فراوانی ہوگی بعد میں سات سال سخت قحط نمودار ہوگا۔ اب اگر قحط کا سبب زمینداری اور قحط کو دور کرنے کے لئے زمینوں کو قومی ملکیت میں لینا ہی اس کا علاج ہے تو آیا فراوانی کے سات سالوں میں یہ زمینیں قومی ملکیت میں تھیں؟ یہ تو ہوتا ہے کہ جاگیردارانہ نظام میں کاشتکار پر زیادتی ہوتی ہے' لیکن کبھی آپ نے یہ بھی سنا ہے کہ جاگیردارانہ نظام میں ملک میں قحط پڑ جاتا ہے؟

۲۔ صحیح معنوں میں بڑے زمیندار یا جاگیردار تو کاہن لوگ تھے' ان کی زمین ان کے پاس ہی رہنے دی گئی تو کیا یہ علاج صرف چھوٹے زمینداروں کے لئے ہی تھا؟

۳۔ زمینداروں سے بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے زمین خریدی تھی اور اس کے عوض انہیں اتنی مالیت کا غلہ دیا تھا لیکن اشتراکیت میں تو زمینیں بحق سرکار ضبط کر لی جاتی ہیں' اس کا کیا جواز ہے؟

۴۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے زمینوں کو قومی تحویل میں لینے کے بعد بھی پانچواں حصہ حکومت کے لئے مقرر کر کے بٹائی کا جواز تو ثابت کر دیا حصہ ملکیت کا زیادہ ہو یا کم محنت کا اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اشتراکیت میں پیداوار کے ماحصل کا مالک کاشتکار نہیں ہوتا بلکہ حکومت ہوتی ہے' اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اشتراکیت جاگیرداری اور سرمایہ داری کی بدترین شکل ہے۔ اس میں حکومت کاشتکاروں سے وہی سلوک کرتی ہے جو انفرادی طور پر ایک زمیندار یا جاگیردار کاشت کاروں سے کرتا ہے۔

۵۔ آپ کے خیال میں موٹی گایوں سے مراد زمیندار اور دبلی گایوں سے مراد کاشتکار ہیں۔

قرآن ان دونوں کی تعداد سات سات بتاتا ہے تو کیا مصر میں کل سات ہی زمیندار تھے اور سات ہی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



کا شکار تھے؟

سو یہ ہیں وہ دلائل جنہیں ان حضرات نے بسعی بسیار اکٹھا کیا ہے۔ ان دلائل میں جو قوت یا وزن ہے وہ آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

## ۲۔ عام اشیائے صرف پر ملکیت کا حق
## انفرادی ملکیت کے عدمِ جواز پر طلوعِ اسلام کے دلائل کا جائزہ

پہلی دلیل:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ ٱلْعَفْوَ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۱۹)

"لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں' آپ فرما دیجیے جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو!"

اس آیت میں لفظ "عفو" کے معنی فالتو (Spare) ضرورت سے زائد یا پس انداز شدہ رقم ہے۔ یہ آیت اپنے مطلب میں صاف ہے کہ انسان کو پس انداز شدہ رقم اپنے پاس نہیں رکھنی چاہیئے بلکہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دینی چاہیئے یا بقول پرویز صاحب نظام ربوبیت میں مفاد عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دینا چاہیئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی کی ذاتی ملکیت ہی نہ ہو تو وہ پس انداز کیا کرے گا اور خرچ کیا کرے گا اور انفاق سے متعلق سوال کیا پوچھے گا؟ گویا جو آیت ذاتی ملکیت کے عدم جواز کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہی آیت ذاتی ملکیت کی ایک واضح دلیل ہے۔

دوسری دلیل: دوسری آیت جو اس سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے۔ اس کا مفہوم (ترجمہ نہیں) بھی ہم پرویز صاحب کی زبانی پیش کریں گے۔

﴿ وَٱللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِى ٱلرِّزْقِ ۚ فَمَا ٱلَّذِينَ فُضِّلُوا۟ بِرَآدِّى رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَـٰنُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ ۚ أَفَبِنِعْمَةِ ٱللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٧١﴾ ﴾ (النحل۱۶/ ۷۱)

"مختلف افراد میں اکتسابی استعداد کا فرق خدا کی طرف سے ہے۔ (تمہارا اپنا پیدا کردہ نہیں) جس کی وجہ سے محنتوں کے ماحصل (فضل) میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اس طرح معاشی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے وہ اس زائد پیداوار (یا سرمایہ) کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جنہیں اس لئے کم استعداد دی گئی ہے کہ وہ ان کی زیر نگرانی کام کریں وہ ایسا اس لئے نہیں کرتے کہ ان کا ذہن اس تصور کو قبول نہیں کرتا کہ اس طرح معاشرہ میں سب برابر ہو جائیں۔ یہ ذہنیت درحقیقت خدا کی طرف سے دی ہوئی نعمتوں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



کے خلاف محاذ پیدا کرنے کے مترادف ہے جس کا نتیجہ تباہی ہے۔"

آپ نے دیکھا قرآن نے اس مسئلہ کو کس خوبی سے حل کر کے رکھ دیا ہے۔ (ق-ن-ر-ص ۱۳۹)

اور وہ مسئلہ کیا ہے جسے قرآن نے حل کر کے رکھ دیا ہے؟ وہ مسئلہ یہ ہے کہ "اس فاضلہ کمائی کو اپنی ملکیت تصور کر لینا اور جن کا یہ حصہ ہے انہیں نہ دینا اس امر کا اعلان ہے کہ ذہنی استعداد خدا کی نعمت نہیں تمہاری اپنی پیدا کردہ ہے۔ (حوالہ ایضاً)

اب دیکھئے کہ اس مسئلہ اور اس مسئلہ کے قرآنی حل سے کسی کو بھی انکار نہیں بلکہ یہ آیت بھی ﴿ قُلِ الْعَفْوَ ﴾ کی ہی تفسیر و تعبیر ہے۔ مسئلہ مختلف فیہ یہ ہے کہ انفرادی ملکیت کا جواز قرآن سے ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟ تو آیت بالا اور اس کے بیان شدہ مفہوم سے یہ باتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) معاشرہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں جن کے پاس فاضل دولت ہوتی ہے۔

(۲) معاشرہ میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نادار ہوتے ہیں اور اپنے گزارے کی حد تک بھی نہیں کما سکتے

یہ دونوں باتیں انفرادی ملکیت ثابت کر رہی ہیں' اب رہی یہ بات کہ امراء کو چاہیئے کہ وہ اپنی فاضل دولت غریبوں کی ضروریات پر صرف کریں تاکہ طبقاتی ناہمواریاں ختم ہو جائیں تو اس حد تک تو یہ سب کچھ درست ہے۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ اس آیت سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ حکومت خود لوگوں سے ان کی محنت کا ماحصل چھین لے' ساری کی ساری ملکیت حکومت کے قبضہ میں آجائے پھر وہ اپنی صوابدید کے مطابق عوام کو ضروریات زندگی مہیا کرے۔ حکومت کو اگر کچھ اختیار ہے تو وہ زکوۃ وصول کرنے کا ہے جو امراء کی دولت کا کسان کی محنت کے ماحصل کا ایک قلیل حصہ ہوتا ہے اور اس کے لئے قرآن کریم نے ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ﴾ (۹-۱۰۳) "ان کے اموال سے آپ ﷺ زکوۃ وصول کیجیے" یعنی خُذْ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ یہ لفظ بجائے خود انفرادی ملکیت کی ایک واضح دلیل ہے۔ اس حکم کے علاوہ قرآن کریم نے لوگوں کو یہ ترغیب دی ہے کہ اپنی ضرورت سے زائد اموال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا کریں تو یہ بات بھی انفرادی ملکیت کے جواز کو ثابت کر رہی ہے۔

**تیسری دلیل:** تیسری آیت یہ ہے:

﴿ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ۭ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاۗءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ (الروم ۳۰/ ۲۸)

"خدا تمہارے لئے تمہارے حسب حال ایک مثال بیان کرتا ہے۔ بھلا تم اپنے غلاموں کو اس مال میں جو ہم نے تم کو دیا ہے' شریک کرتے ہو کہ تم سب برابر ہو جاؤ؟ اس بات سے تم یوں ڈرتے ہو جیسے اپنوں (اپنے ہمسر لوگوں) سے' اسی طرح ہم عقل والوں کے لئے کھول کھول کر آیتیں بیان کرتے ہیں۔"

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس آیت کا واضح مفہوم تو یہی ہے کہ اگر تمہیں اپنی ملکیت میں اپنے غلاموں کو برابر کا شریک بنانا محض اس لئے ناقابل برداشت ہے کہ وہ ملکیت واختیار میں تمہارے برابر ہو کر تمہارے ہمسر اور شریک بن جائیں گے تو بھلا خدا یہ بات کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مملوک و مخلوق میں سے کسی کو اپنے برابر کا شریک بنا لے؟ کچھ عقل وہوش سے کام لو لیکن اس آیت سے بھی اشتراکیت پسندوں نے یہ مفہوم نکال لیا ہے کہ تم کو (یعنی زمینداروں اور کارخانہ داروں کو) اپنے نوکروں اور مزدوروں کو اپنے اموال میں برابر کا شریک بنانا چاہیئے۔ یہ ایسا مفہوم ہے جس کا آیت بالا کا نہ ابتدائی حصہ تائید کرتا ہے اور نہ آخری۔

مثل مشہور ہے کہ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ اسی طرح ہمارے اشتراکیت زدہ دوستوں کا حال ہے اور جہاں ارض' رزق اور سواء وغیرہ وغیرہ الفاظ کسی آیت میں دیکھ پاتے ہیں تو انہیں اپنے ذہن کے مطابق توڑنا موڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

اسی طرح بعض دوسری آیات بھی جو ذاتی ملکیت کے عدم جواز کے لئے پیش کی جاتی ہیں وہ فی الحقیقت سرمایہ پرستی کا رد تو ضرور ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک آیت سے بھی ذاتی ملکیت کے عدم جواز پر استدلال نہیں کیا جا سکتا اور یہ تو ظاہر ہے کہ اسلام سرمایہ پرستی کا دشمن ہے۔ مال گن گن کر رکھنا اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا ایسا جرم ہے جس کی سزا جہنم ہے۔ بایں ہمہ کسی آیت سے یہ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ذاتی ملکیت ہی جرم ہے۔

۴۔ **طلوعِ اسلام کا حدیث سے احتجاج:** پرویز صاحب فرماتے ہیں۔

"آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے کسی رسول کی ذاتی ملکیت کا ذکر نہیں کیا۔ خود حضور خاتم النبیین کے متعلق یہ حقیقت سب کو تسلیم ہے کہ روزمرہ کی اشیائے متعلقہ کے سوا نہ حضور ﷺ کی کوئی ذاتی ملکیت تھی نہ فاضلہ دولت بلکہ ایک حدیث کے مطابق۔ (جو قرآن کے مطابق ہے اور اس لئے قابل قبول) حضور ﷺ نے فرمایا "اِنَّا لَا نُورِثُ" "ہمارا کوئی وارث نہیں" "ماترکنا صدقة" ہم جو کچھ چھوڑ رہے ہیں۔ وہ سب مفاد عامہ کے لئے ہے۔ (بخاری ج ۲ ص ۹۹۶)

چنانچہ اسی اصول کے مطابق باغ فدک جو حضور ﷺ کے ذاتی گزارے کے لئے تھا بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوا بلکہ امت کی مشترکہ تحویل میں آگیا۔" (ن۔ر۔ص ۲۴)۔

**باغ فدک کا قصہ اور نتائج:** اب دیکھئے جو حدیث آپ نے عدم جواز ذاتی ملکیت کے لئے پیش فرمائی ہے اس کا ایک ایک فقرہ اور ایک ایک پہلو جواز ملکیت پر شہادت دے رہا ہے مثلاً

۱۔ آپ نے فرمایا ہے کہ قرآن نے کسی رسول کی ذاتی ملکیت کا ذکر نہیں کیا جب کہ قرآن رسول ﷺ کو ذاتی ملکیت کا حق خود عطا کر رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿ وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ "اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں غنیمت میں ملے تو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



﴿خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ﴾ (الأنفال۸/ ٤١) اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لئے ہے۔"

(۲) جس حدیث کو آپ نے قرآن کے مطابق سمجھ کر قابل قبول فرمایا ہے وہ پوری حدیث باختلاف الفاظ اس طرح ہے۔

«نَحْنُ مَعْشَرُ الأَنْبِيَاءِ لاَ نَرِثُ وَلاَ نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ» "ہم انبیاء کا گروہ نہ خود وارث ہوتے ہیں' نہ کوئی ہمارا وارث ہوتا ہے۔ ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے"

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حدیث کا تعلق صرف انبیاء سے ہے عوام سے نہیں دوسری یہ کہ اگر رسول ﷺ کی ذاتی ملکیت کچھ نہیں ہوتی تو صدقہ کس چیز کا؟

۳۔ اگر قرآن میں رسول ﷺ کی ذاتی ملکیت کا ذکر نہیں تو یہ باغ فدک کدھر سے آگیا؟ کیا رسول اللہ کا عمل خدانخواستہ قرآن کے خلاف تھا؟

۴۔ باغ فدک روزمرہ کی مستعملہ اشیاء سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ آپ ﷺ کی ضروریات زندگی کا ایک مستقل ذریعہ تھا اور یہ باغ فدک صرف حق ملکیت نہیں بلکہ حق ملکیت زمین بھی ثابت کر رہا ہے۔

۵۔ اس باغ کا قصہ آپ نے شروع تو کر لیا مگر پورا ذکر نہیں فرمایا۔ آگے یہ قصہ یوں چلتا ہے کہ اس باغ کو بطور ورثہ حاصل کرنے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے وکیل بن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ:

(ا) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں انفرادی ملکیت حتیٰ کہ زمین کے حق ملکیت کو درست سمجھتے تھے۔

(ب) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کا مذکورہ بالا قول پیش کر کے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے پیش کردہ دعویٰ خارج کر دیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کے لئے حضور ﷺ کا یہ قول حجت اور اسلامی قانون کا ماخذ تھا۔

(ج) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوبارہ یہ مقدمہ پیش کر دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ باغ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس شرط پر واپس کر دیا کہ وہ اسے صرف اپنے ذاتی مصرف میں نہ لائیں گے بلکہ اس میں سے خدا کے حکم کے مطابق یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کا حصہ بھی نکالا کریں گے۔ جس طرح حضور اکرم ﷺ کیا کرتے تھے گویا یہ باغ امت کی مشترکہ تحویل سے نکل کر پھر سے انفرادی ملکیت میں آگیا۔

(د) حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی انفرادی ملکیت کے قائل تھے۔

(ہ) اس باغ فدک پر حضور اکرم ﷺ کی اپنی گزران بھی تھی اور اسی کی پیداوار سے آپ ﷺ یتیموں' مسکینوں وغیرہ کو بھی اس قدر دیا کرتے تھے کہ آپ ﷺ کے پاس فاضل دولت نہیں رہتی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



تھی۔ اس طرح کا جود وسخا بھی آپ ﷺ کی انفرادی ملکیت کی واضح دلیل ہے۔

## لین دین کے احکام کی پرویزی تاویلیں

اب اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن کریم میں بے شمار ایسی آیات موجود ہیں جو لین دین سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً احکام میراث' احکام تجارت' احکام قرضہ' احکام صدقہ وخیرات' احکام حق مہر وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب آیات انفرادی ملکیت کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ اب ایسی آیات کی جو توجیہات پرویز صاحب فرماتے ہیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر ہم یہاں کرتے ہیں۔

۱۔ احکامِ میراث: احکام میراث کے متعلق ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

"قرآنی نظام ربوبیت میں چونکہ انفرادی ملکیت اشیائے صرف تک ہی محدود ہوتی ہے لہٰذا ان احکام کا اطلاق صرف انہی اشیاء پر ہوگا یعنی انسان کا لباس' بسترے' فرنیچر وغیرہ اور یہی اشیاء بطور ترکہ آگے منتقل ہو سکتی ہیں اگرچہ اس کی اولاد اس ترکہ کی بھی محتاج نہ ہوگی کیونکہ اس کی تمام ضروریات تو معاشرہ پوری کر رہا ہوگا۔" (قرآنی نظام ربوبیت ۲۲۹)

غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے بے ضرورت احکام میراث کے نازل کرنے کا فائدہ کیا تھا جو صرف لباس فرنیچر اور بستر تک کی تقسیم تک ہی محدود ہیں؟ جیسا کہ آپ کو خود بھی اعتراف ہے کہ "اگرچہ اس کی بھی ضرورت نہیں ہوگی" پھر آپ کو یہ بھی اصرار ہے کہ حضور اکرم ﷺ یہ نظام ربوبیت قائم فرما کر دنیا سے رخصت ہوئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ آپ باغ فدک والا قصہ بھی چھیڑ رہے ہیں جو آپ ﷺ کا ترکہ تھا لیکن تقسیم نہیں ہوا' بلکہ قومی تحویل میں چلا گیا۔

طلوعِ اسلام کے تضادات: یہ تو قرآنی نظام ربوبیت کو برحق ثابت کرنے کا ماحول ہے لہٰذا اس کی یہ تعبیر بتائی گئی ہے۔ آپ اس ماحول سے باہر نکلتے ہیں تو پھر احکامِ میراث کی تعبیر بھی بدل جاتی ہے۔ چنانچہ احکام میراث کے متعلق آپ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

"اسی مسئلہ وراثت کو لیجئے' قرآن نے وصیت کا حکم دے کر انفرادی مصالح کی حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا تھا۔ فقہ اور روایات نے وصیت کو ممنوع قرار دے کر ان تمام مصالح کو ختم کر دیا جس سے عجب عجب قسم کی الجھنیں پیدا ہو گئیں پھر قانونِ وراثت میں تفقہ کی غلطیوں نے قرآن مجید کو کچھ کا کچھ بنا دیا جس سے کروڑوں جائز وارث اپنے آباء واجداد کی جائیدادوں سے محروم ہو گئے۔"

(قرآنی فیصلے۔ ص:۱۲۲)

اقتباس بالا سے صاف طور پر واضح ہے کہ قرآن کریم نے انفرادی مصالح کی حفاظت کا اتنا مکمل سامان کر دیا ہے کہ کروڑوں جائز وارث اپنے آباء واجداد کی جائیدادوں سے محروم نہ ہونے پائیں۔ ذاتی ملکیت کے جواز میں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس سے زیادہ واضح ثبوت اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے جس کی دوسری مقام پر آپ خود نفی کر رہے ہیں؟
اسی طرح ایک صاحب نے وقف کے متعلق استفسار کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

"قرآن میں انتقال اموال کی جتنی شکلیں ہیں ان میں سے کہیں بھی اس قسم کے وقف کا جواز نہیں نکلتا' مثلاً خرید و فروخت' بخشش' وصیت' وراثت' قرض' خیرات وغیرہ میں کوئی شکل ایسی نہیں جس میں منتقل کردہ مال دوسرے کی ملکیت میں نہ چلا جائے اور اس طرح اس پر پہلے مالک کا قبضہ بدستور رہے" (قرآنی فیصلے ۔ ۱۲۳)

اس اقتباس میں بھی بدلائل قرآنیہ ذاتی حق ملکیت کا نہ صرف خود اقرار کر رہے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی یہی بات سمجھا رہے ہیں پھر جب نظامِ ربوبیت کا ذکر چھڑتا ہے تو بمصداق "دروغ گورا حافظہ نباشد" انہی احکام کی نئی تاویلات میں لگ جاتے ہیں۔

۲۔ احکامِ صدقہ وخیرات: قرآن کریم میں صدقات وخیرات کے لئے بہت سے مقامات پر مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے ایسے احکامات کے متعلق آپ کا ارشاد ہے:

"ملا یہ چاہتا ہے کہ معاشرہ میں ضرور ایک غریب' تنگدست اور محتاج طبقہ موجود رہنا چاہیئے تاکہ وہ صدقات وخیرات کے احکام پر عمل کر سکے۔ یہ تصور سرمایہ دارانہ اور یہودی ذہنیت کی پیداوار ہے۔ یہودی لوگ کیا کرتے تھے کہ پہلے ان ہی لوگوں کو قید کروا دیتے تھے پھر ان کا فدیہ ادا کر کے ان کو چھڑا لیتے تھے۔ اس طرح فدیہ ادا کرنا ان کا صدقہ وخیرات بھی ہوتا تھا اور ان لوگوں پر زندگی بھر کا احسان بھی۔" (قرآنی فیصلے ۔ ص:۴۸)

ملا کون؟: اس اقتباس میں جہاں تک ملا پر تضحیک وتمسخر کا تعلق تھا اس کا حق تو آپ نے پورا پورا ادا کر دیا مگر سوال یہ ہے کہ ملا ہے کون اور اس کی تعریف کیا ہے؟ اس سوال کا جواب تو علامہ اقبال نے درج ذیل اشعار میں دے دیا ہے' آپ کہتے ہیں ؎

زمن بر صوفی و ملا سلامے — کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

اب اگر اس میزان پر کسی ملا اور مسٹر پرویز صاحب کو تولا جائے تو شائد آپ سو ملاؤں سے بھی بھاری نکلیں جس کا جیتا جاگتا ثبوت آپ کی تصنیف "قرآنی نظام ربوبیت" ہے۔

ملا کا قصور: اور دوسرا سوال یہ ہے کہ آخر ملا بے چارے کا قصور کیا ہے کہ اس پر اس قدر عتاب فرمایا جا رہا ہے۔ اس کا جواب واضح ہے کہ ملا جس طرح سرمایہ پرستی کا دشمن ہے اسی طرح اشتراکیت یا بالفاظ دیگر آپ کے نظامِ ربوبیت کا بھی دشمن ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اگر معاشرہ کے مفادات کو افراد کے مفاد کے سامنے ہیچ سمجھا جاتا ہے تو اشتراکیت میں افراد کے مفادات کو معاشرہ کی خاطر کچل کے رکھ دیا جاتا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اگر سرمایہ دارانہ نظام ایک انتہا ہے تو اشتراکیت دوسری انتہا ہے اور یہ تو واضح ہے کہ جب کوئی چیز اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اس سے خیر کا پہلو اٹھ جاتا ہے۔ اسلام نے ان دونوں نظاموں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔

اب پرویز صاحب چونکہ نظام ربوبیت یا (اشتراکیت) کے داعی ہیں لہٰذا ملا کو طعن و تشنیع کا نشانہ نہ بنائیں تو کیا کریں؟ آپ کے خیال میں گویہ صدقہ وخیرات کے احکام بھی اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں بلکہ ملا نے ان کو قرآن میں درج کر دیا ہے اور اگر یہودی لوگوں کو قید میں ڈال کر پھر فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے تھے تو یہ بھی ملا ہی کا قصور ہے؟ آپ کی اس قدر برہمی کے بعد بھی معاملہ تو وہیں کا وہیں رہا کیونکہ آپ کی دونوں بیان کردہ صورتوں میں انفرادی حق ملکیت [1] ثابت ہی رہتا ہے۔

## لین دین کے احکام کا عبوری دور؟

قرآن میں اور بھی کئی طرح کے لین دین سے متعلق احکام موجود ہیں۔ جیسے تجارت' قرضہ' وصیت وغیرہ۔ ان سب احکام بشمول میراث اور صدقہ کی توجیہ آپ یوں پیش فرماتے ہیں۔

"اب رہا یہ سوال کہ اگر اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں تو پھر قرآن میں وراثت کے احکام کس لئے دیے گئے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسانی معاشرہ کو اپنے متعین کردہ پروگرام کی آخری منزل تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچاتا ہے۔ اس لئے وہ جہاں اس پروگرام کی آخری منزل کے متعلق اصول اور احکام متعین کرتا ہے۔ عبوری دور کے لئے ساتھ کے ساتھ راہنمائی دیتا چلا جاتا ہے۔ وراثت' قرضہ' لین دین' صدقات وخیرات وغیرہ کے متعلق احکام اسی دور سے متعلق ہیں۔ جس میں سے گزر کر معاشرہ انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔ جس طرح کوئی ایک معاشرہ جو قرآنی پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے' بتدریج آخری نقطہ تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح تمام نوع انسانی بھی رفتہ رفتہ اس انتہائی نقطہ کی طرف جا رہی ہے جس کی نشاندہی قرآن نے کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ کے تقاضے اب کچھ ایسے شدید ہو چکے ہیں کہ ان کا حل ان قوانین کے بغیر ممکن نہیں جو قرآن نے انتہائی منزل کے لئے تجویز کئے تھے اور جس کا نمونہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات میں دکھا دیا تھا۔ تمام نوع انسانی کی فلاح وبہبود کے لئے مسلسل محنت اور کاوش لیکن فاضلہ دولت اور ذاتی ملکیت کی نفی۔ یہی ہے وہ نظام ربوبیت جسے قرآن انسانی معاشرہ کی آخری شکل قرار دیتا ہے۔"

(قرآنی نظامِ ربوبیت' ص: ۲۵)

---

[1] قرآن سے انفرادی حق ملکیت صرف ثابت ہی نہیں بلکہ قرآن اس کے تحفظ کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ چوری کی حد مقرر کرنا اس کا واضح ثبوت ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ قرآن کے بے شمار اور واضح احکام' جو لین دین سے متعلق ہیں تو وہ سب عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں مگر جس بات کی قرآن نے صرف نشاندہی کی ہے وہ ہی دراصل قرآنی نظام ربوبیت کا پروگرام ہے۔ اب اسے خدا کی حکمت ہی سمجھئے کہ جو چیز انسانی معاشرہ کی انتہائی منزل تھی اس کی تو فقط نشاندہی کی اور جو احکام عبوری دور سے متعلق تھے انہیں بڑی وضاحت سے بیان کر دیا۔

۲۔ اس نشاندہی والے قرآنی پروگرام (نظام ربوبیت) کی آج اس لئے ضرورت پیش آئی ہے کہ اب انسانی معاشرے کے تقاضے شدید ہو چکے ہیں۔ دور نبوی ﷺ میں چونکہ یہ تقاضے شدید نہیں تھے لہٰذا اس کی ضرورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ اس قرآنی پروگرام کا نمونہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات میں (اپنی امت میں نہیں! مولف) دکھلا دیا تھا۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے مسلسل محنت اور کاوش لیکن فاضلہ دولت اور ذاتی ملکیت کی نفی اور یہ نفی تو آپ باغ فدک کے سلسلہ میں دیکھ ہی چکے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ کی وفات کے وقت ایک سفید خچر بھی آپ ﷺ کی ذاتی ملکیت تھا اور ایک زرہ بھی جو کسی یہودی کے پاس کچھ قرصہ کے عوض' رہن رکھی ہوئی تھی۔ یہ سب باتیں ذاتی ملکیت کا جواز ثابت کر رہی ہیں اور ہیں بھی وفات کے وقت کی پھر یہ نظام ربوبیت کب رائج ہوا تھا جسے قرآن نے انسانی معاشرہ کی آخری شکل قرار دیا ہے؟

عبوری دور کے احکام کی مزید تشریح: ایک دوسرے مقام پر آپ ان احکامات لین دین یا عبوری دور کے احکام کی توجیہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"صدقہ وخیرات' بیع و شریٰ' لین دین' ترکہ و میراث وغیرہ کے تمام احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں جوں جوں حالات بدلتے جاتے ہیں۔ عبوری دور کے یہ احکام پیچھے رہتے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احکام حالات سے مشروط ہوتے ہیں۔ مثلاً:

① قرآن میں زنا کی سزا مقرر ہے اگر کوئی شخص زنا کا مرتکب ہی نہ ہو تو یہ حکم تو موجود رہے گا لیکن نافذ العمل نہیں ہوگا۔

② قرآن نے قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا غلام آزاد کرنا مقرر کیا ہے پھر جب غلامی کا وجود ہی ختم ہو جائے تو کفارہ میں "غلام کو آزاد کرنا" نافذ العمل نہیں رہے گا۔ اسی طرح اگر کوئی معاشرہ ایسا مرفہ الحال ہو جائے کہ اس میں مسکینوں کا وجود ہی نہ رہے تو یہ حکم بھی ساقط العمل ہو جائے گا۔ اس وقت اسلامی نظام فیصلہ کرے گا کہ اس کے بدلے میں کفارہ کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔

③ خود ہماری تاریخ میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ زکوۃ کا روپیہ جھولیوں میں لئے پھرتے تھے اور کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں صدقہ وخیرات کے تمام

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



احکام ساقط العمل ہو جائیں گے۔

④ اگر کوئی حکومت ایسا انتظام کردے کہ ہر ضرورت مند کو حکومت کی طرف سے قرضہ مل جائے تو پرائیویٹ لین دین کے معاملات ختم ہو جائیں گے اور ان سے متعلقہ احکام بھی جاری نہ رہیں گے۔

⑤ اسی طرح اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو اسپر وراثت سے متعلق احکام نافذ ہی نہ ہوں گے۔

ان مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا کہ احکام ہمیشہ حالات سے مشروط ہوتے ہیں۔ اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں جن میں ضرورت باقی نہ رہے تو یہ احکام نافذ العمل نہیں رہیں گے۔ یاد رکھیے اس وقت بھی یہ احکام منسوخ (Abrogate) نہیں ہوں گے صرف ساقط العمل ہو جائیں گے۔ اگر کسی وقت پھر وہی حالات پیدا ہو جائیں تو پھر وہی حکم نافذ العمل ہو جائے گا۔ جس طرح ⑥ پانی نہ ملنے کی صورت میں وضو کا حکم ساقط العمل اور تیمم کا حکم نافذ العمل ہو جاتا ہے اور جب پانی مل جائے تو وضو کا حکم نافذ ہو جاتا ہے اور اگر ایسا انتظام ہو جائے کہ ملک میں ہر جگہ پانی دستیاب ہو تو پھر تیمم سے متعلق حکم بالکل معطل ہو جائے گا۔"

(قرآنی نظامِ ربوبیت ص ۲۲۸، ۲۲۹)۔

## پرویزی حیلے

اس طویل اقتباس میں آپ عبوری دور کے احکام کا فلسفہ پیش کرتے ہوئے ایک تو لین دین کے معاملات کی حدود سے دور چلے گئے ہیں۔ بھلا لین دین کے معاملات سے زنا اور وضو تیمم کے مسائل کا کیا تعلق؟ دوسرے آپ نے عبوری دور کے احکام اور حالات کی شرط کے مفہوم کو گڈ مڈ کر کے خلط مبحث کر دیا ہے۔ تیسرے قاری کے ذہن کو ساقط العمل، منسوخ اور معطل وغیرہ کی اصطلاحوں میں الجھا کر مغالطہ دینے کی کوشش فرمائی ہے لہٰذا توضیح کی خاطر ہم نے آپ کی بیان کردہ مثالوں پر نمبر خود لگا دیے ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی رہے۔

۱۔ زنا اور عبوری دور: زنا کے متعلق قرآن میں دو مختلف مقامات پر مختلف سزاؤں کا ذکر ہوا ہے۔ پہلا حکم سورہ نساء میں ہے جو ۶ھ میں نازل ہوئی اس میں درج ذیل سزا کا ذکر ہے۔

﴿ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً ﴾ "مسلمانو! تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ① ارتکاب کر بیٹھیں ان پر اپنے لوگوں میں سے چار

---

① "طاہرہ کے نام خطوط" میں پرویز صاحب نے یہ سزا "جرم فحش" کی بیان فرمائی ہے۔ یہ جرم فحش کیا بلا ہے جس کے لئے چار شہادتیں درکار ہیں؟ اس کی وضاحت موصوف نے بیان نہیں فرمائی۔ نہ ہی یہ بتایا ہے کہ اس جرم فحش اور زنا میں مابہ الامتیاز فرق کیا ہے؟ یہ دھندا آپ کو اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ آپ ناسخ منسوخ کے قائل نہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



مِنكُمْ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ﴿١٥﴾ (النساء٤/ ١٥)

مخصوں کی شہادت لو' اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کا کام کر دے یا خدا ان کے لئے کوئی اور سبیل پیدا کر دے"

اس آیت سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے کہ ایک یہ کہ زانیہ عورت کی سزا "حبسِ دوام" ہے اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سزا کو بدل کر کوئی نئی سزا تجویز کرنے والے ہیں۔

چنانچہ ایک سال بعد یعنی غزوہ بنی مصطلق کے بعد سورہ نور میں دوسرا حکم یہ نازل ہوا:

﴿ الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾ (النور٢٤/ ٢)

"زانی مرد اور زانی عورت ان میں سے ہر ایک کو سو درے مارو۔"

اب دیکھئے کہ ان دونوں آیات یا احکام کے نزول کا درمیانی وقفہ عبوری دور ہے۔ اس عبوری دور میں سزا ایک ہی تھی۔ اس دور میں کوئی دوسری متبادل سزا یا راہ موجود نہیں تھی۔ کہ اگر حالات ایسے پیدا ہوں تو یہ کر لیا جائے ورنہ وہ کر لیا جائے والی کوئی بات نہیں تھی پھر جب دوسری سزا کا حکم نازل ہو گیا تو عبوری دور ختم ہو گیا اور نیا حکم آئندہ کے لئے مستقل طور پر نافذ ہو گیا۔ اب سزائے "حبس دوام" ہمیشہ کے لئے ختم یا معطل یا منسوخ ہو گئی۔ اس عبوری دور کے بعد اب سزا صرف سو درے ہی نافذ العمل ہوگی۔ گویا پہلا حکم یا آیت منسوخ اور دوسرا حکم یا آیت اس کا ناسخ ہے اور ان دونوں احکام یا آیات کا وقفہ یا درمیانی مدت کا نام عبوری دور ہے۔

۲۔ عبوری دور اور حالات کی شرط: مندرجہ بالا اقتباس میں دوسرا الجھاؤ آپ نے وضو اور تیمم کی مثال دے کر پیدا کر دیا ہے۔ اس مثال کا تو نہ عبوری دور سے کوئی واسطہ ہے نہ لین دین کے معاملات سے' یہ دونوں حکم ایک ہی دور ایک ہی زمانہ اور ایک ہی وقت میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں وہ حالات سے مشروط نہیں بلکہ شرط سے مشروط ہیں کہ اگر پانی مل جائے تو وضو کر لو اور اگر کہیں پانی نہ ملے تو تیمم کر لو پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر کسی شخص کو پانی نہیں ملا اور اس نے تیمم کر کے نماز ادا کر لی۔ اب کچھ وقت بعد اسے پانی مل گیا تو وہ اپنی نماز کو دہرائے۔

عبوری دور اور ناسخ و منسوخ: زنا کی سزا کا آپ نے حوالہ ضرور دیا ہے لیکن بیان نہیں فرمائی وہ اس لئے کہ قرآن میں زنا کی دو سزائیں مذکور ہیں؟ ایک ناسخ ہے دوسری منسوخ لیکن آپ ناسخ و منسوخ کے قائل نہیں' فلہذا آپ عبوری دور کی اصطلاح استعمال فرماتے ہیں حالانکہ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

"اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ قرآن کی بعض آیتیں دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں تو اس سے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



قرآن بھیجنے والے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے؟ لیکن ملا بے چارے کو اس سے کیا واسطہ کہ خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور رسول اللہ کے متعلق کیا خیال قائم ہوتا ہے۔ (قرآنی فیصلے ص ۳۴۰)

ناسخ و منسوخ کی بحث چونکہ تفصیل طلب ہے اس لئے ہم آگے چل کر الگ عنوان کے تحت بیان کر رہے ہیں۔

۳۔ احتمالات کی دنیا: تیسرا الجھاؤ آپ نے یہ پیدا کر دیا ہے کہ ٹھوس حقائق کی دنیا سے نکل کر احتمالات کی خیالی دنیا میں چلے گئے ہیں۔ مثلاً آپ زنا کی سزا کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگر "ایسا وقت آ جائے کہ کوئی شخص زنا کا مرتکب ہی نہ ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اس وقت زنا کی سزا کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ حکم موجود تو رہے گا لیکن نافذ العمل نہیں رہے گا۔" (قرآنی نظام ربوبیت۔ ص ۲۲۸)

سوال یہ ہے کہ کیا ایسا دور آ بھی سکتا ہے جس میں کوئی شخص زنا کا مرتکب ہی نہ ہو' بنی نوع انسان کی تاریخ میں دور نبوی ﷺ ہی وہ سنہری دور ہے جو اخلاقی اعتبار سے اپنی انتہائی بلندیوں پر تھا پھر جب اس دور میں بھی زنا کے واقعات پائے جاتے ہیں تو پھر اور کون سا ایسا دور ممکن ہے جس میں کوئی شخص زنا کا مرتکب ہی نہ ہو اور زنا کی سزا ساقط العمل ہو جائے؟

اگر اس احتمالات کی دنیا کو ذرا اور بھی وسعت دی جائے تو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ "اگر ایسا وقت آ جائے کہ کوئی شخص چوری' ڈاکہ' زنا اور قذف وغیرہ کا مرتکب ہی نہ ہو تو تمام قرآنی حدود ساقط العمل ہو جائیں گی" پھر یہ احتمالات کا دائرہ مزید وسیع بھی ہو سکتا ہے کہ "اگر ایسا معاشرہ وجود میں آ جائے جس میں سارے لوگ ہدایت یافتہ ہوں تو پھر سارے قرآنی احکام کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔

۴۔ نفاذ اور نافذ العمل کا فرق: چوتھا الجھاؤ کسی قانون یا حکم کے نافذ اور نافذ العمل کے فرق سے پیدا کیا گیا ہے اگر کوئی شخص زنا کا مرتکب نہیں ہوتا تو واقعی اس پر سزا کا قانون نافذ العمل نہیں ہوگا۔ لیکن یہ قانون بہرحال نافذ ضرور رہے گا۔ ساقط نہیں ہوگا۔ قانون کا نافذ العمل ہونا گناہ کے ارتکاب سے مشروط ہے لیکن ان کا نفاذ ہرگز مشروط نہیں۔ یہ ساقط صرف اسی صورت میں ہوگا جب اس کے عوض کوئی دوسرا قانون آ جائے گا جسے عام اصطلاح میں منسوخ کہا جاتا ہے۔ قانون کے نافذ العمل یا ساقط العمل ہونے میں عبوری دور کا بھی کوئی تعلق نہیں' کیونکہ عبوری دور ناسخ و منسوخ کی درمیانی مدت کا نام ہے حالات کا نام نہیں۔ بعض احکام حالات سے مشروط تو ہوتے ہیں مگر ساقط ہرگز نہیں ہوتے۔

۵۔ ترکہ اور عبوری دور: پانچواں الجھاؤ یہ پیدا کیا گیا ہے کہ ایک شخص کی انفرادی حالت کا ذکر کر کے قانون کے ساقط العمل ہونے کا تاثر دیا گیا ہے جیسا کہ مثال نمبر ۵ سے واضح ہے' فرماتے ہیں کہ:

"اسی طرح اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو اس پر وراثت کے احکام نافذ ہی نہ ہوں گے۔"

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس حد تک تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن اس دور میں بہت سے ایسے اشخاص بھی ہوں گے جو ترکہ چھوڑ کر مریں گے اور ان پر یہ احکام نافذ العمل ہوں گے۔ ایک شخص یا کئی اشخاص کے ترکہ چھوڑے بغیر مرنے کے باوجود بھی یہ قانون نافذ ہی سمجھا جائے گا اور اس کا عبوری دور سے کچھ تعلق نہیں۔

**مساکین کا وجود :** اب دوسری مثال کی طرف آیئے کہ قسم کا کفارہ تین روزے رکھنا یا غلام آزاد کرنا ہے' یا دس مسکینوں کو کھانا کھلانا۔ غلامی کا تو اسلام نے مختلف طریقوں سے تدارک کیا اور وہ ختم ہو گئی۔ رہا مسکینوں کو کھانا کھلانے کا مسئلہ تو اس سلسلہ میں آپ پھر خیالی دنیا میں جا بسے ہیں' فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی معاشرہ ایسا مرفہ الحال ہو جائے کہ اس میں مسکینوں کا وجود ہی نہ رہے تو یہ حکم بھی ساقط العمل ہو جائے گا" سوال یہ ہے کہ کیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟ آج کے دور میں امریکہ' برطانیہ' فرانس' عرب ممالک' جاپان وغیرہ مرفہ الحالی کی بلند چوٹیوں پر ہیں۔ ان میں سے آپ کسی ایسے ملک کا نام بتا سکتے ہیں جس میں مسکینوں کا وجود نہ ہو؟

مسکینی کو ختم کرنے کی بس ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے اشتراکیت یا سوشلزم لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ مسکینی ختم نہیں کی جاتی بلکہ مسکینی کا نام ختم کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں حکومت افراد سے ان کی محنت کا ماحصل چھین کر سب کو ایک جیسا مسکین بنا دیتی ہے تاکہ کوئی شخص دوسرے کو مسکین کہہ ہی نہ سکے۔ مسکین کی تعریف یہ ہے کہ اس کے پاس ذاتی ملکیت کی کوئی چیز نہ ہو۔ اس نظام میں حکومتی پارٹی تمام رعایا کی انفرادی ملکیتیں چھین کر خود ہی سب سے بڑی سرمایہ دار اور جاگیردار بن جاتی ہے۔ رعایا ساری کی ساری مسکین ہوتی ہے کیونکہ حکومت پوری رعایا کے ماحصل اور محنت کا قانون کے بل بوتے پر استحصال کرتی ہے لہٰذا یہ طرز حکومت جور و استبداد کی ایسی بدترین شکل اختیار کر جاتی ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

دوسرا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا معاشرہ سے امیر و غریب کا امتیاز اٹھ جانا یا مسکین کا وجود ختم ہونا منشائے ایزدی کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ قرآن سے ہمیں اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ۗ ﴾ (الزخرف ۴۳/ ۳۲)

"کیا یہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت کو بانٹتے ہیں؟ ہم نے ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے' تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے۔"

اسلام امراء واغنیاء کو یہ حکم ضرور دیتا ہے کہ وہ غریبوں اور مسکینوں کو ان کا حق دیں تاکہ طبقاتی تفاوت کم ہو جائے لیکن وہ اس تفاوت کو یکسر ختم نہیں کرنا چاہتا تاکہ لوگ ضرورت کے مطابق ایک دوسرے کے کام آئیں اور دنیا کا کاروبار چلتا رہے۔ امراء کے امیر ہونے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ ایسی تقسیم ہم نے ہی کی ہوئی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

**قسم کا کفارہ اور روزے:** آپ مثال نمبر۲ کے تحت لکھتے ہیں کہ "اگر غلامی ہو جائے اور معاشرہ میں مسکینوں کا وجود ہی نہ رہے تو اس وقت اسلامی نظام فیصلہ کرے گا کہ اس کے بدلے میں کفارہ کیا ہونا چاہیئے"

اب دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم توڑنے کے کفارہ کی ایک تیسری صورت تین روزے رکھنا بھی بتائی ہے۔ (۵-۸۹) جو کسی بھی "نظام" میں رکھے جا سکتے ہیں کیونکہ یہ خالصتاً انفرادی فعل ہے۔ غالباً پرویز صاحب کو یہ روزے والا کفارہ پسند نہیں آیا اور اب مزید فیصلہ ایسے اسلامی نظام یا مرکز ملت کے سپرد فرما رہے ہیں جسے محض ایک واہمہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

**زکوٰۃ وصدقات کے احکام کا تعطل:** مثال نمبر۳ میں آپ حدیث کے بجائے تاریخ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ "حضرت عثمان کے زمانہ میں لوگ زکوٰۃ کا روپیہ جھولیوں میں لئے پھرتے تھے اور کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ سے صدقہ وخیرات کے تمام احکام ساقط العمل ہو جائیں گے"

یہ مثال تو پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحابی ذاتی ملکیت رکھتے تھے پھر آپ کا نظام ربوبیت جو آپ کے خیال کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بپا کر کے دکھا دیا تھا وہ چودہ پندرہ سال تک بھی اپنا وجود قائم نہ رکھ سکا تھا"

زکوٰۃ لینے والا نہ ملنے سے صدقات وخیرات کے تمام احکام کیسے ساقط العمل ہو سکتے ہیں؟ کیا زکوٰۃ محض صدقہ وخیرات کی ایک قسم ہے؟ صدقہ تو معاشی لحاظ سے اپنے ہمسر بلکہ اپنے سے بڑے کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ جب کہ زکوٰۃ میں یہ شرط ضرور پائی جاتی ہے۔ کہ جو لوگ اہل نصاب یا زکوٰۃ دینے والے ہیں وہ لے نہیں سکتے پھر ایسے دور میں زکوٰۃ کے احکام بھی ساقط العمل نہیں ہو سکتے کیونکہ مسکینوں کو زکوٰۃ دینا صرف ایک مصرف ہے جب کہ قرآن نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بتائے ہیں۔ یہ زکوٰۃ کی رقم مسافروں' جہاد دینی مدارس اور تبلیغ واشاعت اسلام اور تالیفِ قلوب پر بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ یہی صورت دوسرے صدقات وخیرات کی بھی ہے تو کسی وقت کوئی زکوٰۃ لینے والا مسکین نہ بھی ملے تو اس سے صدقات وخیرات کے جملہ احکام کیسے ساقط العمل قرار پاتے ہیں؟ نیز یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ اس مثال میں عبوری دور کونسا آیا ہے؟ اور یہ بھی کہ کیا دور عثمانی کے مسلمان زکوٰۃ ادا کرتے بھی تھے یا نہیں؟

**لین دین کے احکام:** مثال نمبر۴ میں آپ فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی حکومت ایسا انتظام کر دے کہ ہر ضرورت مند کو قرضہ مل جائے تو پرائیویٹ لین دین کے معاملات ختم ہو جائیں گے اور ان سے متعلقہ احکام بھی جاری نہ ہوں گے۔

اس مثال میں قرض دہندہ حکومت ہے اور مقروض حاجت مند ہے اور قرضہ اس رقم کو کہتے ہیں جس

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



کی واپسی لازمی ہو تو کیا صرف قرض دہندہ کی نوعیت کی تبدیلی سے قرضہ کے احکام ساقط العمل ہو سکتے ہیں۔ قرض دہندہ اگر کسی مہاجن کے بجائے خود حکومت ہو تو اس سے معاملہ کی نوعیت میں کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ حکومت کے ایسے نظام سے تو قرضہ کے احکام بھی متاثر نہیں ہوں گے چہ جائیکہ لین دین کے تمام معاملات ختم ہو جائیں اور ان سے متعلقہ احکام بھی نافذ نہ رہیں۔ قرضہ تو لین دین کی صرف ایک قسم ہے جب کہ لین دین میں بیع و شریٰ' مزارعت' مساقات' آجر اور اجیر' ہبہ ووقف' سکنیٰ وعمریٰ' میراث ووصیت وغیرہ سب کچھ شامل ہے وہ کیونکر ساقط العمل ہوں گے؟

## ذاتی ملکیت اور ارکانِ اسلام

اسلام کے پانچ ارکان میں سے دو ارکان ایسے ہیں جنہیں صرف اس صورت میں بجالایا جا سکتا ہے جب مسلمانوں کے پاس ذاتی ملکیت موجود ہو' ان میں ایک زکوۃ ہے اور دوسرا فریضہ حج۔

**انفرادی ملکیت اور زکوۃ:** زکوۃ کی ادائیگی کا حکم قرآن میں تقریباً ستر بار آیا ہے جسے آپ عبوری دور کے فلسفہ اور حالات کی شرط کی آڑ میں ساقط العمل قرار دینا چاہتے ہیں حالانکہ زکوۃ کے احکام کا نہ تو عبوری دور سے کوئی تعلق ہے اور نہ حالات کی شرط سے۔ عبوری دور سے تو اس لئے کہ عبوری دور کے تعین کے لئے بعد میں کسی ایسے واضح حکم کا نزول ضروری ہے جو آئندہ ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہے اور قرآن میں کوئی ایسا حکم نہیں ملتا اور حالات سے اس لئے کوئی تعلق نہیں کہ اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ کسی دور میں مسکینوں کا وجود معاشرہ سے ختم ہو سکتا ہے پھر بھی زکوۃ کے مصارف اتنے زیادہ ہیں کہ ان سب کا فقدان صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ کسی دور میں اسلام اور اسلامی معاشرہ کا نام ونشان ہی باقی نہ رہے جیسا کہ اشتراکیت میں ذاتی ملکیت کے فقدان اور سرے سے خدا ہی کے انکار پر مبنی معاشرہ قائم ہوتا ہے۔

**ذاتی ملکیت اور حج:** حج اسلام کا ایسا رکن ہے جس میں لین دین کا بھی کوئی تعلق نہیں اور ذاتی ملکیت کا بھی پورا تصور موجود ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ (آل عمران ۳/ ۹۷)

"اور لوگوں پر اللہ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے۔"

اب فرمایئے کہ قرآنی نظام ربوبیت میں مسکینی ختم ہونے سے صدقات وخیرات کے احکام تو ساقط العمل ہو جائیں گے لیکن حج کا اس سے یکسر مختلف معاملہ ہے پھر جب لوگوں کے پاس ذاتی ملکیت ہی نہ ہوگی تو اس فریضہ کی ادائیگی کیسے ممکن ہے؟ جس کے متعلق پرویز صاحب خود ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"حج ۹ھ میں فرض ہوا۔ حضور ﷺ اس سال خود تشریف نہیں لے گئے لیکن اپنی طرف سے کچھ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



جانور امیر کارواں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دیئے تاکہ وہاں مصرف میں لائے جائیں۔ اگلے سال خود حضور ﷺ حج کے لئے تشریف لے گئے اور وہیں جانور ذبح کئے۔" (قرآنی فیصلے ص ۶۵)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے سن ۱۰ھ میں حج کیا اور یہ آپ ﷺ کی زندگی کا آخری دور ہے جس کے صرف ۳ ماہ بعد اوائل ربیع الاول سن ۱۱ھ میں آپ ﷺ کی وفات ہو گئی تھی۔ گویا آپ ﷺ کے اس انتہائی آخر دور میں بھی۔

(۱) ذاتی ملکیت کا تصور موجود تھا کیونکہ آپ ﷺ نے اپنی طرف سے قربانی کے جانور امیر کارواں کے ساتھ کر دیے تھے کہ مکہ جا کر وہاں ذبح کئے جائیں۔

(۲) آپ کے وضع کردہ نظام ربوبیت کا کوئی وجود نہ تھا جو ذاتی ملکیت کی نفی کرتا ہے' جس کے متعلق آپ لکھتے ہیں کہ:

"یہی وہ نظام ربوبیت ہے جسے قرآن معاشرہ کی آخری شکل قرار دیتا ہے۔" (ق۔ ن۔ ر۔ ص ۲۵)۔

آپ ایک طرف تو قرآن کے نزول کا مقصد ذاتی ملکیت کی نفی اور نظام ربوبیت کا قیام ثابت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ وضاحت فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی آخری زندگی تک اس مشن میں ناکام رہے۔ اب آپ خود ہی غور فرما لیجئے کہ آپ کے ان متضاد بیانات سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے اور خود آپ کے متعلق کیا؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



باب: ہفتم

# نظامِ ربوبیت کا فلسفہ اور تشریف آوری

پرویز صاحب کے کارہائے نمایاں میں سے ایک کام قرآنی نظام ربوبیت کی ایجاد بھی ہے جیسا کہ وہ خود ہی فرماتے ہیں کہ۔

**نظامِ ربوبیت کی ایجاد کی ضرورت:** "زمانہ من حیث الکل آگے بڑھتا چلا آرہا ہے کہ ہر دور میں نئے نئے تقاضے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جس دور میں جو تقاضا نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اس دور کے انسان لامحالہ اس پر زیادہ غور و فکر کرتے ہیں۔ رزق کے سرچشموں کی تقسیم کا تقاضا جس شدت سے ہمارے دور میں ابھر کر سامنے آیا ہے گزشتہ تیرہ سو سال میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ ہمارے ہاں ہوتا کیا چلا آرہا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس تقاضے کا حل قرآن کیا پیش کرتا ہے" (ن-ر-مقدمہ ص ۲۳)

اب تو یہ واضح ہے کہ اس دور میں اشتراکیت ہی زمانے کا وہ شدید تقاضا ہے جو روس میں نیا نیا ابھرا ہے۔ روس نے جس دہشت گردی اور خونریزی سے یہ انقلاب بپا کیا۔ وہ سب جانتے ہیں مگر اس خونی انقلاب پر پرویز صاحب کے استاد حافظ اسلم بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ لا الٰہ کا یہی معنی ہے۔ پرویز صاحب نے اسی وجہ سے اشتراکی انقلاب کے مسئلہ شکم پروری کو زمانے میں سب سے شدید تقاضا محسوس کیا اور اس شدت احساس سے قرآن میں غور فرمانے لگے اور اس غور فرمانے کا طریقہ یوں بتایا کہ۔

**قرآن میں غور کرنے کا طریقہ:** "میں قرآن کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے میرا ہمیشہ یہ انداز رہا ہے کہ میں پہلے سے کوئی خیال قائم کر کے قرآن کے اندر نہیں جاتا۔ ایک سوال کو سامنے رکھتا ہوں اور خالی الذہن ہو کر کوشش کرتا ہوں کہ مجھے قرآن سے اس کا کوئی حل مل جائے۔ جو حل مجھے قرآن سے ملتا ہے اسے قبول کرتا ہوں۔ خواہ وہ ساری دنیا کے مسلمات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے حتی کہ خود میرے اپنے معتقدات اور تصورات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے" (ایضاً ص ۲۰)

**اشتراکیت اور ربوبیت:** پھر اس طرح خالی الذہن ہو کر جو آپ نے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



قرآن میں غور فرمایا تو بہت سی ایسی باتیں دریافت کر ڈالیں جو واقعی ساری امتِ مسلمہ کے مسلّمات کے خلاف تھیں۔ مثلاً یہ کہ قرآن کی رو سے نہ زمین کی ملکیت جائز ہے نہ انفرادی ملکیت۔ نیز یہ بھی دریافت فرمایا کہ انسان جو کچھ کمائے وہ سرکار عالیہ کا ہوتا ہے اور سرکار عالیہ ہر ایک کو اس کی بنیادی ضروریات مثلاً روٹی، کپڑا اور مکان دینے کی ذمہ دار ہے چونکہ اشتراکیت بھی اپنی ظاہری شکل میں یہی کچھ ہے لہٰذا وہ اشتراکیت اور ربوبیت کے فلسفہ کا فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اشتراکیت مادی یا میکانکی نظریہ حیات ہے جب کہ ربوبیت قرآنی نظریہ حیات ہے۔ اشتراکیت نہ خدا کی قائل نہ آخرت کی اور نہ مرنے کے بعد کی زندگی کی۔ ان کے ہاں جو کچھ ہے بس یہ دنیا ہی دنیا ہے اور مادی جسم کے تقاضے ہیں۔ جب کہ ربوبیت میں انسان خدا، آخرت اور حیات [1] بعد الممات کا قائل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں نظام ربوبیت صرف مادی جسم کے تقاضے ہی پورے نہیں کرتا بلکہ اس سے انسان کی ذات کی نشوونما اور تکمیل بھی ہوتی ہے۔ اصل مقصد ذات کی تکمیل ہے اور مادی تقاضے پورا کرنا محض حصولِ مقصد کا ذریعہ ہے۔

**ربوبیّت اور تصوّف:** پرویز صاحب ذات کی نشوونما اور تکمیل کو تزکیہ نفس کا ہم معنی قرار دیتے ہیں اور چونکہ صوفیہ کا طبقہ بھی تزکیہ نفس ہی کا مدعی ہے لہٰذا وہ ربوبیت اور تصوف کا فرق یہ بتاتے ہیں کہ تصوف میں ترک دنیا کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جب کہ ربوبیت میں اسی دنیا میں رہ کر جسم کے مادی تقاضوں کو پورا کرنا شرط اولین ہے۔ صوفیہ ذات کی نفی کرتے ہیں اور ان کا منتہائے مقصود اللہ کی ذات میں مل جانا یا واصل باللہ یا واصل بحق ہونا ہے۔ جب کہ ربوبیت میں ذات کی نفی کے بجائے اس کا اثبات اور اسے پختہ تر کیا جاتا ہے اور اس کا منتہائے مقصود خدا تک پہنچنا ہے۔ واصل بحق ہونا نہیں۔ (ان۔ر ص۷۶ ملخصاً)

**فلسفہ ربوبیت:** آپ فرماتے ہیں کہ کائنات کی ہر شے میں کچھ نہ کچھ مضمر صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ ان مضمر صلاحیتوں کا صحیح طور پر نشوونما پا کر اپنے منتہائے مقصود کو پہنچ جانا ربوبیت کہلاتا ہے۔ مثلاً کسی درخت کا ایک بیج ہے۔ اس میں درخت بننے کی صلاحیت مضمر ہے۔ اگر اس بیج کو زمین میں بو دیا جائے اور اسے مناسب آب وہوا ملتی رہے تو پہلے اس میں سے کونپل نکلے گی، جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ربوبیت کا عمل ٹھیک طور پر جاری ہے حتی کہ وہ بیج ایک دن تناور درخت بن جائے گا گویا اس کی ربوبیت کی تکمیل ہو گئی کیونکہ یہی اس بیج کا منتہائے مقصود تھا۔ اگر اس بیج کو زمین میں بونے سے کونپل ہی نہ نکلے۔ خواہ اس کی وجہ بیج کی خرابی ہو یا زمین کی، پانی کی کمی ہو یا بیشی یا دوسری وجہ ہو تو ہم یہ سمجھ لیں گے کہ صرف بیج کی ربوبیت کا عمل ہی نہیں رکا بلکہ اصل بیج بھی ضائع ہو گیا۔ قرآن کی اصطلاح میں اس تخریبی نتیجہ کو باطل کہا جاتا ہے اور اگر اس نشوونما کے نتائج تعمیری ہوں تو یہ حق کہلاتا ہے۔ (ایضاً ص۴۰۳ ملخصاً)

---

[1] پرویز صاحب جس طرح کے خدا آخرت اور حیات بعد الممات کے قائل ہیں اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**انسان کی مضمر صلاحیتیں:** بیج ایک مادی چیز ہے جس کی مضمر صلاحیت درخت بنتا ہے اور اگر کونپل نکل آئے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کی مضمر صلاحیت کی نشوونما ٹھیک طور پر ہو رہی ہے۔ لیکن انسانی ذات یا نفس ایک غیر مرئی شے ہے لہٰذا اس کی مضمر صلاحیتوں اور ان کی نشوونما کے متعلق پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ۔

"قرآن نے کہا ہے کہ نفس انسانی کا تعلق روح خداوندی سے ہے لہٰذا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ انسانی ذات کی کیا خصوصیات ہیں ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ خود خدا کی صفات کیا ہیں؟ قرآن نے اس کے لئے اسماء الحسنٰی کی اصطلاح استعمال کی ہے اور ان اسماء کا شرح وبسط سے ذکر کیا ہے چونکہ انسانی ذات نفخ روح کی وجہ سے روح خداوندی ہی کی مظہر ہے۔ اس لئے اسماء الحسنٰی سے ایک سمٹے ہوئے انداز میں خود انسانی صفات کی مختلف صلاحیتوں کا بھی تعارف ہو جاتا ہے..... یہ صلاحیتیں جو نفس انسانی میں مضمر ہیں۔ ان کی نشوونما اور بالیدگی (ربوبیت) مقصود زندگی ہے لہٰذا اب ہمارے سامنے ایک مستقل معیار آگیا جس سے یہ ہر وقت پہچانا اور ماپا جا سکتا ہے۔ کہ ہماری کون کونسی صلاحیت نشوونما پا رہی ہے اور کونسی ہنوز خوابیدہ ہے۔" (ایضاً۔ ص:۶۷-۶۸)

**مضمر صلاحیتیں اور مستقل اقدار:** "اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب ہماری یہ صلاحیتیں نشوونما پا جائیں تو ہمیں کس طرح معلوم ہو کہ فلاں صلاحیت (قوت) کا صحیح مصرف کیا ہے؟ کیونکہ اصل مقصد قوت کا حصول نہیں بلکہ اس قوت کا مصرف ہے اس سوال کا جواب قرآن نے یہ بتایا ہے کہ ایک ہی قسم کے موقع کے لئے ایک ہی اصول ہوگا۔ مثلاً گواہی صحیح صحیح دینا چاہئے خواہ اپنے ہی متعلق دینی پڑے یا کسی دوسرے کے متعلق یا غیر قوم کے متعلق ایسے اصولوں کو مستقل اقدار کہتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک صفات خداوندی ابدی صداقتیں (Eternal Truths) یعنی مستقل اقدار ہیں۔ جن کا تحفظ بہرحال وبہرکیف ضروری ہے۔ (ایضاً ص ۷۱، ۷۲ ملخصاً)

"ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کی رو سے مستقل اقدار وہ ہیں جنہیں صفات خداوندی یا اسماء الحسنٰی کہا جاتا ہے یہ اسماء متعدد ہیں۔ اس لئے وہ مستقل اقدار بھی جن کی رو سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ متعدد ہیں۔ لیکن ان سب میں ایک قدر ایسی ہے جو اس عمارت (نظام ربوبیت) کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے گرد باقی تمام اقدار گردش کرتی ہیں۔ قرآن کی ابتدا اسی قدر سے ہوئی ہے۔ یہ قدر ہے رب العالمین۔ یعنی تمام کائنات کی ربوبیت قرآن کی سب سے پہلی آیت ہے"..... "انسانی ذات کی ربوبیت کے لئے مستقل اقدار کا تقاضا یہ ہے کہ ہر فرد دوسروں کی ربوبیت کی فکر کرے اور ہمیشہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے جس خدا نے جسمانی پرورش کے لئے وہ قانون (طبعی قانون) بنایا ہے۔ اسی نے انسانی ذات کی پرورش کے لئے یہ قانون بنایا ہے۔" (ایضاً ص ۷۶-۷۷)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**انسانی ذات کی نشوونما کا فائدہ:** "انسانی ذات کی پرورش (نشوونما' ربوبیت) ہو جائے تو اسے حیات جاوداں حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ "اے گروہ جن وانس! اگر تم میں زمین وآسمان کی حد بندیوں سے آگے نکلنا چاہتے ہو تو ایسا بھی ممکن ہے۔ لیکن اس کے لئے قوت کی ضرورت ہے اور یہ قوت نفس انسانی کی ربوبیت سے حاصل ہوتی ہے....." "قرآن کہتا ہے کہ تم انسانیت کی منزل تک ارتقائی صورت میں آگئے تھے اس کے بعد تم ﴿ طبقًا عن طبق ﴾ درجہ بدرجہ منزل بہ منزل اوپر چڑھتے جاؤ گے تاکہ وہ روح خداوندی جو تمہاری ذات میں پھونکی گئی تھی۔ خدا کے قانون ربوبیت کی رو سے پوری نشوونما پاکر مشہود ہو جائے ﴿ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی ﴾ (۵۳-۴۲) یہ ہیں نفس انسانی کے ارتقائی منازل اور یہ ہے اس کا مقصود۔ (ایضاً ص ۷۳)

**نظریہ ربوبیت کا تجزیہ:** اب دیکھئے مندرجہ بالا تین چار اقتباسات میں ہم نے "نظام ربوبیت" کے انسانی ذات کی نشوونما کے تقریباً سب پہلوؤں پر پرویز صاحب کے الفاظ میں ہی روشنی ڈال دی ہے۔ بظاہر یہ فلسفہ خوشنما اور اسلام کے مطابق بھی معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں کئی باتیں غلط ہیں اور کئی محل نظر۔ مثلاً۔

(۱)۔ صفات خداوندی میں سے صرف چند ایک ایسی ہیں۔ جن کو اپنانے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ مثلاً یہی ربوبیت یا خالقیت مگر بہت سی صفات خداوندی ایسی ہیں جو انسانی ذات کی نشوونما کے لئے مہلک ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ جبار ہے۔ متکبر ہے' حاکم مطلق ہے اور قانون دہندہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر انسان ان صفات خداوندی کو اپنانے لگے تو انسانی ذات کی نشوونما تو درکنار وہ تو تباہ وبرباد ہو جائے گی یعنی بیج کی کونپل بھی نہ نکل سکے گی لہٰذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ نفخ خداوندی کی وجہ سے انسانی روح صفات خداوندی کی مظہر بن جاتی ہے اور ان صفات کی نشوونما کا نام تزکیہ نفس ہے۔

(۲)۔ پرویز صاحب نے صفات خداوندی اور ابدی صداقتوں کو ایک دوسرے کا متبادل ومترادف قرار دیا ہے حالانکہ یہ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ صفات خداوندی تو وہ ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا اور ابدی صداقتیں یہ ہیں کہ اپنے عہد کو ہر صورت میں ایفا کرنا چاہیئے۔ شہادت ہر صورت میں ٹھیک ٹھیک دینی چاہیئے۔ تکبر انسان کو لے ڈوبتا ہے۔ اچھے کام کرنا چاہئیں اور برے کاموں سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اپنے بڑے بزرگوں کا ادب واحترام کرنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ علاوہ ازیں کچھ ابدی صداقتیں ایسی بھی ہیں جن کا صفات خداوندی سے چنداں تعلق نہیں تاہم ابدی صداقتیں ضرور ہیں۔ مثلاً دو اور دو چار ہوتے ہیں یا ہر جاندار کو موت ضرور آئے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۳)۔ انسانی ذات اور بالخصوص مسلمان کی ذات کی نشوونما کا انحصار' ابدی صداقتوں پر نہیں بلکہ قرآن کے احکام کی تعمیل پر ہے۔ مثلاً قرآن کا حکم ہے کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو اپنا رازدان نہ بنائے یا یہ کہ مسلمان آپس میں رحم دل اور کافروں کے حق میں سخت تر ہوتے ہیں۔ ایسے احکام ابدی صداقتیں نہیں ہیں۔ تاہم مسلمان کو ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب نے انسانی ذات کی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



نشوونما کے لئے جو اصول بیان فرمائے ہیں۔ قرآنی احکام ان کی تائید نہیں کرتے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کا یہ نظریہ "انسانی ذات کی نشوونما" اور شرعی اصطلاح "تزکیہ نفس" دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

(۴)۔ پرویز صاحب نے صفات خداوندی یا اسماء الحسنٰی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ متعدد ہیں تو ان کو درج کر دینے میں کیا حرج تھا؟ ظاہر ہے کہ اگر وہ یہ متعدد صفات درج کر دیتے تو اس سے آپ کے پیش کردہ فلسفہ پر زد پڑتی تھی لہٰذا اتنی ضخیم کتاب میں بھی ان متعدد صفات کا اندراج مناسب نہ سمجھا گیا اور صرف رب العالمین کا ذکر کیا گیا۔ جس سے آپ کے نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

(۵)۔ اسی طرح مستقل اقدار یا ابدی صداقتوں کے متعلق بھی آپ نے بتایا کہ وہ متعدد ہیں ان متعدد اقدار کو بھی آپ نے درج نہیں فرمایا بلکہ ان میں سے صرف ایک "مستقل قدر" انسانی ذات کی نشوونما "لینے" کے بجائے "دینے" سے ہوتی ہے۔ کا ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ بھی وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ اور یہ سب کچھ ﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ کے مصداق ہے۔

(۶)۔ اور اس نظریہ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ آخر انسانی ذات کے نشوونما پاکر قوت حاصل کرنے اور اوپر چڑھنے کی کیا تک ہے۔ جب کہ پرویز صاحب کے نظریہ کے مطابق خدا اوپر ہے ہی نہیں بلکہ ہر جگہ موجود ہے۔

(۷)۔ پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ انسانی ذات کی نشوونما سے اسے حیات جاوداں حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن "قرآنی فیصلے" ایک مضمون "عذاب قبر" میں یہ ثابت کر رہے ہیں کہ کسی مرنے والے کی موت کے دن سے لے کر یوم النشور تک برزخ زمانی نہیں ہے۔ اگر اس عرصہ میں برزخ زمانی ہے ہی نہیں تو حیات کیسے جاوداں بن گئی؟ اور اگر فی الواقع حیات جاوداں ہے تو قبر کا عذاب وثواب از خود ثابت ہو جاتا ہے۔

**اشتراکیت اور ربوبیت کے جذبہ محرکہ کا فرق:** اشتراکیت اور ربوبیت چونکہ دونوں اپنی ظاہری شکل میں ایک جیسی ہیں۔ دونوں میں انفرادی ملکیت کی نفی ایک جیسی ہے اور دونوں میں یہی اصول کارفرما ہے کہ انسان اپنی سب محنت کی کمائی حکومت کے حوالہ کر دے یا حکومت اس کی محنت اور کمائی پر قابض ہو جائے پھر حکومت ہی بقدر سد رمق افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کو پورا کرے۔ اب پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اشتراکیت کے پاس کوئی ایسا جذبہ محرکہ نہیں کہ وہ کسی انسان کو اس بات پر آمادہ یا مجبور کرے کہ وہ اپنی ساری کمائی تو حکومت کے حوالے کر دے۔ لیکن اس میں سے لے اتنا ہی جو اس کی ضروریات زندگی کو پورا کر سکے۔ لہٰذا یہ اشتراکیت کا نظام فیل ہو جائے گا۔ اب دیکھئے جہاں تک اشتراکیت کے فیل ہونے کا تعلق ہے ہم بھی پرویز صاحب کے ہم خیال ہیں۔ تاہم اس ناکامی کی وجہ قوت محرکہ کی کمزوری نہیں اشتراکیت کا جذبہ محرکہ۔ دنیا بھر کے مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کو زمینیں اور کارخانوں کا مالک بنانا اور معاشی مساوات قائم کرنا اور طبقات کو ختم کرنا ہے۔ اسی جذبہ محرکہ یا نعرہ سازی ونعرہ بازی میں اتنی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



قوت ہے کہ ہر ناواقف اس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ اشتراکیت کی ناکامی کی اصل وجہ قاہرانہ داخلی استبدادی نظام ہے جس سے اس دلفریب نعرہ کے فریب خوردہ لوگوں کو دام میں پھنستے ہی سابقہ پیش آتا ہے گویا اشتراکیت کی ناکامی قوت محرکہ میں کمی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس فریب کی وجہ سے ہے جو اس نعرہ کی آڑ میں دیا جاتا ہے۔

پرویزی جذبہ محرکہ کی قوت: اب اشتراکیت کے مقابلہ میں پرویز صاحب نظام ربوبیت کا جذبہ محرکہ "انسانی ذات کی نشوونما اور تکمیل اور اس کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ جسمانی ضروریات کی تکمیل۔ آپ کا یہ نظریہ بھی قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ قرآن نے تزکیہ نفس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی ہے اور تقویٰ کے معنی ہیں "سزا کے خوف سے برے کاموں سے بچنا اور اچھے کاموں کو اختیار کرنا" اور ان معنوں کی تائید ایک مقام پر پرویز صاحب نے خود بھی کی ہے (ن۔ ر۔ ص:۴۰) اب پرویز صاحب نے انتقام کا خوف یوں ختم کیا کہ جہنم کو اسی مادی دنیا میں لے آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جہاں انسانی ذات کی نشوونما رک گئی وہی اس کے لئے جہنم (جحیم) ہے (ن۔ ر۔ ص:۶۷) اسی طرح وہ جنت کو بھی اسی دنیا میں لے آتے ہیں۔ یعنی جو لوگ نظام ربوبیت قائم کرتے ہیں وہ سب جنتی ہیں (ن۔ ر۔ ص:۲۹۸) پھر جہنم کے ہر قسم کے عذاب اور جنت کی مادی نعمتوں کو انہی دو قسم کے لوگوں پر پوری چابکدستی سے فٹ کر دیتے ہیں۔ رہا حیات بعد الممات کے بعد جنت اور جہنم کا سوال تو اس کے متعلق آپ کہہ دیتے ہیں کہ اس جنت اور جہنم کے ثواب وعذاب کا ہم موجودہ مادی ذرائع سے ادراک کر ہی نہیں سکتے۔ (ق۔ ف۔ ص:۳۱۰) اب سوال یہ ہے کہ جب لوگوں نے جہنم اور جنت سب کچھ اسی دنیا میں دیکھ لیا تو ان میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جو اس دنیا کی جہنم سے ڈر کر یا جنت کے لالچ میں نظام ربوبیت کے قیام پر آمادہ ہو سکے ہیں؟ اسی مشاہدہ سے آپ کے اس "جذبہ محرکہ" کی قوت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ بہت سے غریب صحابہ حتیٰ کہ بہت سے انبیاء بھی ایسے ہیں جن کی ضروریات زندگی تک بھی پوری نہ ہو سکیں اور وہ رحلت فرما گئے۔ اب پرویزی نظریہ کے مطابق ان کی ذات کی نشوونما رک گئی تھی یا ابھی شروع ہی نہ ہوئی تھی تو کیا وہ سب (نعوذ باللہ) پرویزی خیال کے مطابق جہنمی تھے اور جہنم بھی ایسی جو اس دنیا میں شروع ہو جاتی ہے پھر مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اگرچہ اس حیات بعد الممات کی جہنم کی عقوبات کو موجودہ مادی ذرائع سے ہم سمجھ نہیں سکتے۔

## نظام ربوبیت کی تاریخ

پرویز صاحب جب نظام ربوبیت کو قرآن سے ثابت فرما رہے ہیں تو پھر اس نظام کے "قرآنی" ہونے میں آخر کیا شک ہو سکتا ہے؟ اب یہاں ایک بڑا اہم سوال پیدا ہوتا تھا کہ حامل قرآن حضور نبی کریم ﷺ نے بھی یہ نظام قائم فرمایا تھا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں آپ سخت پریشان ہیں لہٰذا آپ کے بیانات ایک

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



دوسرے سے متصادم اور متضاد ہیں مثلاً۔

(ا) رسول اللہ نے شاید یہ نظام متشکّل فرمایا ہو؟: فرماتے ہیں۔

"میں نے جو گزشتہ صفحات میں لکھا ہے (اور جو کچھ بعد میں آئے گا) اس میں آپ نے ایک چیز کو نمایاں طور پر محسوس کیا ہو گا اور وہ یہ کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی سند میں صرف قرآن کی آیات پیش کی ہیں۔ تاریخ اور روایات سے کچھ نہیں لکھا حتی کہ میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ نبی اکرم نے جس نظام ربوبیت کو متشکل فرمایا۔ اس کے خدوخال کیا تھے؟ اور وہ کب تک علیٰ حالہ قائم رہا..... ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ کو یہ تسلیم ہے کہ جو کچھ ان صفحات میں لکھا گیا ہے وہ قرآن کی رو سے صحیح ہے تو اس کے بعد ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی اکرم ﷺ نے اسی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل فرمائی ہوگی۔" (ن۔ر۔ ص ۲۲۳۔۲۲۴)۔

اس اقتباس میں "تشکیل فرمائی ہوگی" سے معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب خود بھی اس معاملہ میں مشکوک ہیں۔ تاہم ایک دوسرے مقام پر اس "افتراء علی الرسول" کا ارتکاب بڑی جسارت سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

(ب) رسول اللہ نے نظامِ ربوبیت قائم کر لیا تھا: "آج دنیا حیران ہے کہ ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ﴾ کی قلیل جماعت نے اتنے مختصر سے عرصہ میں ایسی محیرالعقول ترقی کس طرح کر لی تھی۔ دنیا حیران ہے اور اس کے لئے تحقیقاتی ادارے قائم کرتی ہے۔ لیکن اسے معلوم نہیں کہ رسول اللہ نے وہ معاشرہ متشکل کر لیا تھا جو قرآنی نظامِ ربوبیت کا حامل تھا۔ یہ تمام محیرالعقول ترقیاں اسی کے ثمرات تھیں۔" (ن۔ر ص ۱۸۰)۔

دنیا تو اس بات پر حیران ہے اور ہم اس بات پر حیران ہیں کہ دنیا نے اتنے تحقیقاتی ادارے بھی قائم کئے۔ لیکن انہیں ترقی کا وہ سربستہ راز معلوم نہ ہو سکا جو پرویز صاحب کو کوئی ادارہ قائم کئے بغیر ہی معلوم ہو گیا۔ کہ اس کا اصل سبب "قرآنی نظام ربوبیت" کی تشکیل تھا۔

پھر ایک تیسرے مقام پر پرویز صاحب دور نبوی ﷺ میں نظام ربوبیت کی تشکیل کو خود ہی عقلی لحاظ سے ناممکن العمل قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

(ج) دورِ نبوی میں یہ نظام قائم نہیں ہو سکتا تھا: "لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جس زمانہ (چھٹی صدی عیسوی) میں قرآن نازل ہوا ہے۔ ذہن انسانی اپنی پختگی تک نہیں پہنچ چکا تھا۔ اس نے فقط اپنے عہد طفولیت کو چھوڑا تھا۔ اب اسے رفتہ رفتہ پختگی تک پہنچنا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی فقید المثال تعلیم اور سیرت سے قرآنی اصولوں کو معاشرہ میں نافذ العمل کر کے دکھا دیا تھا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ اصول ناممکن نہیں۔ لیکن اس زمانہ کی دنیا ہنوز ذہنی طور پر اس سطح پر نہیں آچکی تھی کہ وہ ان اصولوں کو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



یا ان کی بنیادوں پر قائم کردہ معاشرہ کو شعوری طور پر اپنا سکے۔ یہ چیزیں ابھی ان کے شعور میں سما ہی نہیں سکتی تھیں۔ اگر مسلمان اسے اسی "ایمان بالغیب" کے انداز سے جس سے یہ معاشرہ قائم ہوا تھا۔ آگے چلاتے رہتے تو یہ آگے بڑھتا رہتا۔ لیکن انہوں نے اس طریق کو چھوڑ دیا اور شعوری طور پر دنیا ہنوز اس قابل نہ تھی کہ اسے اختیار کر سکتی لہٰذا یہ نظام ختم ہو گیا۔ (ن۔ ر۔ ص: ۲۳۴)

کچھ سمجھے آپ پرویز صاحب کیا فرما رہے ہیں؟ آپ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ نظام قائم تو فرمایا تھا۔ مگر صحابہ کو اس کی سمجھ نہ آسکی پھر اس میں قصور صحابہ کا بھی نہیں کیونکہ اس دور میں انسان کی ذہنی سطح ربوبیت کا نظام سمجھنے کے قابل ہی نہ تھی۔ ہاں اگر صحابہ جس طرح اللہ 'کتابوں' رسولوں' فرشتوں اور یوم آخرت پر ایمان بالغیب لائے تھے۔ اسی طرح اس فلسفہ پر بھی ایمان بالغیب لے آتے تو یہ نظام آگے چلتا رہتا۔ لیکن چونکہ صحابہ اس فلسفہ پر ایمان بالغیب نہ لائے اور نہ ہی ان کی ذہنی سطح اس قابل تھی کہ وہ اس فلسفہ کو سمجھ سکتے لہٰذا انہوں نے اس نظام کو چھوڑ دیا اور یہ اس طرح یہ نظام رسول اللہ کی رحلت کے فوراً ہی بعد ختم ہو گیا تھا۔

چلئے یہ بات بھی طے ہوئی کہ دور نبوی ﷺ میں انسانی ذہن ہنوز پختہ نہیں ہوا تھا تاہم اپنے عہد طفولیت سے نکل چکا تھا۔ لیکن پرویز صاحب تو اس نظام کو عہد طفولیت میں بھی نازل فرما رہے ہیں۔ آپ درج ذیل آیت کی تفسیر اس انداز میں پیش فرماتے ہیں۔

## یہ نظام سب انبیاء پر نازل ہوا تھا

﴿ قُولُوٓاْ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيۡنَا وَمَآ أُنزِلَ إِلَىٰٓ إِبۡرَٰهِـۧمَ وَإِسۡمَٰعِيلَ وَإِسۡحَٰقَ وَيَعۡقُوبَ وَٱلۡأَسۡبَاطِ وَمَآ أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَآ أُوتِيَ ٱلنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمۡ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ أَحَدٖ مِّنۡهُمۡ وَنَحۡنُ لَهُۥ مُسۡلِمُونَ ﴾ (البقرۃ ۲/ ۱۳۶)

ان سے کہہ دو کہ ہم اس نظام کو اپنا نصب العین بناتے ہیں جو ہماری ربوبیت کے ضامن (خدا) کی طرف سے ہمیں ملا ہے اور جو اس سے پہلے ابراہیم اور اسماعیل' اسحاق' یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل کیا گیا تھا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کی وساطت سے انسانوں کو ملا (یہ ایک ہی نظام تھا جو شروع سے آخر تک انسانوں کو ملتا رہا) اس لئے ہم اس نظام کے لانے والوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم اسی نظام کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ (ن۔ ر۔ ص ۱۹)

اس ترجمہ سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) اللہ پر ایمان لانا کے معنی نظام ربوبیت کو اپنا نصب العین بنانا اور اس پر ایمان لانا ہے۔

(۲) ابراہیم علیہ السلام سے لے کر دور نبوی ﷺ تک تمام انبیاء و رسل پر یہی نظام ربوبیت ہی نازل ہوتا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



رہا۔

(۳) ﴿ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ ﴾ میں ہ کی ضمیر ربوبیت کے ضامن (خدا) کی طرف نہیں مڑتی بلکہ براہِ راست اس نظام کی طرف مڑ جاتی ہے۔

اب اس سے آگے چلئے یہ سب بیان فرمانے کے بعد پرویز صاحب یہ بھی اعتراف فرما رہے ہیں کہ اسلام کی تاریخ میں قرآن سے یہ نظام ثابت کرنے کی میری پہلی کوشش ہے کہتے ہیں۔

## اسلام کی تاریخ میں پہلی کوشش:

"جہاں تک میرا مطالعہ رہنمائی کرتا ہے قرن اول کے بعد (کہ جس میں یہ نظام اس زمانے کے حالات کے مطابق اپنی عملی شکل میں قائم ہوا تھا) اسلام کی تاریخ میں میری یہ پہلی کوشش ہے۔ جس میں اس نظام کو سامنے لایا گیا ہے۔ (ن۔ ر۔ مقدمہ ص:۲۲)

یہ سب اقتباسات ایک بار پھر ذہن میں لا کر بتایئے جو فلسفہ پرویز صاحب پہلی بار پیش فرما رہے ہیں اور جسے صحابہ بھی نہ سمجھ سکے تھے اسے سابقہ انبیاء اور ان کے متبعین نے کچھ سمجھا ہو گا؟ نیز یہ بھی فیصلہ فرما لیجئے کہ دور نبوی یا قرن اول میں یہ نظام قائم ہوا تھا یا نہیں؟

# نظامِ ربوبیت کو قرآن سے کشید کرنے کے طریقے

اس سلسلہ میں آپ نے کئی طریقے استعمال فرمائے ہیں جن کی مختصر روئیداد یہ ہے۔

**۱۔ اپنی طرف سے بے جا اضافوں کے ذریعہ سے:** آپ کسی آیت کے ترجمہ میں اپنی طرف سے کچھ ایسے اضافے کر دیتے ہیں۔ جن کا قرآنی الفاظ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اس طرح اس نظام کو ثابت فرماتے ہیں مثلاً:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلْإِنسَـٰنُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَـٰقِيهِ ۝٦ ﴾ (الإنشقاق٨٤/٦)

"اے انسان" تو سخت دشوار گزار منازل طے کرتا ہوا خدا کے نظامِ ربوبیت کے سامنے جا کھڑا ہو گا۔ (ن۔ ر۔ ص:۲۸۵)

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ خط کشیدہ الفاظ قرآنی آیت کے کس لفظ کا معنی ہو سکتے ہیں یا کشید کئے جا سکتے ہیں؟ درج ذیل مزید آیات اور خط کشیدہ الفاظ کو دیکھتے جایئے۔

﴿ إِنَّا هَدَيْنَـٰهُ ٱلسَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝٣ ﴾ (الإنسان٧٦/٣)

"ہم نے اسے (ربوبیت کا) راستہ دکھا دیا ہے اب چاہے تو اس راہ کو اختیار کرے اور چاہے تو اس سے انکار کر دے۔ (ن ر ص ۱۷)

﴿ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ ٱلْإِسْلَـٰمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ

جو شخص اس ضابطہ (اسلام) کے سوا کسی اور ضابطہ کو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



مِنۡهُ﴾ (آل عمران۳/ ۸۵)

اپنا نظام بنائے گا تو قانون کائنات کی رو سے وہ نظام قابل قبول نہیں ہوگا(کیونکہ وہ ربوبیت کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتا)(ن-ر-ص:۱۹)

﴿أَمۡ نَجۡعَلُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ كَٱلۡمُفۡسِدِينَ فِي ٱلۡأَرۡضِ أَمۡ نَجۡعَلُ ٱلۡمُتَّقِينَ كَٱلۡفُجَّارِ ﴿٢٨﴾﴾ (ص۳۸/ ۲۸)

کیا(یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ) ہم ان لوگوں کو جو دنیا میں ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ہمارے قانون ربوبیت پر ایمان لاتے ہیں اور ہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں کیا وہ لوگ اپنی معاشی زندگی کو ہمارے قانون سے الگ رکھتے ہیں (فجار) ان لوگوں کے برابر ہو جائیں گے جو اس زندگی کو ہمارے قانون سے ہم آہنگ رکھتے ہیں(ن-ر-ص۲۴۷)۔

آپ اس ترجمہ میں بہت سے اجنبی الفاظ دیکھ کر حیران نہ ہوں۔ نظام ربوبیت کو قرآن سے ثابت کرنے کا یہ طریقہ سب سے زیادہ کارآمد ہے۔

**۲۔ ربوبیت' قانون ربوبیت' نظام ربوبیت کے لئے قرآنی الفاظ:** دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ نے بہت سے الفاظ کا ترجمہ یا مفہوم ہی ربوبیت یا قانون ربوبیت یا نظام ربوبیت بتایا ہے۔ مثلاً۔

۱۔ "رب" کا معنی پروردگار یا مالک ہے اور یہ لفظ بطور فاعل ہی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن آپ اس کا ترجمہ خدا کی ربوبیت بتاتے ہیں جیسے۔

﴿يَوۡمَ يَقُومُ ٱلنَّاسُ لِرَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿٦﴾﴾ (المطففین۸۳/ ۶)

تمام نوع انسانی خدا کی ربوبیت کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔(ن-ر-ص۲۵۸)

۲۔ "اللہ" کے معنی بھی نظام ربوبیت ہے جیسے۔

﴿وَٱللَّهُ يَعِدُكُم مَّغۡفِرَةٗ مِّنۡهُ وَفَضۡلٗا﴾ (البقرۃ۲/ ۲۶۸)

نظام ربوبیت تمہیں پوری پوری حفاظت کا یقین دلاتا ہے اور فراوانیوں کی ضمانت دیتا ہے۔(ن ص۱۷۵)

۳۔ "قرآن مجید" کے معنی بھی قانون ربوبیت ہے۔ جیسے۔

﴿بَلۡ هُوَ قُرۡءَانٞ مَّجِيدٞ ﴿٢١﴾ فِي لَوۡحٖ مَّحۡفُوظِۭ ﴿٢٢﴾﴾ (البروج۸۵/ ۲۱-۲۲)

وہ قانون ایسے محفوظ مقام میں رکھا گیا ہے جہاں زمانے کے اثرات نہیں پہنچ سکتے۔(ن-ر-ص۲۱۵)

۴۔ "دین" کے معنی قانون ربوبیت بھی ہے اور نظام ربوبیت بھی۔ اس کی مثال اوپر گزر چکی ہے۔

۵۔ "اسلام" کا معنی بھی نظام ربوبیت کی تکمیل ہے۔

اسلام کے معنی ہیں اس نظام کا قیام اور تکمیل جس میں ہر شے کی مضمر صلاحیتوں کا نشوونما ہو جائے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



یعنی نظام ربوبیت کی تکمیل (ن- ر- ص ۱۴)۔

۶۔ بَیِّنَۃٌ کے معنی بھی قانونِ ربوبیت ہے۔

﴿ قَدْ جَآءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ﴾ (الأعراف ۷/ ۸۵) "تمہارے پاس خدا کا قانونِ ربوبیت نہایت واضح انداز میں آچکا ہے۔" (ن-ر- ص ۹۴)

۷۔ لفظ "آیات" کا معنی بھی قانون ربوبیت ہے لکھتے ہیں۔

﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ ﴾ (الکھف ۱۸/ ۱۰۵) "یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے قانونِ ربوبیت سے انکار کرتے ہیں۔" (ن- ر- ص ۹۷۰)

غور فرمایئے اگر رب- اللہ- قرآن مجید- دین- اسلام بینہ" اور آیات ان سب الفاظ کا مفہوم قانون ربوبیت یا نظامِ ربوبیت ہو تو پھر بھی یہ نظام قرآن سے ثابت نہیں کیا جا سکتا؟

## ۳۔ نئی نئی اصطلاحات کا طریقہ

دنیا اور آخرت کے کئی مفہوم : اس سلسلہ میں پہلے تو آپ نے الفاظ دنیا اور آخرت کے بہت سے معانی یوں متعین فرمائے۔

(۱) دنیا بمعنی حال اور آخرت بمعنی مستقبل۔ (۲) دنیا بمعنی ذاتی مفاد اور آخرت بمعنی کلی مفاد۔ (۳) دنیا بمعنی مفاد عاجلہ اور آخرت بمعنی آنے والی نسلوں کا مفاد۔ (۴) دنیا بمعنی طبعی زندگی اور آخرت بمعنی مرنے کے بعد کی زندگی۔ (نظام ربوبیت ص ۸۵ نیز لغات القرآن تحت ا- خ- ر)

ان چار معانی میں سے مسلمانوں کے ہاں صرف چوتھا معنی درست اور مسلم ہے۔ باقی معانی پرویز صاحب کی اپنی ضرورت کے تحت ایجاد کردہ ہیں کیونکہ ضرورت ہی ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ یہ تو دنیا اور آخرت کے مقابلتاً معنی تھے۔ مگر صرف لفظ آخرت کے دو معنی اور بھی ہیں یعنی۔

(۵) آخرت بمعنی آخر الامر جیسے۔

﴿ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٨٥﴾ ﴾ (آل عمران ۳/ ۸۵) وہ (ابتداءً کیا ہی خوش آئند کیوں نہ ہو) آخر الامر نظر آجائے گا کہ اس کا نتیجہ خسارہ ہی رہا۔ (ن- ر- ص ۱۹)

(۶)۔ آخرت کے معنی حال اور مستقبل دونوں کی خوشگواریاں بھی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"قرآن نے آخرت کی اصطلاح استعمال کی ہے جس سے مفہوم ہے حال اور مستقبل کی "خوشگواریاں" (ن۔ ر ص ۹۱)

گویا اس مفہوم میں آپ نے دنیا اور آخرت دونوں کے مفہوم نمبرا کو جمع بھی کر لیا اور خوشگواریوں کا اضافہ بھی فرمالیا۔ نیز آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "عربی زبان میں قریب کے لئے دنیا کا لفظ آتا ہے اور بعید کے لئے آخرت کا۔" (ن۔ ر۔ ص ۷۵) حالانکہ یہ دونوں لفظ (قریب اور بعید) عربی زبان کے ہیں اور انہی عام

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



معنوں میں قرآن مجید میں بھی استعمال ہوئے ہیں پھر معلوم نہیں پرویز صاحب کو ایسا سفید جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟

ایک اور مقام پر دنیا اور آخرت کی اصطلاحات کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "تحفظ مفاد کا وہ طریقہ جس میں ہر فرد اپنے پیش پا افتادہ یا قریبی مفاد کا حصول چاہتا ہے قرآن کی اصطلاح میں متاع الدنیا کہلاتا ہے اور تحفظ مفاد کا دوسرا طریق جس میں بہبود کلی سے افراد کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ متاع آخرت۔" (ن۔ر۔ص ۸۲) یہ متاعِ آخرت کا لفظ بھی پرویز صاحب کی ذاتی اختراع ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کہیں مذکور نہیں جب کہ پرویز صاحب کے ہاں یہ قرآنی اصطلاح ہے۔

دنیا اور آخرت کے چند در چند مفہوم بتانے کے بعد لکھتے ہیں کہ۔

"حیات الدنیا اور حیات آخرت کی ان دو بنیادی اصطلاحوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کیونکہ قرآنی نظام ربوبیت کی تمام گردشیں ان ہی منفی اور مثبت محوروں کے گرد گھومتی ہیں۔ جب تک ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آئے گا۔ قرآن کے وہ مقامات سمجھ میں نہیں آسکیں گے جن میں نظام ربوبیت سے بحث کی گئی ہے۔" (ن۔ر۔ص ۸۶)

اب یہ تو غالباً آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ پرویز صاحب دنیا اور آخرت کے اتنے زیادہ معانی کیوں ذہن نشین کرانا چاہ رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک آپ ان اسباق کو اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لیں اور یہ معلوم نہ کر لیں کہ فلاں مقام پر کونسا معنی زیادہ مفید رہے گا۔ اس وقت تک قرآنی نظام ربوبیت قرآن سے ثابت نہیں ہو سکتا۔

اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ: پھر اتنی بات پر بھی آپ اکتفا نہیں کرتے۔ اس کے بعد اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے قرآنی مفہوم بتاتے ہیں۔ ہم آئندہ ان عنوانات پر قرآنی مسائل کے حصہ کتاب میں الگ طور پر بحث کر رہے ہیں۔ سردست اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم نظامِ ربوبیت کی یاد دہانی کے اجتماعات موقتہ ہیں اور ایتائے زکوٰۃ کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ افراد اپنا زائد از ضرورت مال حکومت کے حوالہ کر دیں اور دوسرا یہ ہے کہ حکومت سب کچھ لوگوں سے از خود لے لے پھر انہیں ضروریات زندگی مہیا کرے تو حکومت کا یہ لوگوں کو ضروریات فراہم کرنے کا عمل ایتائے زکوٰۃ ہے۔

ایتائے زکوٰۃ کا دوسرا مفہوم متعین کرنے کی داستان بھی دلچسپ ہے اور قرآن سے اس کا استدلال اس سے بھی دلچسپ تر۔ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ۔

﴿ وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي ٱلْأَرْضِ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِ رِزْقُهَا﴾ (ھود ۱۱/ ۶) زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی اس ذمہ داری کے باوجود ہزاروں اور لاکھوں انسان بھوک اور قحط سے مر جاتے ہیں تو یہ اللہ کی ذمہ داری کیا ہوئی؟ پھر اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن کاموں کی اللہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



نے ذمہ داری لے رکھی ہے۔ اس انسانوں کی دنیا میں وہ کام بھی انسانوں کے ہاتھوں ہی سرانجام پاتے ہیں لہٰذا رزق کی ذمہ داری بھی انسانوں نے ہی پوری کرنی ہے۔ اور یہ ذمہ داری اس معاشرہ کے سر پر ہوگی جو خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہوگا" پھر اس کے طریق کار کا درج ذیل آیت سے استدلال فرماتے ہیں:

**اللہ سے مراد قرآنی معاشرہ:**

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض میں خرید لئے ہیں۔

(التوبۃ۹/ ۱۱۱)

پرویز صاحب اس آیت میں اللہ سے مراد قرآنی معاشرہ' مومنین سے مراد افراد معاشرہ اور جنت سے مراد روٹی کپڑا اور مکان یا ضروریات زندگی لیتے ہیں۔ گویا قرآنی حکومت افراد معاشرہ کو ضروریات زندگی دے گی۔ (ایتائے زکوٰۃ) اور اس کے عوض افراد معاشرہ کی جانیں بھی اور اموال بھی سب کچھ قرآنی حکومت کے ہوتے ہیں۔ اسی معاہدہ کی رو سے افراد معاشرہ اپنی انفرادی ملکیت رکھ ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ تو اپنا سب کچھ حتیٰ کہ جانیں بھی قرآنی حکومت کے ہاتھ "جنت" کے عوض فروخت کر چکے ہوتے ہیں۔ (ان۔ ر ص۱۷۱ تا ۱۷۳ ملخصاً)۔

اب دیکھئے اس معاہدہ میں دو چیزیں تو محسوس و مشہود تھیں (مومنین) اور قابل فروخت چیز (ان کے جان و مال) اور دو چیزیں انسان کے حیطہ ادراک سے باہر اور غیر مشہود تھیں۔ یعنی اللہ (بائع) اور جنت (قیمت) ان دونوں کی بھی آپ نے ایسی تعبیر کی وہ بھی محسوس و مشہود ہو جائیں پھر ایمان بالغیب کیا ہوا؟ جنت کے متعلق تو اس سے پیشتر سرسید صاحب بھی تبصرہ فرما چکے ہیں۔ اگر جنت ایسی ہی ہے جس میں حوریں ہیں شراب ہے یہ ہے اور وہ ہے تو اس سے تو ہمارے خرابات ہی بہتر ہیں؟ لہٰذا آپ کو جنت بس اسی دنیا میں درکار ہے جو لباس خوراک مکان وغیرہ پر مشتمل ہو۔ یعنی شیطانی جنت جس کا جھانسا ابلیس نے آدم کو دیا تھا اور اللہ سے مراد لی آپ نے قرآنی معاشرہ۔

**چند قرآنی اصطلاحات:** لیکن اتنی باتوں سے بھی اتنا عظیم الشان نظام ربوبیت بھلا قرآن سے کیسے ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا آپ نے ایک ہی جگہ بائیس الفاظ کی ایک فہرست دی اور انہیں اہم الفاظ کو اصطلاحات کا نام دیا پھر ان کے معنی متعین کئے۔ یہ تمام مفاہیم انسان کے معاشی مسئلہ کے گرد ہی گھومتے ہیں اور ان مفاہیم میں آپ کو ہمواریاں ناہمواریاں خوشگواریاں' ناخوشگواریاں' پروگرام' معاشی پروگرام' نظام اور قانون کے الفاظ بکثرت ملیں گے۔ پرویز صاحب غالباً یہ سمجھتے ہیں ان الفاظ کے جو معنی انہوں نے درج کر دیئے ہیں وہ واقعی اصطلاحی معنی بن جائیں گے حالانکہ اصطلاحی معنی وہ ہوتے ہیں جو کسی معاشرہ میں رائج ہوں اور معاشرہ ان کے مفہوم سے واقف ہو۔ مثلاً صلوٰۃ کے لغوی معنی کئی ایک ہیں۔ لیکن اصطلاحی مفہوم وہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)


ہوگا جس طرح دور نبوی ﷺ میں صلوٰۃ کا طریقہ رائج تھا۔ اب یہ قرآنی نظام ربوبیت تو پرویز صاحب کے ذہن کی پیداوار ہے پھران کے مختلف الفاظ کے مفہوم متعین کر دینے سے وہ اصطلاحات کیسے بن سکتی ہیں؟ خیر اس بات کو بھی جانے دیجیے بات یہ ہو رہی تھی کہ آپ نے دنیا اور آخرت کے مختلف مفہوم بتانے کے بعد بائیس قرآنی اصطلاحات تو نظام ربوبیت کے ص۸۶ تا ص۸۸ پر درج فرما دیں۔ لیکن ایسے مزید جواہر ریزے اس ساری کتاب میں کافی تعداد میں بکھرے پڑے ہیں جو اس قرآنی نظام ربوبیت کے لئے انڈکس کا کام دیتے ہیں۔ اگر آپ ایسے الفاظ کے وہی معنی یاد کرلیں جو پرویز صاحب بتا رہے ہیں تو پھر توقع ہے کہ آپ کو قرآن میں قرآنی نظام ربوبیت بھی نظر آنے لگے۔ ورنہ نہیں ہم ایسی اصطلاحات میں سے چند ایک آپ کے تفنن طبع کے لئے بہ ترتیب حروف تہجی یہاں پیش کر رہے ہیں تاکہ آپ ذرا آسانی سے ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

| لفظ | معنی | پرویزی مفہوم |
|---|---|---|
| ارض | زمین یا پستی | "انسان کی معاشی زندگی۔ وسائل پیداوار" (ص۸۶) ان معانی کو پرویز صاحب نے خود بھی ایک دوسرے مقام پر قبول نہیں کیا لکھتے ہیں کہ ﴿ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ ﴾ (۳۶:۴۵) "اس خدا کا قانون ربوبیت پستیوں اور بلندیوں کو محیط ہے۔" (ن۔ ر۔ ص۲۴۹) علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ﴾ (۴۱:۱۱) "اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین سے فرمایا آؤ خوشی سے یا مجبوری سے۔" اب اس آیت میں ارض کی جگہ انسان کی معاشی زندگی یا وسائل پیداوار کا معنی فٹ کر کے دیکھئے کوئی مطلب نکلتا ہے؟ پھر تیسرے مقام پر ارض کا معنی معاشی نظام انسانیت اور اسماء کے معنی کائناتی نظام بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ |

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



"یہ انقلاب عظیم آکر رہے گا۔ وہ انقلاب جس میں معاشی نظام انسانیت بھی خدا کے ہاتھ میں (یعنی اس کے قانون کے مطابق قائم) ہوگا جس کے ہاتھ میں کائناتی نظام ہے ﴿ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِينِهِ ﴾ (۳۹:۶۷) (ایضاً ص۲۸۵)

"گویا ارض کے معنی وسائل پیداوار بھی ہیں۔ معاشی زندگی بھی، معاشی نظام انسانیت بھی اور کائنات کی پستیاں بھی۔"

| | | |
|---|---|---|
| ② ابلیس | شیطان | ابلیس، شیطان، اور جن کے پرویزی معانی کتاب ہذا کے حصہ ششم باب ۶ میں تفصیل سے دیئے گئے ہیں۔ |
| ③ انفاق | خرچ کرنا | "ایسا نظام جس میں ایک طرف سے افراد کی محنت کا ماحصل آتا جائے اور دوسری طرف سے مفاد عامہ کے لئے نکلتا جائے۔ (نفق) ایسا راستہ جو دونوں طرف سے کھلا ہو)۔ لیجئے اس ایک ہی قرآنی لفظ سے آپ نے اشتراکیت کے لئے پورا میدان ہموار کر لیا چونکہ انفاق میں راستہ دونوں طرف سے کھلا ہوتا ہے اور اشتراکیت میں بھی راستہ دونوں طرف افراد اور نظام کی طرف کھلتا ہے لہٰذا انفاق سے مراد بس یہی اشتراکی نظام ہی ہو سکتا ہے۔ اب درج ذیل آیت ملاحظہ فرمایئے: ﴿ وَإِن كُنَّ أُولَٰتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ (۶۵:۶) "اور اگر وہ حمل والی ہو تو بچہ جننے تک ان پر خرچ کرتے رہو۔ اب بتایئے یہاں دوسرا راستہ کدھر ہے؟ |
| ④ ایمان بالغیب | یعنی اللہ اس کی کتابوں، فرشتوں رسولوں اور آخرت پر بن دیکھے یقین کرنا۔ | "خدا کے نظام ربوبیت کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھنا۔" ص۸۸۔ |

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



| | | |
|---|---|---|
| | | اب دیکھئے اللہ تعالیٰ کے نظام ربوبیت کے نتائج ان دیکھے نہیں ہیں۔ انہیں ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ کہ ہر چیز کس طرح پرورش پا رہی ہے۔ البتہ پرویز صاحب کے ''قرآنی نظام ربوبیت'' کے نتائج واقعی ان دیکھے ہیں کیونکہ ایسا نظام نہ دنیا میں کبھی قائم ہوا نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ |
| ⑤ تقویٰ | سزا کے خوف سے گناہوں سے بچنا اور اوامر بجالانا | معاشی پروگرام کو مستقل اقدار (قانون خداوندی) کے ساتھ ہم آہنگ کرنا اور اس طرح فرد اور معاشرہ کو خوف وحزن سے بچالینا'' <br> اس مفہوم کو سامنے رکھیے اور درج ذیل آیت کو بھی <br> ﴿ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَاللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ (۳۲:۲۲) <br> ''جو اللہ کے شعائر (منسوب شدہ ادب کی چیزیں) کی عظمت رکھے تو یہ دل کی پرہیزگاری ہے دیکھئے اس آیت میں معاشی پروگرام [illegible] بات نظر نہیں آتی ہے؟ <br> علاوہ ازیں پرویز صاحب خود ایک دوسرے مقام پر تقویٰ کا معنی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا۔'' بتاتے ہیں لکھتے ہیں کہ۔ <br> ''جو شخص اپنی ذمہ داریوں کو سب سے زیادہ پورا کرتا ہے۔ وہ سب سے زیادہ عزت کا مستحق قرار پاتا ہے۔ ﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ﴾ ''یہاں بھی معاشی پروگرام اور مستقل اقدار اور ہم آہنگی کے مفاہیم فٹ نہیں بیٹھتے۔ |
| ⑥ حزن | غم | ''سامان رزق کی کمی کی وجہ سے افسردہ خاطر رہنا حتیٰ کہ وہ بال بچے بھی حزن کہلاتے ہیں۔ جن کی معاش کی فکر سے انسان غمگین ہو جائے۔ (ص۵۶) <br> اب دیکھئے اللہ تعالیٰ رسول اکرم ﷺ سے فرماتے ہیں: <br> ﴿ فَلَايَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ﴾ (۷۶:۳۶) ''ان کافروں کی بات سے آپ غمگین نہ ہوں۔'' |

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



| | | |
|---|---|---|
| | | اب ان کافروں کی بات میں وہ رزق کی کمی کہاں سے آگئی تھی جس سے آپ غمگین رہتے تھے؟ |
| ⑦ حق | حقیقت۔ سچ، سچا۔ حق (حقوق) | "کسی عمل کا تعمیری پہلو جو ٹھوس نتائج کی شکل میں سامنے آجائے اور اپنی جگہ پر اٹل رہے۔" گویا حق تعمیری پہلو کا نام ہے اب درج ذیل آیات ملاحظہ فرمایئے۔<br>﴿ وَشَهِدُوٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ ﴾ (۳:۸۶) "اور وہ گواہی دے چکے کہ یہ پیغمبر سچا ہے۔"<br>﴿ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَالَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ﴾ (۱۱:۷۹) "وہ بولے تم جانتے ہو کہ تمہاری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حق نہیں۔"<br>پہلی آیت میں حق بمعنی سچا اور دوسری میں حق بمعنی استحقاق ہے۔ ان دونوں آیات میں آپ کو کسی عمل کا کوئی تعمیری پہلو نظر آتا ہے جو ٹھوس نتائج کی شکل میں سامنے آگیا ہو؟ |
| ⑧ دین | ۱۔ مکمل حاکمیت<br>۲۔ مکمل عبودیت<br>۳۔ قانون جزا وسزا<br>۴۔ جزا وسزا کا نفاذ | (۱) دین نام ہی قرآن کے عطا کردہ مستقل اقدار کے تحفظ کا ہے" (لغات القرآن زیر عنوان (ق۔ د۔ ر)<br>(۲) قرآن نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ الدین سے مفہوم نظام ربوبیت کا قیام ہے۔" (ن۔ ر۔ ص ۱۱۵)<br>ان معانی کی تردید بھی خود ہی پرویز صاحب نے دو مقامات پر فرمادی ہے۔ مثلاً:<br>(۱) ﴿ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ﴾ (۱۰۷:۱) "کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو ہمارے قانون مکافات کو جھٹلاتا ہے۔" (ن۔ ر۔ ص ۱۴۰) |

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



| | | |
|---|---|---|
| | | ۲۔ خدا مالک یوم الدین ہے۔ دین کے معنی مکافات عمل کے ہیں (قرآنی فیصلے ص ۹۲): |
| ⑨ ذکر | ذکر، یاد، یاد کرنا | ﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ﴾ "جو قوم اس (خدا) کے اس قانون [1] سے روگردانی کرتی ہے اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔" (ص ۲۸۱) اس آیت میں ذکر کا معنی قانون کیا گیا ہے۔ اب یہی معنی درج ذیل آیت میں فٹ کیجیے: ﴿ لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ﴾ (۲۱:۱۰) "ہم نے تمہاری طرف کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے۔" اب یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن میں بنی نوع انسان اور امم سابقہ کا ذکر تو ہے مگر ان کے کسی قانون کا ذکر نہیں لہٰذا پرویزی معنی غلط ہیں۔ |
| ⑩ رب | پروردگار پالنے والا | خدا کا قانون ربوبیت جو تمام کائنات میں جاری وساری ہے" (ص ۸۶) گویا رب کسی مقتدر ہستی کا نام نہیں بلکہ بے جان قانون ربوبیت کا نام ہے۔ |
| ⑪ ربوبیت | | ربوبیت "کسی شے کا کامل نشوونما پاکر اپنی تکمیل تک پہنچ جانا۔ یعنی اس کی مضمر صلاحیتوں کا پورے طور پر نشوونما پا جانا۔" (ص ۸۶) یہ لفظ ہمیں قرآن میں کہیں نہیں ملا۔ اسے خواہ مخواہ قرآنی اصطلاحات میں شامل کر لیا گیا ہے۔ |
| ⑫ الربانیون | مشائخ، درویش | نظام ربوبیت کی حامل جماعت "(ص ۸۸) ہم پرویز صاحب کی تحریروں سے ہی ثابت کر چکے ہیں۔ کہ آپ کا ایجاد کردہ نظام ربوبیت آج تک دنیا میں قائم نہیں ہوا تو پھر ربانیون کوئی اور لوگ ہی ہو سکتے ہیں اس نظام کی حامل جماعت کیسے ہو سکتی ہے؟ |

[1] یہی آیت اس کتاب کے ص ----- پر بھی درج ہے جہاں قانون خداوندی کی وضاحت فٹ نوٹ میں پوری کر دی گئی ہے کہ خدا کا کائناتی قانون جس کے مطابق زمین کے ذخیروں سے رزق حاصل ہوتا ہے اور جو کافر مومن سب پر یکساں حاوی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



| | | |
|---|---|---|
| | | پرویز صاحب فرماتے ہیں: |
| ⑬ رجوع الی اللہ | اللہ کی طرف لوٹنا | ﴿ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ﴾ (۳:۸۳) "کائنات کی ہر شے اس کے قانون کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہے۔ طوعاً وکرہاً ان اشیاء کی تمام حرکتیں اسی محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔" (ن۔ ر۔ ص ۱۱۳) اور اگر الفاظ: ﴿ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ (۲:۲۸) تو اس کے معنی ہو جاتے ہیں "تمہیں آخر الامر اس کی طرف لوٹ کر آنا ہوگا۔" (مفہوم القرآن ج ص ۱۱) |
| ⑭ سماء (ج سماوات) | آسمان۔ بلندی | "خدا کا کائناتی قانون جو از خود جاری وساری ہے۔" (ن۔ ر۔ ص ۸۷) لیکن لغات القرآن میں آپ اسماء کا معنی آسمان یا ہر وہ چیز جو زمین پر سایہ فگن ہو" بتاتے ہیں۔ (تحت مادہ س۔م۔و) نیز اسی کتاب کے ص ۲۴۹ پر آپ نے سماوات کا مفہوم بلندیاں لکھا ہے۔ گویا ربوبیاتی معنوں کی پرویز صاحب نے خود ہی تردید کردی۔ سماء کے معنی کائناتی قانون بھی ہے۔ کائناتی نظام بھی اور کائناتی بلندیاں بھی۔ یعنی آپ کے مفہوم قرآن کے مطابق قانون' نظام اور بلندی سب ہم معنی لفظ ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ﴿ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ ﴾ (۴۱:۱۲) پھر اس نے دو دن میں سات آسمان بنائے تو اللہ نے دو دن میں سات قانون بنائے تھے یا نظام بنائے تھے۔ یا سات بلندیاں بنائی تھیں؟ |
| ⑮ سیئات | برے کام۔ برائیاں | "انسانی ذات اور معاشرہ کا توازن بگاڑنے والا پروگرام۔" (ص ۸۶) اب دیکھئے کہ یہ پروگرام کا لفظ کدھر سے آگیا؟ علاوہ ازیں سیئات جمع کا لفظ ہے لہٰذا پروگرام بھی زیادہ ہونے چاہئیں حضرت لوط کی قوم کے متعلق اللہ فرماتے ہیں ﴿ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ﴾ یعنی برے کام (لواطت) کرتے تھے تو کیا وہ لوگ صرف توازن بگاڑنے والے پروگرام بنایا کرتے تھے؟ |

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



| | | |
|---|---|---|
| ⑲ طیبات | پاکیزہ چیزیں یا عورتیں | "زندگی کی خوشگواریاں" (ص۸۶) اب درج ذیل آیات میں یہ معنی فٹ کر دیکھئے کچھ معنی بنتے ہیں؟ مثلاً اللہ فرماتے ہیں:<br>﴿ اَلطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ ﴾ (۲۶:۲۴) "پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے۔"<br>﴿ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ ﴾ (۲۴:۱۴) "پاکیزہ بات کی مثال پاکیزہ درخت کی طرح ہے۔" |
| ⑳ افضل | بزرگی۔ بڑائی۔ رتبہ۔ مہربانی | "معاشی سہولتیں' رزق کی فراوانی" اب دیکھئے سورہ نور میں واقعہ افک میں زنا اور تہمت کی حدود مقرر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:<br>﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (۲۴:۱۴) "اور اگر دنیا اور آخرت میں تم پر خدا کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو جس شغل میں تم منہمک تھے اس کی وجہ سے تم پر سخت عذاب نازل ہوتا۔"<br>تو اس قصہ کو رزق یا معاشی سہولتوں سے کیا تعلق ہے؟ کیا پہلے وہ تنگ دست تھے کہ اللہ نے ان پر رزق کی فراوانی سے ایک بڑے عذاب سے بچا لیا تھا؟ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ کو فرماتے ہیں: |

---

① ارض وسماء کے اور بھی بہت سے معانی پرویز صاحب نے بیان فرمائے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے فکر پرویز پر عجمی شیوخ کی اثر اندازی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ﴾ (۴/۱۱۳) "اگر تم پر خدا کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو ان میں ایک جماعت تم کو بہکانے کا ارادہ کر چکی تھی۔"

یہ آیت تہمت کی قباحت بیان کرنے کے بعد کی ہے۔ بتایئے اس مقام پر معاشی سہولتوں کی کوئی تک ہے؟

## ۴۔ تفسیری انداز

یہ تفسیری انداز کا طریقہ کوئی الگ چیز نہیں بلکہ پہلے تین طریقوں کو اگر بیک وقت ملا کر استعمال کیا جائے تو یہ چوتھا تفسیری انداز بن جائے گا۔ اب اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ سرمایہ داری اور طبقاتی تقسیم: پرویز صاحب سرمایہ دارانہ نظام میں طبقاتی تقسیم کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے' جو آیات اللہ تعالیٰ نے قیامت کے احوال سے متعلق نازل فرمائی ہیں' وہ آپ اس معاشرہ پر منطبق کرتے چلے جاتے ہیں۔ ارشاد ہے:

"اس کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ بھائی بھائی سے الگ ہو جاتا ہے۔ ﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴾ (۸۰-۳۴) اولاد ماں باپ سے جدا ہو جاتی ہے۔ ﴿ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴾ (۸۰-۳۵) حتیٰ کہ میاں بیوی اور باپ بیٹے کے مفاد تک بھی ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتے ہیں ﴿ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴾ (۸۰-۳۶) ان میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ مشترکہ مفاد انسانیت کی بجائے اپنے اپنے مفاد کے حصول کے لئے الگ الگ پروگرام بنائے۔ ﴿ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴾ (۷۴-۵۲) اس نظریہ کے تحت جو کچھ افراد میں ہوتا ہے وہی کچھ قوم میں ہوتا ہے۔ اس کی رو سے ہر قوم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسری قوموں کو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کر دے۔ (كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا (۷-۳۸) اس جہنمی زندگی میں ہر قوم دوسری قوم کو محروم کرنے کی فکر میں ہوتی ہے۔ (لَعَنَ کے معنی ہیں دور رکھنا' محروم کرنا) اور اس طرح دوسری قوموں سے آگے بڑھ جائے۔ (اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ (۱۶-۹۲) اس کے بعد جس طرح ہر دولتمند یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھے اب دوسرے افرادِ انسانیہ کی پروا کیا ہے' میرا مال و دولت میرے لئے کافی ہے' اسی طرح ہر قوم اپنے آپ کو خود مکتفی سمجھ کر خیال کر لیتی ہے۔ ﴿ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ﴾ (۹۶-۶،۷) جب انسان اپنے آپ کو مستغنی تصور کر لیتا ہے تو پھر آئین و ضوابط سے سرکشی اختیار کر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



لیتا ہے۔"

"غور کیجیے کتنی بڑی ہے یہ حقیقت جسے قرآن نے دو جملوں میں سمیٹ کے رکھ دیا ہے' ایسا انسان سمجھتا ہے کہ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ﴿ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ﴾ (۹۰-۵)" (ق-ن-ر- ص ۹۲-۹۳)

اس اقتباس میں آپ نے سات مختلف سورتوں سے آیات لے کر طبقاتی تقسیم کا جو نقشہ پیش کیا ہے۔ یہ آپ کے تفسیری انداز کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس طرح قرآن کے سیاق وسباق سے بے نیاز ہو کر تو دنیا ومافیہا کا ہر ایک نظریہ اور عقیدہ قرآن سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ہم اس اقتباس میں سے دو مقامات کے سیاق وسباق کا تذکرہ کریں گے جو احوال آخرت سے متعلق ہیں۔

(۱) سورہ عبس (۸۰) کی جو آیات ۳۴ تا ۳۷ درج کی گئی ہیں۔ ان سے اگلی آیات یوں ہیں

﴿ وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝ ﴾

"کتنے چہرے اس دن چمک رہے ہوں گے۔ خنداں وشاداں اور کتنے چہرے ہوں گے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی۔ سیاہی چڑھ رہی ہوگی' یہ کفار بدکردار ہیں"

اب دیکھئے کہ اگر ان آیات کو طبقاتی تقسیم پر منطبق کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ خنداں وشاداں چہرے امیر طبقہ یا قوم ہی کے ہو سکتے ہیں اور اسی طبقہ کو پرویز صاحب مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں اور بے چارے غریب ہی گرد آلود اور سیاہ چہرے والے اور ساتھ ہی کافر بتائے گئے ہیں تو آخر غریبوں کا کیا قصور؟ ظاہر ہے ان آیات کو غلط طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ آیات قیامت کے دن ہی سے متعلق ہو سکتی ہیں جن سے پرویز صاحب فرار چاہتے ہیں۔ (عبس ۸۰/ ۳۸-۴۲)

(۲) سورہ اعراف (۷) کی آیت نمبر ۳۸ کا جو ٹکڑا پیش کیا گیا ہے وہ پوری آیت یوں ہے:

﴿ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (الأعراف ۷/ ۳۸)

"تو فرمائے گا کہ جنوں اور انسانوں کی جو جماعتیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں' ان ہی کے ساتھ تم بھی آگ (جہنم) میں داخل ہو جاؤ۔ جب ایک جماعت داخل ہوگی تو اپنی (مذہبی) بہن پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب سب اس میں داخل ہو جائیں گے تو پچھلی جماعت پہلی جماعت کی نسبت کہے گی کہ اے پروردگار! ان ہی لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا تو ان کو آتش جہنم کا دگنا عذاب دے۔ خدا فرمائے گا تم سب کو دگنا عذاب دیا جائے گا مگر تم نہیں جانتے"

اب دیکھئے اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



۱۔ جن بھی انسانوں کی طرح ایک الگ نوع ہے جو انسانوں کی طرح شریعت کی مکلف ہے۔ وہ بھی جہنم میں داخل ہوں گے جب کہ "پرویز اینڈ کو" کو ان کی الگ نوع ہونے کے منکر ہیں۔ وہ جن سے "دیہاتی لوگ مراد" لیتے ہیں۔

۲۔ اس آیت میں اخروی زندگی اور جہنم کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس کی طرف اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔

۳۔ اس آیت میں طبقاتی تقسیم اور امیر و غریب کی داستان بیان نہیں کی جا رہی بلکہ بدکردار انسانوں کا ذکر ہے لہٰذا اس آیت کو غلط مقام پر استعمال کیا گیا ہے۔

۴۔ لَعَنَ کے معنی جو آپ نے دور کرنا اور محروم کرنا بتائے ہیں تو اس معنی کو یہاں فٹ کر کے دیکھئے' کیا جہنم میں پڑی ہوئی ایک جماعت دوسری آگے والی جماعت کو جہنم کے عذاب سے دور کرنے یا محروم کرنے کی طاقت رکھتی ہوگی؟ اور خود اس کی جگہ لے لے گی؟ صاف واضح ہے کہ یہاں "لعنت" کے معنی "دور کرنا" نہیں بلکہ "پھٹکار" ہے۔

## ۲۔ نظامِ ربوبیت کے قائلین اور منکرین:

محترم پرویز صاحب کی تحریر میں ایک خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ آپ پہلے اپنے خیالات و نظریات یعنی نام نہاد قرآنی افکار تحریر کرتے چلے جاتے ہیں اور آخر میں قرآن کے پیچھے چلنا گوارا نہیں فرماتے بلکہ قرآن کو اپنے خیالات کے پیچھے لگانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز نہایت غلط ہے۔ درج ذیل اقتباس میں آپ سورہ دہر کی وہ آیات جو روز قیامت' جنت اور دوزخ سے متعلق ہیں' اپنے نظام ربوبیت کی تائید و توثیق میں پیش فرما رہے ہیں۔ اس اقتباس سے پوری وضاحت ہو جاتی ہے کہ آپ جنت' دوزخ اور قیامت پر کس طرح کا ایمان رکھتے ہیں اور جنت اور دوزخ کے مستحق کن لوگوں کو سمجھتے ہیں؟ فرماتے ہیں:

"اسے (انسان کو) یہ بھی بتا دیا کہ اس (نظام ربوبیت کے) راستے سے روگردانی کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی ذات کی صحیح آزادیاں سلب ہو جائیں گی۔ زندگی گھٹ کر جوئے کم آب رہ جائے گی۔ اس کی کشادگیاں سمٹ جائیں گی۔ اس کی کھیتیاں جھلس جائیں گی۔ ﴿ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا وَ اَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ﴾ (۷۶-۴) اس راہ سے انکار کرنے والوں اور اس طرح زندگی کی بردمندیوں کو دبا دینے والوں کے لئے زنجیریں اور طوق اور جھلسا دینے والی آگ کے شعلے بنا دیئے گئے ہیں۔ ان کے برعکس جو لوگ اس راستے کو اختیار کر لیں گے ان کے سینے میں کشادگی اور نگاہوں میں وسعت پیدا ہوگی اور زندگی پھیل کر بحر بیکراں بن جائے گی (ان لوگوں کو ابرار کہہ کر پکارا گیا ہے جس کے معنی کشادگی اور وسعت کے حامل ہوتے ہیں) یہ اس پیالے سے آب حیات پئیں گے جس میں سکون اور ٹھنڈک کی آمیزش ہوگی ﴿ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ﴾ (۷۶-۵) یہ شراب آئے گی کہاں سے؟ اس چشمے سے جسے یہ لوگ دل کی گہرائیوں سے پھاڑ کر نکالیں گے۔ (عَيْنًا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ﴾ (۷۶-۶) اس چشمے کا منبع کہیں باہر نہیں ہوگا اسے یہ لوگ خود اپنے عمق قلب سے نکال کر باہر لائیں گے۔ یہ نظام ایسا نہیں جسے ان پر استبداداً ٹھونس دیا جائے۔ یہ دل کی دنیا سے ابھر کر باہر آئے گا۔ یہ ہوگا کیسے؟ اس طرح کہ یہ لوگ ان تمام واجبات کو جسے یہ از خود اپنے اوپر عائد کریں گے۔ نہایت عمدگی سے ادا کرتے جائیں گے۔ ﴿ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ ﴾ (۷۶-۷) (نذر کے لفظ پر غور کیجیے۔ نذر کسی کی طرف سے عائد کردہ تاوان نہیں ہوتا۔ خود اپنی مرضی سے مانی ہوئی منت ہوتی ہے) انہیں اس بات کا احساس ہوگا کہ اگر ہم نے اس قسم کا معاشرہ قائم نہ کیا تو اس کی جگہ ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا۔ جس میں شر اس طرح عام ہو جائے گا کہ جو لوگ اس سے بچنا چاہیں گے' وہ بھی نہ بچ سکیں گے وہ اڑ اڑ کر ان تک جا پہنچے گا۔ ﴿ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ﴾ (۷۶-۷) اس لئے وہ کریں گے کیا؟ ان تمام لوگوں کی روٹی کا انتظام کریں گے جن کی حرکت رک جائے (مسکین) یا جو معاشرے کے اندر رہتے ہوئے اپنے آپ کو تنہا پائیں (یتیم) یا جن کی حرکت تو ہو لیکن وہ خارجی موانعات سے اس طرح گھر جائیں کہ ہل نہ سکیں (اسیراً) اور یہ سب کچھ مفاد خویش کی کشش وجاذبیت کے علی الرغم کریں گے۔ ﴿ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ﴾ (۷۶-۸) اور اس کے لئے نہ کسی صلہ کی امید رکھیں گے نہ ستائش کی ﴿ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ﴾ (۷۶-۹)

"یہ ہیں نظام ربوبیت کی بنیادیں۔ یعنی دل کی گہرائیوں سے وہ چشمے ابلیں جو مزرع انسانیت کی برد مندی اور سرسبزی وشادابی کا موجب بنیں۔ قلب ونگاہ کی اس تبدیلی کا نام ہے مصلی بننا۔" (قرآنی نظام ربوبیت ص ۱۹۳'۱۹۴)

زندہ باد! آپ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے اور یاد رکھیے کہ سورہ دہر کی مندرجہ بالا آیات آپ کے ایجاد کردہ نظام ربوبیت کی بنیادیں بتانے کے لئے ہی نازل ہوئی تھیں پھر یہ بھی کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آپ کو بیسیوں سال نمازیں ادا کرتے گزر گئے مگر مصلی بننے کا مفہوم سمجھ میں نہ آسکا۔

۳۔ جہنم صرف سرمایہ دار کے لئے اور صرف دنیا میں ہے: پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ "ہر شخص چاہتا تھا کہ جو کچھ اسے مردوں سے ہاتھ آئے سب کچھ سمیٹ کر رکھا جائے (۸۹-۱۹) اور ادھر ادھر کا مال اکٹھا ہو کر اس کے گھر پہنچ جائے (۸۹-۲۶) اس معاشرہ کا انجام اگر جہنم کی تباہیاں نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ یہ آگ کہیں باہر سے نہیں آئی۔ وہی دولت جو انہوں نے جمع کر رکھی تھی' بند رہنے سے اس قدر گرم ہو گئی ہے کہ اس سے ان کے جسموں کو داغا جا رہا ہے (۹:۳۵) جو انہوں نے بڑے بڑے لمبے چوڑے سہاروں اور بھروسوں کے ستونوں میں بند کر رکھی تھی۔ اب وہی آگ ان کے دلوں پر چڑھ رہی ہے۔ (۱۰۴:۶ تا ۹) قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ درحقیقت انسانیت کی سطح تک پہنچے ہی نہیں تھے۔ ان کی زندگی حیوانی سطح پر تھی جو کھاتے پیتے اور مرجاتے ہیں اور زندگی کا نتیجہ یہ جہنم ہے۔ (۱۲:۴۷) (ن-ر-ص ۹۹)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس چند سطور کے اقتباس پر چار مختلف سورتوں الفجر' التوبہ' الھمزہ اور محمد کی مختلف آیات کو جوڑ کر مال جمع کرنے کی مذمت پیش کرنے کے علاوہ درج ذیل انکشافات بھی آپ نے فرمائے۔

۱۔ اگر کہیں دولت کو جمع کر کے رکھا جائے تو وہ دولت اس قدر گرم ہو جاتی ہے کہ اس سے جسموں کو داغا جا سکتا ہے۔

۲۔ اور اگر یہ دولت بڑے بڑے لمبے چوڑے سہاروں اور بھروسوں کے ستونوں (جو آج کل بنک بھی ہو سکتے ہیں مؤلف) میں رکھی جائے تو وہ آگ جو اس دولت میں پیدا ہوتی ہے اس سے جسم تو خیر نہیں داغے جاتے البتہ وہ آگ دلوں پر چڑھنا شروع کر دیتی ہے۔

آج کل بھی بہت سے لوگ دولت گھروں میں بھی دفن کرتے ہیں اور بنکوں میں بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی یہ جمع شدہ دولت گرم ہوتی ہے۔ یا اس کی گرمی سے کوئی شخص داغا گیا ہے؟ یا یہ دولت کی آگ کسی کے دل پر چڑھا کرتی ہے؟ یہ ہے پرویز صاحب کے حیات بعد الممات میں جہنم کے عذاب سے انکار کا نمونہ۔ ایسے عذاب کو وہ اسی دنیا میں اور محض الفاظ کی بازی گری کے رنگ میں پیش فرما رہے ہیں۔

۴۔ قانونِ ربوبیت پر ایمان لانے کے فائدے: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا اَرَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ﴾ (۴۱:۳۰) جن لوگوں نے خدا کے قانون ربوبیت کو اپنا نصب العین بنا لی اور اس راہ پر نہایت استقلال واستقامت سے گامزن ہوئے تو یہ ہیں وہ لوگ کہ قانون ربوبیت کے نتائج پیدا کرنے والی کائناتی قوتیں ان کی مدد و مددگار ہوں گی ﴿ تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ﴾ (۴۱-۳۰) جو انہیں یقین دلائیں گی کہ ان کے لئے خوف وحزن کا کوئی مقام نہیں ﴿ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا ﴾ (۴۱:۳۰) اور وہ انہیں اس "جنت" کی بشارت دیں گی جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ﴿ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ (۴۱:۳۰) اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ قوتیں ان کے قریبی مفاد زندگی (حیوۃ الدنیا) میں بھی ان کی رفیق اور کارساز ہوں گی اور مستقبل کی زندگی میں بھی ان کی معین ومددگار ﴿ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ﴾ (۴۱:۳۱) اور اس طرح قریب و مستقبل (دنیا و آخرت) دونوں میں ان کا جو کچھ جی چاہے گا ملے گا اور جو کچھ طلب کریں گے ان کے سامنے آجائے گا۔ (وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴾ (۴۱:۳۱) (ن-ر-ص ۲۴۲)

مندرجہ بالا آیات میں قرآن نے جو فائدے اللہ پر ایمان لانے اور اس پر ڈٹ جانے کے بتائے تھے۔ وہ پرویز صاحب نے وہاں سے اٹھا کر قانون ربوبیت کے کھاتے میں ڈال دیئے اور جہاں ملائکہ کا ذکر آیا تو اس سے مراد بے شعور اور بے روح کائناتی قوتیں مراد بتلائی پھر یہی بے روح و بے شعور کائناتی قوتیں مومنوں سے ہم کلام بھی ہوتی اور انہیں خوشخبری بھی سناتی ہیں ؎

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



قانون کی قوت؟ : "جو شخص اس حقیقت سے انکار کرتا ہے۔ اسے میرے قانون کے سپرد کر دو۔ ﴿ فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِھٰذَا الْحَدِیْثِ ﴾ (۶۸:۴۴) میرا قانون مکافات عمل آہستہ آہستہ بتدریج اس طرح پکڑ لے گا کہ انہیں معلوم بھی نہیں ہوگا کہ یہ گرفت کہاں سے آ گئی۔ ﴿ سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾ (۶۸:۴۴) موجودہ وقفہ صرف مہلت کا زمانہ ہے یا نہیں کہ ہمارا قانون کمزور ہے۔ اس لیے یہ اس کی گرفت میں نہیں آسکے۔ ہمارا قانون بڑی سخت گرفت کا مالک ہے ﴿ وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴾ (۶۸:۴۵) یہ کہتے ہیں یہ پاگل پن کی باتیں ہیں کہ تم اپنا سب کچھ دوسروں کو دے دو۔ اس سے تمہیں دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی۔ ان سے کہو کہ تھوڑی دیر انتظار کرو ﴿ فَسَتُبْصِرُ وَیُبْصِرُوْنَ بِاَیِّکُمُ الْمَفْتُوْنُ ﴾ (۶۸:۵-۶) تم بھی دیکھ لو گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ کون پاگل پن کی باتیں کرتا ہے۔ تم اس وقفے سے گھبراؤ نہیں۔ ہمارا قانون انہیں چاروں طرف سے گھیرے جا رہا ہے۔ ﴿ وَاللّٰہُ مِنْ وَّرَآئِھِمْ مُّحِیْطٌ ﴾ (۸۵-۲۰) اس لیے کہ وہ قانون ایسا نہیں جس پر ان کی تکذیبی کارروائیاں کچھ اثر کر سکیں۔ یا اس کے نقوش زمانہ کے تغیرات سے مٹ جائیں۔ وہ قانون ایسے محفوظ مقام میں رکھا گیا ہے جہاں زمانے کے اثرات پہنچ نہیں سکتے ﴿ بَلْ ھُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴾ (۸۵:۲۱-۲۲) (ن-ر-ص ۲۱۵)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ چونکہ قانون کی قوت بھی اللہ سے کم نہیں لہٰذا اللہ کا مفہوم "قانون" ہی ہوتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اگر واحد متکلم کا صیغہ استعمال فرمائیں تو اس کا مفہوم میرا قانون اور اگر جمع متکلم کا صیغہ استعمال فرمائیں تو اس کا مفہوم "ہمارا قانون" ہوتا ہے۔ گویا صیغہ کی تبدیلی قانون پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

۳۔ کَیْد کے معنی بھی قانون ہے۔

۴۔ قرآن مجید کا مفہوم بھی "قانون" ہی ہوتا ہے۔ اور لوح محفوظ کا معنی "محفوظ مقام" ہے گویا لوح کا معنی مقام ہے یہ قانون وہیں رہتا ہے۔

۵۔ نظام ربوبیت کے اپنے فائدے: اس نظام میں اس قسم کے (یعنی اتفاقی) حوادث کے لیے پہلے ہی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ ﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ﴾ (۵۷:۲۲) اس نظام میں اس قسم کے خارجی یا داخلی حوادث کے لیے ذخیرہ کر لینا کچھ دشوار نہیں ﴿ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ﴾ (۵۷:۲۲) یہ وہ نظام ہے جس میں کسی استعداد کے کم یا سلب ہو جانے سے انسان سامان نشوونما سے محروم نہیں رہ جاتا۔ ﴿ لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ ﴾ (۵۷:۲۳) اس لیے کہ جن کی استعداد زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اس استعداد کے ماحصل کو اپنی ملکیت نہیں سمجھ لیتے ﴿ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ ﴾ (۵۷:۲۳) یہ دشواری اس معاشرے میں پیش آتی ہے جہاں ہر شخص خود بڑا بننے کی فکر کرے اور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)


اس کے لیے دوسرے انسانوں کی کمائی پر اس طرح چپکے چپکے ہاتھ مارے جس طرح شکاری دبے پاؤں شکار کو جا دبوچتا ہے۔ (وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۵۷-۲۳) (ن-ر- ص ۱۵۷)

اب دیکھئے اس سورہ حدید کی مندرجہ بالا دو آیات کا سیدھا سادا ترجمہ یوں ہے۔

''کوئی مصیبت ملک پر اور خود تم پر نہیں آتی مگر ہمارے اس مصیبت کو پہنچانے سے پیشتر ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے اور یہ بات (پہلے لکھ رکھنا) اللہ کے لیے آسان کام ہے تاکہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اس پر افسوس نہ کرو۔ اور جو کچھ تمہارے ہاتھ لگ جائے اس پر اترایا نہ کرو۔ اور اللہ کسی دھوکے باز اور شیخی بگھارنے والے کو پسند نہیں کرتا''

اب دیکھیے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عقیدہ قضاء وقدر کا ذکر اور اس کا فائدہ بتایا ہے۔ اب پرویز صاحب نے اپنے مفہوم میں یہ کیا کہ۔

(۱) کتاب سے مراد گنجائش' ذخیرہ یا سٹور ہے۔ (۲) اللہ سے مراد نظام' ربوبیت ہے۔ (۳) فَاتَ سے مراد کم استعداد والا ہونا اور (۴) آتی سے مراد زیادہ استعداد والا ہونا اور (۵) وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ اور فخور کا کوئی مفہوم بیان نہیں فرمایا۔ پھر اس طرح چپکے چپکے اور دبے پاؤں عقیدہ قضا وقدر پر ایمان کو نظام ربوبیت پر ایمان لانے سے تعبیر کیا اور اس عقیدہ کے فوائد کو نظام ربوبیت کے کھاتے میں ڈال دیا اس طرح یہ ثابت کر دکھایا کہ نظام ربوبیت کے دو فائدے ہیں۔

① مصیبت کے وقت نظامِ ربوبیت کے پاس ذخیرہ ہوتا ہے۔ جس سے وہ مصیبت زدہ کی مدد کر سکتا ہے۔ اور:

② اس نظام میں زیادہ استعداد والا تھوڑی استعداد والے کی کمائی کو دبے پاؤں اور چپکے چپکے دبوچتا نہیں۔

**۶۔ نظام ربوبیت کا فلسفہ اور مزید فوائد:** ''وہ (قرآن) کہتا ہے کہ جن وانس اپنی پیدائش کے مقصد کو اسی صورت میں حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ قانون خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ (۵۱:۵۶) یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمام افراد نظام خداوندی سے منسلک ہو جائیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں نظام خداوندی کا کچھ اپنا فائدہ ہے' بالکل نہیں۔ اس لیے یہ نظام اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا ﴿ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴾ (۵۱-۵۷) یہ نظام افراد معاشرہ سے کچھ لینے کے لیے وجود میں نہیں آتا۔ خود ان کی پرورش اور قوت کا انتظام کرنے کے لیے وجود میں آتا ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴾ (۵۱:۵۸) وہ کھانے کو دیتا ہے مگر کھانے کے لیے لیتا نہیں ﴿ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ﴾ (۶-۱۴) وہ افراد سے عبودیت (یعنی اپنی صلاحیتوں کو نظام کے مقرر کردہ ضوابط کے مطابق صرف کرنے) کا مطالبہ اس لیے کرتا ہے کہ اس سے خود افراد کی ذات بھرپور جوانیوں تک پہنچ کر کامل اعتدال حاصل کر سکتی ہے۔ ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ (۱-۴) کا یہی عملی مفہوم

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



ہے۔" (ن۔ ر۔ ص ۱۸۵)۔

کچھ سمجھے آپ کہ ﴿ إِيَّاكَ نَعبدُ وإِيَّاكَ نستَعِين ﴾ کا عملی مفہوم کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ یہ نظام ربوبیت آپ سے جو کچھ لیتا ہے۔ اس سے نہ تو لیتا ہے اور نہ کچھ کھاتا ہے بلکہ الٹا آپ کو کھلاتا بھی ہے۔ قوت بھی دیتا ہے اور اپنے پاس کچھ رکھتا بھی نہیں۔ اب دیکھیے نظام تو محض قواعد وضوابط اور ان میں ربط وضبط کا نام ہے۔ جیسے عصبی نظام، عضلاتی نظام، نظام انہضام، گردش خون کا نظام، نظام سرمایہ داری، نظام معیشت وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ ایک بے شعور اور بے جان سی چیز ہے۔ اس کا کھانے کھلانے اور لینے دینے سے کیا تعلق؟ اگر اس سے مراد نظام حکومت یا نظام دین کا قیام ہے تو ظاہر ہے کہ یہ انسانوں پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ اور یہ انسان خود بھی ضرور کھائیں گے اور جب تک کچھ لیں گے نہیں وہ دیں گے کیا؟ لہٰذا یہ پرویزی تعبیر بیکار ہے۔ چنانچہ خود پرویز صاحب نے ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ کا "مفہوم القرآن" میں جو مفہوم بیان فرمایا ہے۔ وہ پہلے مفہوم سے بالکل مختلف ہے۔ لکھتے ہیں۔

"یہ نظام ان افراد کے ہاتھوں متشکل ہو گا جو اس حقیقت کبریٰ کا اعلان اور عملاً اس اعلان کی تصدیق کریں گے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہیں کرتے ہیں" (مفہوم القرآن ج ا ص ا۔ الف)

اب دیکھیے اس مفہوم میں نہ کہیں کھانے کھلانے اور لینے دینے کا ذکر ہے نہ ہی افراد کی ذات بھرپور جوانیوں تک پہنچ کر کامل اعتدال حاصل کرنے کا چکر ہے۔ لیکن اس کے باوجود دونوں مفہوم ایک ہی آیت کے ہیں۔ اور دونوں ہیں بھی صحیح علاوہ ازیں دونوں میں کچھ اقدار مشترک بھی ہیں۔ مثلاً دونوں میں نستعین کا معنی چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور دونوں میں عبادت اور عبودیت کا معنی وہ بتایا گیا ہے جو کہ اسلام کا ہے نہ کہ عبادت اور عبودیت کا۔

۷۔ <u>نظامِ ربوبیت کب اور کیسے آئے گا؟</u> : مندرجہ ذیل آیات اور اس کے مفہوم میں نظام ربوبیت کے تشریف لانے کا ذکر ہے۔ ذرا غور سے قرآن کے الفاظ اور اس کے مفہوم کو اور بالخصوص خط کشیدہ الفاظ کو ملاحظہ فرماتے جایئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آ بھی جائے اور آپ کو خبر بھی نہ ہو۔ فرماتے ہیں:

﴿ قَدْ خَسِرَ ٱلَّذِينَ كَذَّبُواْ بِلِقَآءِ ٱللَّهِ حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَتْهُمُ ٱلسَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُواْ يَٰحَسْرَتَنَا عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا ﴾ (الانعام ۶/ ۳۱)

یہ جماعت جو سمجھے بیٹھی تھی کہ خدا کے <u>قانون سے ان کا کبھی ٹکراؤ نہیں</u> ہو گا تباہ ہو کر رہے گی۔ حتیٰ کہ جب <u>انقلاب کی گھڑی</u> دفعتاً نمودار ہو جائے گی تو وہ کف افسوس مل کر کہیں گے کہ اس باب میں جو کچھ ہماری طرف سے ہوتا رہا اس پر ہمیں ندامت ہے۔

﴿ وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ۚ أَلَا سَآءَ مَا يَزِرُونَ ﴿٣١﴾ ﴾ (الانعام ۶/ ۳۱)

لیکن ان کی یہ پشیمانی اس وقت ہوگی جب ان کے اعمال اپنا نتیجہ مرتب کر چکے تھے ان کے اعمال کس قدر ناہمواریاں پیدا کرنے والے تھے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس وقت وہ دیکھیں گے کہ قریبی مفاد پرستی کا نظریہ کس طرح بچوں کا کھیل اور سعی لاحاصل تھا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنی جدوجہد کو خدا کے قانون ربوبیت کے ہم آہنگ رکھا ان کے مستقبل کی زندگی کس قدر منفعت بخش ثابت ہوگی۔ اے کاش یہ لوگ اس حقیقت کو پہلے سمجھ لیتے۔ (ن۔ ر ص ۲۴۶)۔

اب دیکھئے قطع نظر دوسرے مفاہیم کے ایک مفہوم تو بڑا واضح ہے کہ السَّاعۃُ سے مراد نظام ربوبیت کے تشریف لانے کا دن ہے۔ اب اس دن ہوگا کیا؟ یہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"جس انقلاب عظیم کے متعلق تمہیں کہا جا رہا ہے وہ آکر رہے گا (۲۰۱:۲۲) اس وقت یہ تمام سرکش اور متمرد ارباب اقتدار جو اس وقت اس نظام کی مخالفت میں اس قدر زوروں پر ہیں۔ خاسر وناکام' بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگیں گے (۴۲:۱۴ تا ۵۲) ان سے کہا جائے گا کہ اب کہاں بھاگ رہے ہو؟ (۲۳:۲۱) اب کہیں پناہ نہیں مل سکتی (۱۱:۷۵) اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے تمہارا اعمال نامہ جو اس وقت اس انقلاب کے رنگ میں بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے آیا ہے (۲۷:۴۵) اس وقت ان کی یہ حالت ہو جائے گی جیسے کٹے ہوئے کھیت یا بجھے ہوئے کوئلے (۱۴:۲۱) پھر ان پر نہ آسمان روئے گا نہ زمین۔ صف ماتم بچھ جائے گی (۲۹:۴۴) اور نہ ہی ہم متاسف ہوں گے (۱۵:۹۱) لہٰذا ان سے کہو کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے اس پر ہنسو نہیں بلکہ خون کے آنسو روؤ (۶۰:۵۲) کہ یہ مقام رونے ہی کا ہے۔" (ن۔ ر۔ ص ۲۴۹۔۲۵۰)

مندرجہ بالا چند سطور کے اقتباس آٹھ مختلف سورتوں کی آیات کو جس بھونڈے طریقے سے جوڑ کر قیامت کے مناظر کو "نظام ربوبیت کے یوم انقلاب" پر فٹ کیا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر کسی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا

اب کچھ مزید مناظر بھی ملاحظہ فرمایئے۔

۸۔ نظام ربوبیت کے انقلاب کا دوسرا منظر: "یہ فطرت کا اٹل فیصلہ ہے جسے واقع ہو کر رہنا ہے۔ جو بڑی بڑی طاقتیں نظام ربوبیت کی راہ میں حائل ہوں گی۔ انہیں اس طرح راستے سے ہٹا دیا جائے گا جس طرح تیز و تند ہوا بڑے بڑے تناور درختوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہے۔ ﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴾ (۱۰۵:۲۰) اور اس کے بعد میدان صاف ہو جاتا ہے۔ ﴿ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴾ (۱۰۶:۲۰) جس میں نہ کوئی ٹیڑھ پن باقی رہتا ہے۔ نہ اونچ نیچ ﴿ لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴾ (۱۰۷-۲۰) ان سے اس طرح میدان صاف کر دینے کے بعد انسانیت کا وہ گروہ عظیم جو آج تک اسے بری طرح کچلا جا رہا ہے (یعنی مزدور طبقہ۔ مولف) ابھر کر اوپر آجائے گا۔ ﴿ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ﴾ (۴۷:۱۸) (ن۔ ر۔ ص ۲۷۸)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ:

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



① جبال کے معنی نظام ربوبیت کی مخالف قوتیں ہیں جو بڑی بڑی ہی ہوتی ہیں۔ چھوٹی نہیں ہو سکتیں۔

② ارض کے معنی "بری طرح سے کچلا ہوا طبقہ" ہے۔

③ قرآن میں جو قیامت کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ یہ فی الحقیقت نظام ربوبیت کے انقلاب کے مناظر ہیں۔ کیونکہ الساعۃ کا یہی عملی مفہوم ہے۔

④ بارزۃ کا معنی کھلے میدان میں سامنے آنا نہیں بلکہ ابھر کر اوپر جانا ہے۔

سو یہ تھے وہ مختلف طریقے اور حربے جن کو استعمال کرنے کے بعد آپ نے اس نظام ربوبیت کو قرآن سے ثابت فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر تحریف پرویز صاحب نے فرمائی ہے اس سے یہ قرآن وہ قرآن رہتا ہی نہیں جو باقی تمام امت مسلمہ سمجھتی ہے یا جسے بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو آپ سے ایسی اندھی عقیدت ہو جو آپ کی ہر طرح کی تاویلات کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ لیکن وہ شخص جو تھوڑی بہت بھی عربی سمجھتا ہو' ایسی خرافات کو قبول کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



حصہ سوم

# قرآنی مسائل

(قرآنی فیصلے کے جواب میں صرف اِن مسائل سے تعرض کیا گیا ہے جن کا جواب دینا ضروری تھا)

## فہرست ابواب


۱ قرآنی نماز
۲ قرآنی زکوٰۃ و خیرات
۳ قربانی
۴ اطاعتِ والدین
۵ ناسخ و منسوخ
۶ عذابِ قبر
۷ ترکہ اور وصیت
۸ یتیم پوتے کی وراثت
۹ تلاوتِ قرآن پاک
۱۰ نکاحِ نابالغاں
۱۱ تعدّدِ ازواج
۱۲ غلام اور لونڈیاں
۱۳ رجم اور حد رجم

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ① قرآنی نماز

پرویز صاحب نے اپنے کسی مضمون میں لکھا کہ زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی شرح چونکہ قرآن نے متعین نہیں کی۔ لہٰذا رسول اللہ کے بعد قرآنی معاشرہ یا قرآنی حکومت یہ حق رکھتی ہے کہ اس کی جزئیات متعین کرے۔ اس پر کسی مستفسر نے سوال کیا کہ قرآن نے تو نماز کی جزئیات بھی متعین نہیں کیں۔ نہ کہیں نمازوں کی تعداد کا ذکر ہے نہ اوقات کا' نہ ترکیب نماز کا' نہ تعداد رکعت کا' تو کیا یہ جزئیات بھی قرآنی معاشرہ ہی متعین فرمائے گا؟

نماز اور تواتر کا سہارا: اس کے جواب میں پرویز صاحب نے فرمایا کہ "زمانہ کے تقاضے زکوٰۃ پر تو اثر انداز ہو سکتے ہیں لیکن نماز پر یہ تقاضے اثر انداز نہیں ہوتے آخر وہ کونسی ضرورت اس بات کی مقتضی ہوگی کہ رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم کی جگہ سُبْحَانَ اللّٰہِ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ پڑھا جائے یا دو سجدوں کی بجائے صرف ایک سجدہ کیا جائے۔ لہٰذا جو اعمال ملت میں تواتر سے چلے آرہے ہیں انہیں علی حالہ رہنے دیا جائے گا۔ البتہ جن جزئیات میں مختلف فرقوں میں اختلاف ہے قرآنی معاشرہ ان کو بتدریج ختم کر دے گا۔ تاہم اگر یہ قرآنی حکومت ان مسلمہ جزئیات (یعنی نمازوں کی تعداد رکعات کی تعداد' اوقات نماز اور ترکیب نماز) میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرے تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہوگی۔

(قرآنی فیصلے' صفحہ: ۱۲ تا ۱۴' ملخصاً)

اب سوال یہ ہے کہ یہ قرآنی حکومت ماضی میں کبھی قائم ہوئی بھی تھی یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ طلوع اسلام کے خیال کے مطابق ایسی قرآنی حکومت کا امکان اگر ہو سکتا ہے تو ملوکیت سے پہلے یعنی خلافت راشدہ کے دور میں ہی ہو سکتا ہے۔ وفات النبی کے بعد تیس سال کے اس دور میں زمانے کے تقاضے بھی بہت بدل چکے تھے۔ سلطنت اسلامیہ میں دس گنا وسعت پیدا ہو چکی تھی اور لاتعداد نئے محکمے بھی قائم ہو چکے تھے۔ تو کیا اس دور میں قرآنی حکومت نے اپنے اس اصولی حق کو کبھی استعمال بھی کیا تھا ہم اس سوال کو اور زیادہ آسان بنا دیتے ہیں اور اسے صرف نماز تک ہی محدود نہیں رہنے دیتے۔ بلکہ یہ پوچھتے ہیں کہ نماز کا معاملہ ہو یا زکوٰۃ کا' حج کا ہو یا روزہ کا قصاص کا ہو یا دیت کا' جنگ کا ہو یا صلح کا' ہمیں کوئی ایک مسئلہ ایسا بتایا جائے جس میں اس قرآنی حکومت نے اپنا یہ اصولی حق استعمال کرتے ہوئے حسب اقتضآت زمانہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



تبدیلی کی ہو؟ اور اسے امت نے گوارا کر لیا ہو؟

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ تواتر آخر کب سے شروع ہوا؟ اگر اس تواتر کا تعلق دور نبوی ﷺ سے شروع ہوتا ہے۔ اور دور نبوی ﷺ کے بعد کی قرآنی حکومتوں نے بھی اس میں کوئی رد وبدل نہیں کیا۔ تو آئندہ یعنی مستقبل میں اگر کبھی پرویز صاحب کی مزعومہ قرآنی حکومت قائم ہو بھی جائے تو وہ ایسے ردو بدل کی اصولاً مجاز کیسے بن جائے گی؟ اس اصول کے لیے آخر کوئی دلیل یا نظیر بھی تو درکار ہے۔

اور تیسرا سوال یہ ہے کہ نماز کے قیام کا حکم آغاز نبوت میں ہی نازل ہوا تھا۔ سورہ ماعون جس کا ترتیب نزول کے لحاظ سے نمبر ۱۷ ہے اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴾ (۱۰۷-۵) یعنی نماز کی ادائیگی کا حکم اس وقت دیا گیا جب کہ نہ ابھی قرآنی حکومت قائم ہوئی تھی اور نہ مشورہ کا حکم نازل ہوا تھا (مشورہ کا حکم پہلی بار سورہ شوریٰ میں نازل ہوا جس کا ترتیب نزول کے لحاظ سے نمبر ۶۲ ہے نہ ہی نماز ادا کرنے کی ترکیب قرآن میں کہیں نظر آتی ہے۔ پھر یہ نماز کی ترکیب رسول اللہ ﷺ نے کس حیثیت سے اختیار فرمائی تھی؟ نماز کی ابتدا میں قیام ہو پھر رکوع ہو' پھر سجدہ ہو' پھر جلسہ ہو پھر دوسرا سجدہ ہو یا یہ کہ ایک رکعت میں رکوع تو ایک بار ہی ہونا چاہیئے لیکن سجدہ دو بار پھر یہ کہ ہر نماز میں رکعات کی تعداد اتنی ہونی چاہیئے' نمازیں شروع کرنی چاہیئے اور اس طریقہ سے ختم ہونی چاہیئے۔ یہ تمام باتیں آپ نے اپنی مرضی سے اختیار فرمائی تھیں یا کسی آسمانی ہدایت کے تحت؟ پھر آپ کے بعد ملوکیت سے پہلے کی قرآنی حکومتوں نے نماز کی جزئیات میں کوئی ردوبدل کیا تھا؟

**نمازوں کی تعداد:** پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ:

"یہاں ایک مولوی صاحب سے ذکر کیا گیا کہ وحی صرف قرآن شریف میں ہے۔ تو انہوں نے فرمایا اگر تم وحی خفی کے منکر ہو تو بتاؤ کہ قرآن میں پانچ وقت کی نمازوں کا ذکر کہاں ہے؟ ان کا ارشاد ہے کہ یہ وقت رسول اللہ ﷺ نے وحی خفی کی بنیاد پر مقرر فرمائے تھے۔" (قرآنی فیصلے ص ۱۵)

اب اس بناوٹی سوال کے جواب میں پرویز صاحب نے بخاری سے معراج والی حدیث کا ترجمہ درج کر کے جس میں پانچ نمازوں یعنی تعداد کی فرضیت کا ذکر ہے۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ یہ حدیث وضعی ہے اور کسی یہودی کی گھڑی ہوئی ہے۔ اور اس نے یہ وضع اس لیے کی کہ موسیٰ علیہ السلام کی حضرت رسول اکرم ﷺ پر فضیلت ثابت ہو سکے۔ اور نیز یہ کہ اس نمازوں کی تعداد والی وحی خفی کی یہی کچھ حقیقت ہے۔ (ق-ف ص ۱۵ تا ۱۸ ملخصاً)

ہم بقول پرویز صاحب یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ روایت وضعی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ:

(۱) جب اس دور میں حدیث کو حجت تسلیم ہی نہیں کیا جاتا تھا جیسا کہ طلوع اسلام اکثر پرچار کرتا رہتا ہے۔ تو اس یہودی کو یہ روایت گھڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ آخر کھوٹے سکے کو کون قبول کرتا ہے؟

(۲) یہ روایت تو ہوئی وضعی اور قرآن میں نمازوں کی تعداد بتائی نہیں گئی۔ پھر یہ پانچ نمازیں آکدھر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



سے گئیں جن پر امت ایسے چل پڑی کہ آج تک اس تعداد کو سینے سے لگائے پھر رہی ہے؟

(۳) مولوی صاحب کا اصل سوال یہ تھا کہ قرآن میں پانچ نمازوں کا کہیں ذکر ہے؟ یہ سوال تو جوں کا توں ہی رہا۔ مولوی صاحب نے اصل سوال یہ تو نہیں کیا تھا کہ ذرا وحی خفی کی حقیقت پر روشنی ڈال دیجیے! جو پرویز صاحب نے اپنا سارا رخ اس طرف موڑ دیا۔ اور جہاں تک اصل سوال کا تعلق تھا۔ اس کے متعلق فرمایا کہ "یہ تو ہم پھر کبھی عرض کریں گے کہ نماز کے متعلق قرآن میں کیا کچھ ہے۔ سردست آپ اتنا دیکھیے کہ وحی متلو کی حقیقت کیا ہے (ایضاً ص۱۶) مگر ہمیں افسوس ہے کہ پرویز صاحب نے بعد میں کبھی یہ نہیں بتایا کہ قرآن کی رو سے نمازوں کی تعداد کیا ہے؟

**قیامِ صلوٰۃ کا مقصد:** کسی صاحب نے پرویز صاحب سے پوچھا کہ:

(۱) آپ کے پیش کردہ نظام صلوٰۃ میں اس صلوٰۃ کا کیا مقام ہوگا جسے موقت فریضہ کہا گیا ہے؟

(۲) آپ خود کس طرح نماز پڑھتے ہیں۔ (ایضاً ص۱۹)

اب پہلے سوال کے جواب میں آپ نے اپنے مخترعہ نظام ربوبیت کی کچھ تفصیلات پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ قوانین خداوندی نے اس کا انتظام کر رکھا ہے کہ اس نظام (ربوبیت) کی بار بار یاد دہانی کرائی جائے تاکہ اس کے اصول و مبانی اجاگر ہوتے رہیں اور اس کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے اس یاد دہانی کا نام صلوٰۃ کا فریضہ موقت ہے یعنی خاص اوقات کا اجتماع۔" (ایضاً ص۲۱)

اب دیکھئے یہ عجیب قسم کی منطق ہے کہ پرویز صاحب جس نظام ربوبیت کے قیام کو اصل مقصد دین قرار دے رہے ہیں اس کا تو قرآن کریم میں کہیں ذکر تک نہیں اور جس چیز (نماز) کو آپ فقط نظام ربوبیت کی یاد دہانی کا ذریعہ قرار دے رہے ہیں۔ اس کا ذکر قرآن کریم نے کم و بیش سات سو مرتبہ کر دیا۔

پرویز صاحب یہ بتانے سے پھر پہلو تہی فرما گئے یہ خاص اوقات اجتماع دن میں کتنی بار ہونے چاہئیں جو اس نظامِ ربوبیت کی یاد دہانی کے لیے قائم کیے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ تو اقامت صلوٰۃ کا مقصد یہ بتاتے ہیں کہ ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ (۲۰-۱۴) یعنی نماز میری یاد کے لیے قائم کرو لیکن پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ کا مقصد ان کے مخترعہ نظام ربوبیت کے اصول و مبانی کی یاد دہانی ہے۔

**صلوٰۃ کے دوسرے مفہوم:** صلوٰۃ کا پہلا مفہوم "نظام ربوبیت کے اصول و مبانی کی یاددہانی کا اجتماع ہے" اب دوسرے مفہوم ملاحظہ فرمائیے' فرماتے ہیں:

(۲) صفات خداوندی کو بطور معیار سامنے رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے چلنا یا کتاب اللہ کے ساتھ پوری پوری وابستگی سے اپنے اندر صفات خداوندی کا منعکس کرتے جانا صلوٰۃ ہے" اب اس مفہوم کی رو سے اجتماع قائم کرنے کی چھٹی مل گئی۔ اب تیسرا مفہوم دیکھئے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



(۳) "الصلوٰۃ صراط مستقیم پر چلنے کا نام ہے" جس کے متعلق فرمایا:

﴿ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٥٦﴾ ﴾ "میرے نشوونما دینے والے کا قانون ربوبیت خود متوازی راہ پر چل رہا ہے۔" (ھود ۱۱/ ۵۶)

اس (قانونِ ربوبیت) کے پیچھے پیچھے تم بھی چلتے جاؤ۔ مصلّی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو گھڑ دوڑ میں پہلے نمبر پر آنے والے گھوڑے کے بالکل پیچھے پیچھے ہو جو ادھر ادھر کی راہوں پر نکل جائے وہ مصلّی نہیں" سلیم کے نام تیرہواں خط ص۴۰۹۔ (ن-ر- ص۱۶۰)

اب دیکھئے مندرجہ بالا آیت کے ترجمہ میں پرویز صاحب نے قانون ربوبیت کے الفاظ اپنی طرف سے شامل کر کے بے جان قانون کو متوازی راہ پر چلا دیا۔ پھر تمام مصلین کو اس بے جان قانون ربوبیت کے پیچھے پیچھے لگا دیا۔ اب جو شخص اس قانون ربوبیت سے ادھر ادھر کی راہ اختیار کرے گا وہ مصلّی نہیں بلکہ کسی اور قسم کا گھوڑا ہے۔

(۴) قرآنی اصطلاحات کے ضمن میں اقام الصلوٰۃ کا مفہوم یوں بیان فرمایا کہ:

"معاشرہ کو ان بنیادوں پر قائم کرنا جن پر ربوبیت نوع انسانی (رب العالمین) کی عمارت استوار ہوتی ہے۔" "قلب و نظر کا وہ انقلاب جو اس معاشرہ کی روح ہے۔" (ن-ر- ص۸۷)

اس مفہوم کی رو سے نہ آپ کو گھوڑا بننے کی ضرورت ہے۔ نہ اصول و مبانی کے یاددہانی کے اجتماعات کی۔ نہ صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر منعکس کرنے کی بس قلب و نظر میں نظام ربوبیت کے لیے انقلاب پیدا کر لیجیے تو آپ کی صلوٰۃ ادا ہو گئی۔ اور:

(۵) پانچواں مفہوم یوں بیان فرمایا کہ:

۱۔ نظامِ صلوٰۃ کیا ہے؟ اس کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ لیکن قرآن کریم نے اس تمام تفصیل کو سمٹ سمٹا کر ایک فقرہ میں رکھ دیا ہے یعنی۔

﴿ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ ٱلْمِسْكِينَ ﴿٤٤﴾ ﴾ "ہم مساکین کے رزق کا اہتمام نہیں کرتے۔" (المدثر ۷۴/ ۴۴) (سلیم کے نام سولہواں خط ص ۱۷۴، ن-ر ص۱۶۲)

زندہ باد! اب دیکھئے آیت بالا کا سیاق و سباق یہ ہے کہ قیامت کے دن اہل جنت جہنم والوں سے پوچھیں گے کہ تم کس وجہ سے دوزخ میں پڑے؟ تو وہ چار باتیں بتائیں گے: (۱) وہ نماز نہیں پڑھتے تھے (۲) مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے (۳) اہل باطل کے ساتھ مل کر حق بات کو جھٹلاتے تھے اور (۴) اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔ اب پرویز صاحب نے پچھلے دو جرائم کا تو ذکر ہی چھوڑ دیا۔ اور پہلے جرم کو دوسرے میں ضم کر کے نماز نہ پڑھنے کی شرح یہ فرمائی کہ وہ مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے گویا لم نک من المصلین کا مطلب ہوا ولم نک نطعم المسکین۔

اس مفہوم کی رو سے اقام الصلوٰۃ کا مفہوم مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہاں نہ اصول و مبانی کی یاد دہانی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



کے اجتماع کی بات ہے نہ دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کی۔ نہ صفات خداوندی کو منعکس کرنے کی نہ قلب و نظر کے انقلاب کی ؎

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا

**قیام صلوٰۃ اور طہارت؟:** اس مفسر قرآن کی یہ سب تفسیریں بجا لیکن اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ مسکینوں کو کھانا کھلانے' صفات خداوندی کو منعکس کرنے' قلب و نظر میں انقلاب لانے۔ قانون ربوبیت کے مصلی بننے یا نظام ربوبیت کے اجتماعات کے لیے وضو یا طہارت' اور مساجد میں ہی اکٹھا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

**امام کا تقرر کیوں؟:** پھر فرماتے ہیں کہ:

"جب یہ اجتماع (صلوٰۃ) اپنے میں سے سب سے بہتر فرد کو بہ حیثیت امام چن لیتا ہے۔ اور بہتر ہونے کا معیار یہ ہوتا ہے کہ کس کی زندگی سب سے زیادہ قانون خداوندی سے ہم آہنگ ہے۔ یہی امام اس اجتماع کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس ایک کی آواز پر سب کو اٹھنا ہوتا ہے۔ اور اسی کی آواز پر جھکنا' اور یہ جھکنا اور اٹھنا ایک ساتھ ہوتا ہے جو شہادت دیتا ہے اس حقیقت کبریٰ کی کہ اس جماعت کے افراد میں کامل ہم آہنگی فکر و عمل ہے(" (ص ۲۱)۔

یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن میں نہ امام بنانے کا ذکر' نہ اس کی قابلیت کا نہ اس کی آواز پر جھکنے یا کھڑا ہونے کا تو پھر یہ سب کچھ غیر قرآنی عمل ہوا ان باتوں کو قیام صلوٰۃ کے فریضہ میں ضروری کیوں قرار دیا گیا ہے۔ اور ضروری بھی ایسا کہ اس سے جماعت میں ہم آہنگی فکر و عمل کا ثبوت ملتا ہے اور اس سے معاشرہ کی ناہمواریاں مٹتی ہیں۔

**رکوع و سجود کا مقصد اظہار جذبات ہے:** پرویز صاحب نے اس یاددہانی نظام ربوبیت میں رکوع و سجود کا مقصد یہ بتایا کہ جس طرح کوئی مقرر اپنے جذبات کے اظہار کے لیے تقریر کے دوران اپنے بعض اعضاء کو حرکت دیتا اور اس پر مجبور ہوتا ہے۔ بعینہ یہی صورت اجتماع صلوٰۃ کی ہے۔ اور بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی چپ چاپ بیٹھا کسی گہری سوچ میں پڑا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا سر اور ہاتھ پاؤں مختلف قسم کی حرکات میں مصروف ہوتے ہیں۔ انہی حرکات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قسم کے خیالات میں مستغرق ہے۔ اجتماع صلوٰۃ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ان کے (یعنی نظام ربوبیت کی یاد دہانی کے) ابھر کر سامنے آنے سے افراد جماعت کے سینوں میں جذبات کا تلاطم ناگزیر ہے۔ قیام رکوع و سجود انہی جذبات کے متحرک آئینے ہیں۔ لیکن اس میں اظہار جذبات بھی نظم و ضبط کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو اس معاشرہ کی بنیادی خصوصیت ہے۔" (ایضاً ص ۲۳)

اب دیکھئے اس اقتباس میں پرویز صاحب یہ سمجھا رہے ہیں کہ نماز کی ترکیب بذریعہ وحی نہیں سکھلائی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



گئی تھی۔ بلکہ اظہار جذبات اور جذبات کے تلاطم کے زیر اثر از خود انسان سے ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ جو باتیں پرویز صاحب نے پیش فرمائی ہیں۔ وہ مشاہدہ کے خلاف ہیں مثلاً:

① کوئی مقرر خواہ کتنا ہی جوش سے تقریر کر رہا ہو اور کتنا ہی جذبات کا تلاطم اس کے سینہ میں موجزن ہو وہ نہ تو کبھی رکوع کرتا ہے اور نہ ہی کبھی سجدے میں گرتا ہے۔

② گہری سوچ میں پڑا ہوا آدمی ہاتھ پاؤں اور سر کو کوئی حرکت نہیں دیتا اور اگر کوئی حرکت اس سے سرزد ہو بھی تو اس سے قطعاً یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس قسم کی سوچ میں مبتلا ہے؟ یہ اس سے پوچھنا ہی پڑتا ہے۔

③ جو یاد دہانی ہر روز دن میں متعدد مرتبہ کی جائے اس میں جذبات یا جذبات کا تلاطم رہتا ہی کب ہے؟ جذبات ہمیشہ وقتی اور ہنگامی قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ اور عقل کی گرفت ان پر ڈھیلی ہوتی ہے۔

④ سب انسانوں کے جو اجتماع میں شامل ہوں گے جذبات کا یکساں ہونا ناممکن ہے۔ اور اگر مکمل یکسانیت پائی جائے تو وہ جذبات نہیں کچھ اور ہی چیز ہو سکتی ہے۔

**تاج محل:** پھر فرماتے ہیں۔ "آپ نے دیکھ لیا کہ اجتماع صلوٰۃ درحقیقت پورے کے پورے نظام دین کی سمٹی ہوئی شکل ہے۔ اس نگینے میں پورا "تاج محل" جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک سپاہی کی ساری زندگی سپاہیانہ نظام کے مطابق گزرتی ہے لیکن اس کے باوجود اسے بطور یاد دہانی کچھ وقت پریڈ (فوجی نظام کی مشق) بھی کرائی جاتی ہے۔ یہ پریڈ مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اب فرض کیجیے کسی جگہ نہ دینی مملکت رہے نہ فوجی نظام۔ لیکن کچھ لوگ گزشتہ ادوار کی یاد میں کسی جگہ اکٹھے ہو کر اپنے اپنے ہاں بندوق کی جگہ لکڑی اپنے ہاتھ میں لے کر پریڈ کی نقل کرتے رہیں۔ تو اس سے جو حاصل ہوگا وہ ظاہر ہے۔ یاد رکھئے کہ میں نے یہ چیز محض سمجھانے کے لیے بطور مثال لکھی ہے یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ میں نے صلوٰۃ کو پریڈ قرار دے دیا ہے۔" (ایضاً ص ۲۵)۔

آپ نے اس نظام ربوبیت کی یاد دہانی کے لیے فوجی نظام اور فوجی نظام کی یاد دہانی یا پریڈ کی مثال بیان فرمائی جو آپ کے نظریہ کے مطابق بالکل درست بیٹھتی ہے۔ لیکن بعد میں آپ اس سے انکار بھی فرما رہے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ جب قرآنی نظام قائم ہی نہ ہو تو صلوٰۃ کا کچھ فائدہ ہوتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ اور بہت ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آغاز نبوت میں نماز کا حکم تو دے دیا تھا جب کہ قرآنی نظام مدنی دور میں قائم ہوا تھا۔ مکی زندگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس قرآنی نظام کی یاد دہانی میں یہ نماز ادا (یا پریڈ) کیا کرتے تھے۔

**صلوٰۃ اور نماز کا فرق:** پھر فرماتے ہیں کہ جب قرآنی نظام (جو آپ کے ذہن کی پیداوار ہے۔ نظام ربوبیت) ملوکیت کی وجہ سے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تو عجمی تصورات نے اس نظام کی جگہ لے لی۔ اور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



نظام صلوٰۃ کی جگہ نماز نے۔ مجوسیوں کے ہاں پرستش کو نماز کہتے تھے۔ یہ لفظ بھی انہی کے ہاں کا ہے۔ پھر اس بات کی وضاحت یوں فرمائی کہ "صلوٰۃ یعنی نظام دین کی سمٹی ہوئی شکل جس سے مقصود اس نظام خداوندی کے خدوخال اور اغراض وغایات کو بار بار ذہن میں نمایاں اور دل میں منقوش کرنا تھا۔ اس کے برعکس نماز خدا کی پرستش کی رسم ہے۔ جو ہر مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور پارسیوں کے ہاں اس کا نام تک بھی یہی ہے" (ایضاً ص ۳۷)

دیکھا آپ نے کس طرح ایک فاسد نظریہ پر دوسرا فاسد نظریہ اٹھایا جا رہا ہے۔ پہلے آپ یہ تسلیم کیجیے کہ صلوٰۃ فی الواقع کوئی مقصود بالذات شے نہیں۔ پھر یہ تسلیم کیجیے کہ یہ جھلمل کرتے ہوئے تاج محل کی یاد دہانی کا ذریعہ ہے۔ اس کا خدا کی یاد سے چنداں تعلق نہیں۔ اگر آپ یہ سب کچھ تسلیم کر لیں گے، تو آپ اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ خدا کی پرستش کے ایسے تمام طریقے جو خدا کی یاد کے لیے دوسرے مذاہب میں ہیں۔ سب غلط ہیں کیونکہ یہ جھلمل جھلمل کرتے ہوئے تاج محل کی یاد دہانی نہیں کراتے۔ اور پارسیوں کا خدا کی پرستش کا طریقہ تو خاص طور پر غلط ہے کیونکہ اس کا نام بھی نماز [1] ہی ہے۔

اب یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔

① جس نظامِ ربوبیت کی یاد دہانی کے لیے دن میں کئی بار (؟) اجتماع کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اس نظام کے خدوخال ذہن میں محفوظ اور دل پر منقوش ہوں تو اس یاد دہانی کے لیے کونسی عبارت یا کونسی قرآنی آیات تجویز کی گئی ہیں۔ مثلاً قرآن میں اگر معجزات انبیاء کا ذکر چل رہا ہو۔ یا آدم کے بیٹوں اور قتل کا ذکر کیا جا رہا ہو۔ یا معوذتین کا ذکر ہو تو اس سے نظام ربوبیت کی یاد دہانی کیسے ہوگی؟

② مسلمانوں اور پارسیوں کے طریق عبادت میں قدر مشترک صرف "نماز" کا لفظ ہے۔ لہٰذا پرویز صاحب کے نزدیک یہ دونوں ایک ہی سطح پر آگئے کیا پارسی اسی طرح نماز کا تکبیر تحریمہ سے آغاز کرتے۔ پھر رکوع و سجود کرتے۔ امام مقرر کرتے، اور نماز کو ختم کرتے ہیں جس طرح مسلمان کرتے ہیں۔ اور جو کچھ مسلمان پڑھتے ہیں کیا پارسی بھی وہی کچھ پڑھتے ہیں؟ مسلمان خدا کی ہستی اور نظریہ توحید کے قائل اور خدا ہی کی پرستش کرتے ہیں کیا مجوسی خدا کو پوجتے ہیں یا آگ کو؟ ان کے ہاں خدا ایک ہے یا دو؟ ان تمام اختلافات کے علی الرغم یہ کس قدر ڈھٹائی ہے کہ پرویز صاحب مجوسیوں کی نماز اور مسلمانوں کی نماز کو ایک ہی چیز سمجھ رہے ہیں۔ محض اس لیے کہ نماز کا نام مشترک ہے۔

**پرویز صاحب کی نماز:** مستفسر کا دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ نماز کس طرح پڑھتے ہیں۔ اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ:

---

[1] نماز کا لفظ غیر قرآنی سہی مگر کیا نظامِ ربوبیت قرآنی لفظ ہے جس کی یاد دہانی نماز کے ذریعہ کرائی جا رہی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



"میں بھی اسی طرح نماز پڑھتا ہوں جس طرح جمہور مسلمان (فقہ حنفی کے مطابق) نماز پڑھتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ اگر کہیں فقہ حنفی کے علاوہ دیگر طریق پر بھی نماز ہو رہی ہو تو ان کے ساتھ شامل ہو جانے میں بھی توقف نہیں کرتا۔ یہاں آپ کے دل میں سوال پیدا ہو گا کہ میں ایک طرف تو موجودہ نماز کو ایک بے روح رسم پرستش قرار دیتا ہوں اور دوسری طرف اس رسم کا خود بھی پابند ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک نماز بے روح اور بے نتیجہ ہونے کے باوجود دین کے اجزاء ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا قومی شعار سا بن گئی ہے۔ چونکہ میں بھی انہی میں سے ایک ہوں اور اپنے آپ کو نہ ان سے الگ سمجھتا ہوں نہ برتر۔ لہٰذا میں ان سے الگ ہٹ کر کوئی "نیا مذہب" ایجاد نہیں کرنا چاہتا میں اسی درماندہ کارواں کا ہم سفر ہوں" (قرآنی فیصلے ص ۳۲)

پرویزی نماز نہیں پڑھتے: اب دیکھئے اس اقتباس سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں: ① آپ واقعی نماز پڑھتے ہیں۔ اور پڑھتے بھی فقہ حنفی کے مطابق ہیں (غالباً اس لیے یہ فرقہ ہمارے ہاں اکثریت میں ہے یا شاید اس لیے اکثر معتزلہ حنفی ہی تھے۔) اب یہ تو آپ کا زبانی دعوی ہے لیکن مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نہ آپ خود نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی آپ کی جماعت۔ یہ بات ہم اپنی زبان سے نہیں کہتے بلکہ نمائندہ ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی کی ایک رپورٹ پیش کرتے ہیں۔ اس رپورٹ میں نمائندہ مذکور نے بزم طلوع اسلام کراچی کی عید ملن پارٹی اور اس میں قیام صلوٰۃ کے اہتمام کا نقشہ کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

"دور کہیں مغرب کی نماز ہوا کی۔ لیکن ہال میں سگرٹوں کا دھواں اور لاؤڈ سپیکر کی گونج اور محمد اسلام صاحب (نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی) کی گھن گرج قرآنی فکر کے راستے ہموار کرتی رہی۔ اس کے بعد حیات النبی صاحب نے کہ وہ بھی ایک پرانے رفیق بزم کے ہیں۔ تقریر دلپذیر کی اور لوگوں کو قرآنی دعوت کی طرف بلایا۔ جلسہ جاری رہا کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا تھا کہ ایک حضرت' نام جن کا محمد شفیع تھا' مائک کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "صاحبو! میرے ساتھ دو تین آدمی اور بھی آئے ہیں۔ میں انہیں قرآنی فکر سے روشناس کرنے کے لیے لایا تھا۔ لیکن ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ جناب پرویز کے ماننے والے نماز نہیں پڑھتے" اب تو ہمیں بھرے جلسے میں اس بات کا ثبوت مل گیا ہے۔ بتائیے اب میں ان دوستوں کو کیا جواب دوں؟ اس پر تو اسلام صاحب بہت چکرائے۔"

انہوں نے اپنے اسلام کو بچانے کے لیے سات بجے یعنی نماز مغرب کے ٹھیک سوا گھنٹے بعد نماز کا وقفہ یوں کہہ کر کیا کہ:

"ہمیں بڑا افسوس ہے کہ ایسا ہوا اب آپ حضرات نماز پڑھ لیں۔ خواہ قضا ہی سہی" جلسے کی کارروائی دس منٹ کے لیے ملتوی ہوئی' اسی اللہ کے بندے محمد شفیع نے نماز باجماعت کا بندوبست کیا اور کل پانچ آدمیوں نے کہ ان میں سے ایک بھی بزم طلوع اسلام کا نمائندہ نہیں تھا۔ نماز پڑھی بزم

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



طلوع اسلام کے اراکین قرآنی گتھیاں سلجھاتے رہے اور محمد شفیع نماز پڑھاتا رہا۔ میں نے سوچا کہ صاحبو! کہ یہ قرآنی فکر بھی خوب ہے اگر صحابہ اس زمانہ میں ہوتے تو قرآن کی پیروی ان کے لیے کتنی آسان ہوتی۔ نہ انہیں راتوں کو قیام کرنا پڑتا اور نہ نماز پنجگانہ کے جھنجھٹ میں پڑنا پڑتا۔ بس نظام صلوٰۃ برپا کرنے کے لیے مصروف جہاد رہا کرتے۔ یہ مسلمانی بھی کیسی خوب اور عہد جدید کے مطابق ہے کہ اسلام پر تین حرف بھیجنے کے باوجود بھی مسلم ہی رہے۔ یہ قرآنی فکر بھی خوب ہے کہ صحابہ کرامؓ اور ائمہ عظام بے چاروں کے ذہن اس تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ یار لوگوں نے بھی خوب خوب نفس کے بت تراشے ہیں۔ اور انہیں اسلام کے نام پر پیش کرنے پر مصر ہیں۔ اگر نہ مانو تو گردن زدنی' مان لو تو اسلام کا خسارہ' اس کے بعد کچھ کام ودہن کی لذت کا سامان ہوا اور پھر "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے نام سے ایک ڈرامہ پیش کیا گیا۔ لیکن ہم ڈرامہ دیکھے بغیر ہی واپس چلے آئے۔" (اخبار جہاں' کراچی' ۸ جنوری ۱۹۶۹ء)

یہ تو اس نمائندہ کی رپورٹ تھی اب آپ ایک پہلو پر بھی غور فرمایئے کہ لاہور گلبرگ میں درس قرآن ہمیشہ ہفتہ وار چھٹی کے دس سے بارہ بجے دوپہر تک ہوتا ہے۔ اس کی وجہ تو صاف ہے کہ نہ دریں اثناء کسی نماز کا وقت آئے نہ ہی کوئی اعتراض پیدا ہو۔ لیکن ایک پرویزی دوست نے یہ وجہ بتائی کہ ہم میں مسلمانوں کے سب فرقوں کے لوگ آتے ہیں نماز کے اوقات اور دوسرے فروعی اختلافات سے بچنے کی خاطر یہی وقت مناسب سمجھا گیا ہے۔

② دوسری بات آپ کے اقتباس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ مسلمانوں میں ہی رہنا پسند فرماتے ہیں اگرچہ ابتدا سے لے کر انتہا تک نماز کی پوری ترکیب غیر قرآنی ہے۔ اس کے باوجود آپ صرف سنت کے مطابق ہی نماز قبول نہیں فرماتے بلکہ فقہ حنفی تک کے قبول کرنے پر اتر آئے ہیں۔ پھر اس رسم کے لیے بے روح وبے جان اور بے مقصد ہونے کے باوجود اسے قبول فرما رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ آپ مسلمانوں میں کا ایک رہنا چاہتے ہیں۔

③ یہ تیسری بات آپ نے یہ بیان فرمائی کہ آپ الگ فرقہ نہیں بنانا چاہتے۔ الگ فرقہ سازی کا مسئلہ چاہنے یا نہ چاہنے پر منحصر نہیں ہوتا۔ کبھی کسی نے مسلمانوں سے الگ نہیں ہونا چاہا۔ مگر جب عقائد ونظریات میں اختلاف واقع ہو جائے تو مسلمان ایسے گروہ کو الگ فرقہ قرار دے دیتے ہیں۔ اور پرویز صاحب نے تو ماشاء اللہ الگ فرقہ سازی کے کئی اقدامات بھی کیے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے کتاب ہذا کے حصہ ششم کا باب ۵ "داعی انقلاب کا ذاتی کردار")

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ② قرآنی زکوٰۃ وصدقات

کسی مستفسر کو پرویز صاحب جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"زکوٰۃ کے لیے قرآن میں حکومت کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرے ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ﴾ (۹-۱۰۳) اس لیے زکوٰۃ اس ٹیکس کے سوائے اور کچھ نہیں جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرے۔ اس ٹیکس کی کوئی شرح متعین نہیں کی گئی اسلئے کہ شرح زکوٰۃ کا انحصار ضروریات ملی پر ہے۔ حتیٰ کہ ہنگامی صورتوں میں وہ سب کچھ وصول کر سکتی ہے جو کسی کی ضرورت سے زائد ہو۔ ﴿ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ﴾ لہٰذا جب کسی جگہ اسلامی حکومت نہ ہو تو زکوٰۃ بھی باقی نہیں رہتی۔"
(قرآنی فیصلے ص۳۵)

اس اقتباس میں پرویز صاحب نے چار باتیں بیان فرمائیں:

1. زکوٰۃ اور حکومت لازم وملزوم ہیں۔ جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں زکوٰۃ بھی نہیں رہتی۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ کے حکم کے ساتھ ہی عاملین زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے۔
2. زکوٰۃ کی شرح قرآن میں متعین نہیں۔ لہٰذا ایک اسلامی حکومت جو کچھ بھی ملی ضروریات کے لیے لوگوں سے وصول کرتی ہے۔ وہ زکوٰۃ ہی ہوگی بالفاظ دیگر زکوٰۃ کی شرح متعین کرنا ہر دور کی اسلامی حکومت کا اپنا کام ہے۔
3. زکوٰۃ اور ٹیکس میں کوئی فرق نہیں۔ اگر حکومت غیر اسلامی ہو تو جو کچھ لوگوں سے وصول کرتی ہے اسے ٹیکس کہہ دیتے ہیں اور اگر حکومت اسلامی ہو تو اسے زکوٰۃ کہتے ہیں صرف نام کا فرق ہے۔ بات ایک ہی ہے۔
4. اگر حکومت اسلامی ہو تو عندالضرورت لوگوں سے سب کچھ وصول کر سکتی ہے۔ جو ان کی ضرورت سے زائد ہو۔

اب ہم انہی پہلوؤں پر ترتیب وار تبصرہ کریں گے۔

## ① شرطِ زکوٰۃ

پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ "جب کسی جگہ اسلامی حکومت نہ ہو تو زکوٰۃ بھی باقی نہیں رہتی" اس

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



مفروضہ کے غلط ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مکی دور میں اسلامی حکومت کا نام ونشان تک نہ تھا۔ لیکن مکی سورتوں میں بھی مسلمانوں کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ معارج اور ذاریات دونوں میں مسلمانوں کو اپنے اموال سے سائل اور محروم کا "حق" ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے (تفصیل آگے شرح زکوٰۃ میں آرہی ہے) اور یہ حکم اس وقت دیا گیا جب نہ اسلامی حکومت کا وجود تھا۔ نہ عاملین زکوٰۃ کا صرف چند گنے چنے مسلمان تھے جو کفار کی سختیاں برداشت کرتے تھے اور پریشان حال تھے۔ اس حالت میں بھی انہیں زکوٰۃ کا حکم دیا جا رہا تھا۔ جس سے صاف واضح ہے کہ زکوٰۃ کا حکم اسلامی حکومت کے وجود کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ اگر حکومت کی صورت میں حکومت کو زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم ہے تو ایسی حکومت کی غیر موجودگی میں بھی مسلمانوں کو انفرادی طور پر زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی ویسا ہی حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ جیسے اہم دینی فریضہ کو حکومت کی شرط سے مشروط نہیں کیا۔ کئی انبیاء اور ان کے امتی حکومت قائم کر ہی نہ سکے۔ لیکن زکوٰۃ ان سے ساقط نہ ہوئی۔

اس شرط کے مفاسد: اور اس مفروضہ کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ اگر اوامر ونواہی کو اس طرح حکومت کے ساتھ مشروط کیا جانے لگے تو قرآنی احکام کی تعمیل کا قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر یہی کہا جائے کہ صلوٰۃ کو قائم کرنا تو ایک نظام ہے جو اسلامی حکومت کی موجودگی میں ہی اجتماعی طور پر سرانجام دیا جا سکتا ہے اور جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں اگر لوگ انفرادی طور پر یا چند لوگ کسی جگہ جمع ہو کر نماز ادا کر بھی دیں تو جو کچھ اسے حاصل ہوگا وہ ظاہر ہے (جیسا کہ پرویز صاحب نے قرآنی فیصلے میں نماز کے عنوان کے تحت اظہار خیال فرمایا ہے) تو یہ بات کسی طرح بھی درست نہیں سمجھی جا سکتی۔ اسی طرح کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ سود صرف اس صورت میں ناجائز ہے کہ اسلامی حکومت موجود ہو اور اس کی دلیل یہ دے کہ جب تک اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی اس وقت تک سود بھی حرام نہ ہوا۔ یا یہ کہے دارالحرب میں سود کی اجتماعی یا انفرادی کسی بھی صورت پر چنداں مواخذہ نہ ہوگا۔ تو اس کا قول باطل سمجھا جائے گا۔ پھر کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ طلاق کا حق مردوں کو نہیں دیا گیا بلکہ یہ کام اسلامی عدالت کا ہے کہ وہ طلاق کا فیصلہ کرے۔ اور دلیل میں یہ بات پیش کرے کہ یہ حکم اس وقت نازل ہوا جب کہ اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ تو اس کی یہ بات مردود سمجھی جائے گی۔ وجہ یہ ہے کہ قرآن کے اوامر ونواہی نہ تو اسلامی حکومت کی موجودگی اور غیر موجودگی سے مشروط ہیں اور نہ ہی اجتماعی صورت سے مشروط ہیں۔ قرآن کے احکام انفرادی اور اجتماعی، حکومت اور محکومیت ہر حالت میں واجب التعمیل ہیں۔ یہ صورت بہتر ضرور ہے۔ کہ اسلامی حکومت قائم ہو اور جو احکام اجتماعی طور پر بجالائے جا سکتے ہیں وہ اجتماعی طور پر ہی بجالائے جائیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر مسلمانوں کی اسلامی حکومت نہ ہو یا اگر چھن جائے اور اجتماعیت کی صورت نہ بن سکے تو یہ احکام ساقط ہو جاتے ہیں۔ کسی غیر مسلم حکومت میں اگر مسلمانوں سے نماز ساقط نہیں ہو سکتی تو آخر زکوٰۃ کو کس دلیل کے ساتھ ساقط کیا جاتا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ میں تفریق پیدا کرنا تو ان

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



مرتدین کا کام تھا جن سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جہاد کیا تھا۔

## ② شرط زکوٰۃ میں تبدیلی کا حق

قرآن میں انفاق فی سبیل اللہ کے احکام دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق تطوع اور ترغیب سے ہے ان کی کوئی شرح نہیں ہوتی۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

﴿ وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ﴿١٩﴾ ﴾ (الذاریات ۵۱/ ۱۹) اور ان (مسلمانوں) کے اموال میں سائل اور محتاج کا بھی حق ہے۔

اور مسلمانوں کو ترغیب یہ دی گئی ہے کہ وہ جتنا زیادہ سے زیادہ ہو سکے اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور اس کی آخری حد یہ ہے کہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیئے۔ (۲۱۹:۲)

اور دوسرے احکام وہ ہیں جن کی حیثیت قانونی ہے۔ یعنی کہ کم از کم وہ مقدار اموال جس کا خرچ کرنا ہر مسلمان پر فرض اور لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس مقدار کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَٱلَّذِينَ فِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ مَّعۡلُومٞ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ﴿٢٥﴾ ﴾ (المعارج ۷۰/ ۲۴۔۲۵) اور ان مسلمانوں کے اموال میں سائل اور محتاج کا طے شدہ حق ہے۔

اس آیت میں حق معلوم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور لفظ علم کا اطلاق قرآن کریم میں بالعموم وحی الٰہی پر ہوتا ہے جیسے فرمایا ﴿ مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ ٱلۡعِلۡمِ ﴾ (۱۴۵:۲) اس کے بعد کہ تمہارے پاس علم آچکا) یعنی حق معلوم سے مراد یہ ہے کہ اموال کی وہ معینہ مقدار زکوٰۃ جو رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ وحی الٰہی معلوم ہوئی اور آپ نے صحابہ کو بتائی۔ اس قانونی شرح کے مطابق ہی اگر کہیں اسلامی حکومت قائم ہو تو مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق تو رکھتی ہے لیکن ان کا سارا فالتو مال نہیں لے سکتی۔ ارشاد باری ہے۔

﴿ خُذۡ مِنۡ أَمۡوَٰلِهِمۡ صَدَقَةٗ ﴾ (التوبۃ ۹/ ۱۰۳) "ان مسلمانوں کے اموال میں سے کچھ حصہ وصول کیجیے۔"

اس آیت میں من تبعیض کے لیے آیا ہے یعنی حکومت کو کچھ حصہ (حق معلوم) ہی لینے کا حق ہے۔ سارا مال لینے کا حق نہیں ہے۔ گویا کوئی مسلمان اگر خود چاہے تو ضرورت سے زائد سارا مال خرچ کر سکتا ہے۔ لیکن حکومت کو قطعاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی کا ضرورت سے زائد سارا مال جبری وصول کرے۔

اب یہ تو واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حق معلوم سے جتنا حصہ سمجھا اتنا ہی صحابہ سے بطور زکوٰۃ وصول کیا تھا۔ بالفاظ دیگر جتنا حصہ آپ نے مختلف اموال زکوٰۃ مثلاً نقدی سونا' چاندی' زرعی اجناس' مویشی وغیرہ میں سے وصول فرمایا وہی "حق معلوم" تھا۔ اور اگر کوئی حکومت اس شرح زکوٰۃ سے جو رسول اللہ نے مقرر فرمائی تھی۔ کمی بیشی کرے گی تو وہ قطعاً حق معلوم نہیں کہلا سکتا۔ وہ حق مبہم یا غیر معلوم ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہ قرآن کریم کے حکم کی صریح خلاف ورزی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**نماز اور زکوٰۃ کی جزئیات:** اب پرویز صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ قرآن میں زکوٰۃ کا حکم ستر بار آیا ہے۔ اگر زکوٰۃ کی شرح بھی متعین اور ضروری تھی تو قرآن میں اللہ تعالیٰ اتنا اضافہ فرما دیتے کہ زکوٰۃ اڑھائی فی صد یا چالیسواں حصہ ہے تو کیا حرج تھا؟ یہ اعتراض ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ قرآن میں نماز کی ادائیگی کا حکم سات سو بار آیا ہے۔ اگر صلوٰۃ موقتہ دن میں پانچ ہیں تو اللہ تعالیٰ اتنی سی بات بتا دیتے تو کیا حرج تھا؟ مگر بات صرف اتنی نہیں بلکہ یہ ہے جس طرح نماز کی جزئیات بے شمار ہیں۔ مثلاً نمازوں کی تعداد ہر نماز میں رکعات کی تعداد' اذان کی صورت نماز کے لیے طہارت کے احکام' نماز کی ادائیگی کی ترتیب وغیرہ اسی طرح زکوٰۃ کی جزئیات بھی بے شمار ہیں۔ مثلاً نقدی میں زکوٰۃ کی شرح کیا ہے؟ سونے چاندی میں کتنی' زرعی اجناس نہری میں کتنی بارانی میں کتنی مویشی میں کتنی پھر یہ کہ زکوٰۃ کس شخص پر فرض ہوتی ہے۔ اور کتنے مال پر فرض ہوتی ہے ان تمام امور کی توضیح و تشریح کا کام اللہ نے اپنے رسول کے ذمہ لگا کر فرما دیا کہ "اس کی اطاعت کرو تو یہی عین اللہ کی اطاعت ہے۔" اب اگر کوئی شخص حق معلوم کی اس نبوی توضیح کا خلاف کرتا ہے تو یہ اللہ کی اطاعت کیسے ہوئی؟

**زکوٰۃ سے متعلق طلوع اسلام سے ایک سوال:** طلوع اسلام کی طرف سے بار بار یہ بات دہرائی جاتی ہے کہ قرآن میں جو احکام اصولی طور پر بیان ہوئے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ صحابہ کرام سے مشورہ کر کے ان کی جزئیات طے فرمایا کرتے تھے۔ یہ ایک ایسا دعوی ہے۔ جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ نماز' روزہ' حج وغیرہ کی بات تو چھوڑ یئے صرف زکوٰۃ کا مسئلہ ہی لیجیے جس پر پرویز صاحب کے خیال کے مطابق زمانہ کے تقاضے سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ کیا زکوٰۃ کی شرح کی تعیین کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کیا تھا؟ کیا طلوع اسلام کوئی کمزور سے کمزور روایت حتیٰ کہ کوئی وضعی روایت بھی ایسی پیش کر سکتا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کر کے زکوٰۃ کی شرح اور دوسری جزئیات متعین فرمائی تھیں؟ روایات کو بھی جانے دیجیے۔ ایسی تاریخی کتب جن کا روایات سے چنداں تعلق نہیں ان سے طلوع اسلام اپنے اس دعوی کی تائید میں کوئی اقتباس پیش کر سکتا ہے؟ پھر کیا یہ پرویز صاحب کا رسول اللہ پر اتہام نہیں کہ آپ قرآنی احکام کی بالخصوص ایسے احکام جن کا تعلق شرعی امور سے ہے۔ جزئیات صحابہ کے مشورہ سے طے فرمایا کرتے تھے۔

**زکوٰۃ اور زمانے کے تقاضے:** اب دیکھئے پرویز صاحب کے نزدیک زمانہ کے تقاضے نماز پر تو اثر انداز نہیں ہوتے لہٰذا انہیں نماز کے معاملہ میں تواتر گوارا ہے۔ لیکن یہ زمانے کے تقاضے زکوٰۃ پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا زکوٰۃ کے معاملہ میں انہیں تواتر یا تعامل امت گوارا نہیں۔ زمانہ کے تقاضے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور ہی میں بہت تبدیل ہو چکے تھے۔ پھر مسلمانوں نے چھ سات صدیاں حکومت کی تو ان کے ادوار میں ہر آن زمانہ کے تقاضے بدلتے ہی رہے تھے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور نہ ہی کسی دوسرے مسلمان

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



بادشاہ کو زمانہ کے بدلے ہوئے تقاضوں کی خاطر شرح زکوٰۃ کو بڑھانے کا خیال آیا اور اگر کسی کو آیا بھی ہو تو کم از کم ایسی جرأت کوئی نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ سب تواتر اور تعامل امت کو سند' سنت رسول اور اللہ کا حکم سمجھتے تھے۔ مگر آج پرویز صاحب کو کم از کم زکوٰۃ کے معاملہ میں تواتر اور تعامل امت بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔ حالانکہ زکوٰۃ سے متعلقہ احادیث پرویز صاحب کے نزدیک بھی وضعی اور کسی یہودی کی گھڑی ہوئی ہونے کے الزام سے بھی بچی ہوئی ہیں۔ پھر معلوم ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جس مخترعہ نظام ربوبیت کے پیچھے آپ پڑے ہوئے ہیں۔ اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی زکوٰۃ کا مسئلہ اور اس مسئلہ میں تواتر وتعامل امت ہے۔

پھر زمانہ کے تقاضوں کو پرویز صاحب نے خواہ مخواہ بدنام کر دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر موجودہ حکومتیں کئی قسم کی رفاہی ذمہ داریاں اپنے سر ڈال لیتی ہیں تو موجودہ حکومتوں نے کئی ایسے نئے محکمے بھی کھول رکھے ہیں جن سے انہیں خاطر خواہ فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ آج سے قریباً سات سال پیشتر مئی ۱۹۷۷ء کے ترجمان الحدیث میں میرا ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں میں نے بدلائل اور پورے پورے اعداد وشمار کے ذریعہ یہ ثابت کیا تھا کہ اگر آج بھی زمانہ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اسلام کا مالیاتی نظام (جس کا ایک حصہ تحصیل زکوٰۃ اور مصارف زکوٰۃ بھی ہے) رائج کیا جائے تو موجودہ دور کے بڑھے ہوئے ٹیکسوں والے اور سودی نظام سے بہتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں تمام اعداد وشمار اکنامک سروے (Economic Survey) برائے (۱۹۷۶-۱۹۷۷ء) سے حاصل کئے گئے تھے۔ اور تقابل میں پاکستان کا مرکزی وفاقی بجٹ ملحوظ رکھا گیا تھا۔ اس مضمون پر راقم الحروف کو ملک کی ایک ممتاز ومعروف شخصیت نے مبارک باد بھی پیش کی تھی۔ اندریں صورت حال زکوٰۃ (ہمارے خیال کے مطابق) کی شرح میں اضافہ کے لیے زمانہ کے تقاضوں کا بہانہ عذر لنگ کے علاوہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

## ③ ٹیکس اور زکوٰۃ میں فرق

چونکہ پرویز صاحب کے نزدیک زکوٰۃ اور ٹیکس متبادل الفاظ ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں جو کچھ ایک اسلامی حکومت عوام سے ٹیکسوں کی صورت میں وصول کرے وہ سب کچھ زکوٰۃ ہے۔ اور اسی زکوٰۃ کا نام آج کے دور میں ٹیکس ہے۔ لہٰذا ہم ان دونوں چیزوں کا فرق ذرا تفصیل سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے خیال میں ان دونوں چیزوں کی حقیقت نام' مقاصد' محاصل' مصارف' نتائج اور مزاج کسی ایک چیز میں بھی مماثلت نہیں ہے۔

ا۔ بنیادی فرق: عہد نبوی ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں مسلمانوں سے تو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اور غیر مسلموں سے خراج اور جزیہ' عرب کا ہمسایہ ملک ایران ایک متمدن حکومت تھی۔ ایران میں زمینداروں سے جو مالیہ وصول کیا جاتا "اسے خراگ" کہتے تھے۔ خراج کا لفظ اسی سے معرب ہے اور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



خراگ کے علاوہ دوسرے ٹیکسوں کو "گزیت" کہتے تھے۔ خراج کا لفظ اسی سے معرب ہے اور خراگ کے علاوہ دوسرے ٹیکسوں کو "گزیت" کہتے تھے۔ جزیہ کا لفظ اسی سے معرب ہے۔ گویا غیر مسلموں پر وہی ٹیکس بحال رکھے گئے جو زمانہ کے دستور کے مطابق تھے مگر مسلمانوں سے یہ عام ٹیکس ساقط کر دیے گئے۔ اور اس کے بجائے زکوٰۃ عائد کی گئی۔

ان ٹیکسوں اور زکوٰۃ میں دوسرا فرق یہ تھا کہ زکوٰۃ کا نصاب اور شرح ہمیشہ غیر متبدل رہی جب کہ جزیہ اور خراج کی شرح میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں جزیہ کی شرح ایک دینار فی کس سالانہ تھی۔ اور رقم ہر بوڑھے' بچے' عورت' معذور سب سے بحساب مشترکہ وصول کی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں اصلاح کی' بوڑھے' بچوں' عورتوں اور معذوروں سے جزیہ ساقط کر دیا۔ باقی غیر مسلم معاشرہ کے مالی لحاظ سے تین طبقے مقرر کئے جن سے علی الترتیب ۴ دینار' ۲ دینار اور ایک دینار سالانہ کے حساب سے وصول کیا جاتا تھا۔ اسی طرح قبیلہ بنی تغلب کے عیسائیوں نے مسلمانوں سے یہ درخواست کی کہ ان سے خراج کی بجائے دوگنا عشر لیا جائے تو مسلمانوں نے ان کی یہ تجویز منظور کر لی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس دور میں زکوٰۃ کو دین کا رکن سمجھا جاتا تھا اور اس کے احکامات غیر متبدل تھے۔ جب کہ جزیہ اور خراج کی شرح میں تغیر و تبدل کیا جاتا تھا۔

تیسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ کے علاوہ جو کچھ بھی وصول کیا جائے اسے مکس کہا جاتا تھا۔ مکس کے معنی المنجد (عربی۔ اُردو) نے "محصول ٹیکس اور چونگی لکھے ہیں اور ماکس کے معنی ٹیکس وصول کرنے والا۔ منتہی الارب (عربی۔ فارسی) نے اس کے معنی "باج خراج گرفتن اور مقائیس اللغۃ (عربی۔عربی) میں اس کے معنی كَلِمَةٌ تَدُلُّ عَلٰى جَبْيِ مَالٍ" اور جبایہ کا لفظ محصول اکٹھا کرنے کے لیے محاورتاً استعمال ہوتا ہے۔

مکس کی شرعی حیثیت یہ ہے کہ دور نبوی ﷺ میں جب قبیلہ غامدیہ کی عورت کو زنا کے جرم میں سنگسار کیا گیا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے ایک پتھر مارا جس کی وجہ سے خون کے چند چھینٹے حضرت خالد کے منہ پر بھی آپڑے۔ حضرت خالد نے اس عورت کو گالی دی۔ تو حضور اکرم ﷺ نے حضرت خالد کو مخاطب کر کے فرمایا۔

«مَهْلاً يَاخَالِدُ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ لَهٗ»(مسلم، كتاب الحدود باب حد الزنا)

اے خالد یہ کیا بات ہوئی۔ اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے۔ اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر کوئی ٹیکس وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرے تو معاف کر دیا جائے۔

گویا مکس کا جرم کسی صورت میں زنا سے کم نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر آپ نے ارشاد فرمایا:

لَا يَدْخُلُ صَاحِبُ مَكْسٍ فِي الْجَنَّةِ "ٹیکس وصول کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔"

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اور مشکوٰۃ میں صاحب مکس کا معنی اَیْ مَنْ یَاخُذُ الْعُشْرَ وَ یَزِیْدُ عَلَیْہِ شَیْئًا یعنی وہ شخص جو عشر وصول کرتا ہے اور اس سے کچھ زیادہ بھی لیتا ہے۔ ان الفاظ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ عامل یا زکوٰۃ وصول کنندہ زکوٰۃ وصول کرنے کے بعد جو کچھ بطور رشوت لے وہ مکس ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصول کنندہ حکومت عشر کی شرح میں اضافہ کر دے۔ (مثلاً ۱۰ فیصد کی بجائے ۱۵ فیصد یا ۵ فیصد چاہی یا نہری کی زکوٰۃ کے بجائے ۷ فیصد وصول کرے) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت عشر کے علاوہ کوئی دوسرا ٹیکس بھی عائد کرے۔ تاہم لغت اس تیسرے مفہوم کی تائید کرتی ہے اور یہ بات بھی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ مکس کا لفظ ہی دوسری زبان میں جا کر ٹیکس بن گیا ہو۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مکس زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے ٹیکس کا نام ہے جو مسلمانوں پر عائد کیا جائے یا پھر اس اضافہ کا نام ہے جو شرح زکوٰۃ میں کیا جائے اور یہ ایک کبیرہ گناہ ہے۔

**۲۔ مقصد کے لحاظ سے فرق:** ٹیکس کا مقصد عوام کی آمدنی کا ایک حصہ لے کر اس سے نظام حکومت چلانا۔ رفاہ عامہ کے کام کرنا اور اس سے ملکی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے جب کہ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد تطہیر مال اور تزکیہ نفس ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿ خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا ﴾ (التوبۃ ۹/ ۱۰۳)

اے پیغمبر ﷺ! آپ ان (مسلمانوں کے) اموال سے زکوٰۃ وصول کر کے ان اموال کو پاک کیجیے اور ان کا تزکیہ نفس کیجیے۔

اس آیت میں زکوٰۃ کے دو مقصد بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ کمائی میں جو کوتاہیاں اور لغزشیں نادانستہ طور پر ہو جاتی ہیں۔ صدقہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ یہ کوتاہیاں معاف کر دیتے ہیں اور یہ کمائی پاک اور طیب ہو جاتی ہے۔

اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ صدقہ کی ادائیگی کی وجہ سے مال کی محبت سے پیدا ہونے والی اخلاقی بیماریوں کے جراثیم سے انسان کا دل پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ پہلی امتوں پر بھی فرض کی گئی تھی۔ ان لوگوں کے اموال زکوٰۃ وخیرات اور نذر نیاز ایک جگہ جمع کر دیے جاتے رات کو آسمان سے آگ آتی جو اس مال کو بھسم کر دیتی تھی جو اس بات کی دلیل ہوتی کہ ان کی قربانی قبول ہو گئی۔

زکوٰۃ کے ذریعہ غریب عنصر کی پرورش زکوٰۃ کا ضمنی فائدہ ہے۔ مقاصد وہی دو ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے امت محمدیہ کو غنیمت اور زکوٰۃ کے اموال کو معاشی بہبود کے طور پر استعمال کی اجازت دی ہے۔

**۳۔ محاصل کے لحاظ سے فرق:** اسلامی نقطہ نظر سے معاشرہ کو معاشی لحاظ سے صرف دو طبقوں میں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

① ایک وہ جن سے زکوٰۃ وصول کی جائے یہ لوگ اہل نصاب یا غنی ہیں۔

② دوسرے وہ جن میں زکوٰۃ تقسیم ہو گی۔ یہ لوگ فقراء و مساکین ہیں۔

اصول یہ ہے کہ اہل نصاب یا اغنیاء پر زکوٰۃ کا مال خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے صرف لیا جاتا ہے۔ گویا زکوٰۃ کا مال امراء کی جیب سے نکلتا ہے اور غریبوں پر صرف ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ٹیکس کی رقوم کا بیشتر حصہ غریبوں کی جیب سے نکلتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۷۷-۱۹۷۶ء کے گوشوارہ کے مطابق ہماری حکومت کی مجموعی آمدنی کا ۷۵ فیصد حصہ صرف ٹیکسوں سے وصول ہوا تھا اور باقی ۲۵ فیصد دوسرے ذرائع آمدنی سے اب یہ ٹیکس دو طرح کے ہوتے ہیں۔

(الف) بلاواسطہ یا براہ راست ٹیکس جیسے انکم ٹیکس' پراپرٹی دولت ٹیکس وغیرہ۔ یہ امراء پر لگائے جاتے ہیں۔ ۷۷-۱۹۷۶ء کے بجٹ کے مطابق ان ٹیکسوں سے ٹیکس کی مجموعی آمدنی کا صرف ۱۲.۳ فیصد آمدنی ہوئی۔

(ب) بالواسطہ ٹیکس یہ وہ ٹیکس ہیں جو ادا تو تاجر اور صنعت کار کرتے ہیں۔ لیکن یہ ٹیکس قیمت فروخت میں شامل کر کے ان کا بوجھ صارفین پر ڈال دیتے ہیں۔ جیسے سیلز ٹیکس' ایکسائز ڈیوٹی وغیرہ جو چینی' سریا سیمنٹ' سوتی کپڑا اور دیگر بے شمار اشیاء پر لگائے جاتے ہیں۔ ان ٹیکسوں سے ٹیکس کی کل آمدنی کا ۸۷.۷ فیصد آمدنی ہوئی۔

ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں صارفین کا بیشتر حصہ غریب طبقہ ہی ہے۔ لہٰذا ٹیکسوں کا زیادہ تر بوجھ یہی طبقہ برداشت کرتا ہے۔

۴۔ مصارف میں فرق: زکوٰۃ سب سے بڑا اور اہم مصرف غریب طبقہ کی بنیادی ضروریات کی کفالت ہے جب کہ ٹیکس ملکی ضروریات کو پورا کرنے اور رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ ہوتے ہیں۔ گو یہ چیزیں سب کے لیے مشترکہ ہوتی ہیں۔ لیکن عملاً امیر طبقہ ہی ان سے زیادہ مفاد حاصل کر پاتا ہے۔ مثلاً اعلیٰ تعلیم کا حصول یا حصول انصاف جو کسی غریب کے بس کا روگ نہیں۔ اسی طرح اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ امیر طبقہ اپنے اثر اور مسائل کی بناء پر ہر چیز سے زیادہ فائدہ اٹھا جاتا ہے۔ گویا ٹیکس کی رقم جس کا زیادہ حصہ غریب کی جیب سے نکلا تھا اس سے امیر زیادہ فائدہ اٹھا گیا۔

زکوٰۃ دین سلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ اور اس کے ذریعہ طبقاتی تقسیم میں بہت حد تک کمی واقع ہو جاتی ہے۔ جب کہ ٹیکس سرمایہ داری نظام کے دو اہم ارکان۔ سود اور ٹیکس میں سے ایک رکن ہے جس طرح سود سے بالآخر سرمایہ دار ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ٹیکس کا بار تو غرباء پر زیادہ ہوتا ہے اور فائدہ امیر زیادہ حاصل کرتا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



۵- مزاج اور نتائج کے لحاظ سے فرق: 1 عام ٹیکس عموماً آمدنی پر لگتے ہیں جس سے دولت جمع کرنے کی ہوس بڑھتی ہے۔ جب کہ زکوٰۃ عموماً بچت پر لگتی ہے۔ جس سے اندوختہ کاری کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور سرمایہ حرکت میں رہتا ہے۔ جس سے معیشت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

2 زکوٰۃ بچت پر لگنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں فرد کی ضرورتوں اور اخراجات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جب کہ عام ٹیکس آمدنی پر لگتے ہیں اور فرد کے اخراجات یا کمی بیشی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ فرض کیجیے زید اور بکر دونوں ایک ایک ہزار روپیہ تنخواہ لیتے ہیں۔ زید ابھی غیر شادی شدہ ہے اور وہ بآسانی چھ سات سو روپے ماہوار پس انداز کر لیتا ہے۔ جب کہ بکر کے پانچ چھ بچے بھی ہیں۔ اور بمشکل گزر بسر کرتا ہے۔ تو ٹیکس ان کے اس امتیاز میں کوئی فرق نہیں کرے گا۔

3 عام ٹیکس محض حکومت کے نظم ونسق اور ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ جب کہ زکوٰۃ کا بیشتر حصہ ضرورت مند افراد پر خرچ کیا جاتا ہے۔ جس سے ان میں قوت خرید بڑھتی ہے اور اس طرح ملک کی پیداوار اور روزگار میں ترقی ہوتی ہے۔

4 ٹیکس کو ایک بوجھ تصور کیا جاتا ہے۔ ٹیکس دہندہ کبھی پوری مالیت ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اور ٹیکس وصول کرنے والے بھی رشوت لے کر خود ٹیکس چوری کی راہیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس ملی بھگت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کو متوقع رقم کا نصف بھی حاصل نہیں ہوتا اور وہ ٹیکس بڑھانے اور مزید ٹیکس عائد کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جب کہ زکوٰۃ ایک دینی فریضہ اور مالی عبادت ہے۔ جسے بیشتر مسلمان بخوشی ادا کر دینے میں ہی سعادت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اس میں رشوت کا بھی امکان بہت کم ہوتا ہے۔

## ④ حکومت کا عوام سے ضرورت سے زائد سب کچھ وصول کرنا

پرویز صاحب فرماتے ہیں:

حتیٰ کہ ہنگامی صورتوں میں اسلامی حکومت وہ سب کچھ وصول کر سکتی ہے جو کسی کی ضرورت سے زائد ہو۔" اور اس کی دلیل بریکٹوں میں یوں پیش فرمائی۔ ﴿ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ﴾ (ایضاً ص ۲۵)

اب دیکھئے اس آیت کی تشریح میں پرویز صاحب نے:

(ا) اس آیت کے مفہوم کو یکسر الٹ کر رکھ دیا۔ سوال کرنے والے مسلمان یا رعایا ہے۔ اور وہ سوال کرتے ہیں کہ "ہم کیا خرچ کریں" اور جواب دینے والے رسول اکرم ﷺ یا حکومت ہے کہ "جو ضرورت سے زائد ہو" یعنی خرچ کرنے کا عمل رعایا کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن آپ اس عمل کو حکومت کی جبری وصولی کے رنگ میں پیش فرما رہے ہیں۔ اس معنوی تحریف کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ آپ کو نظام ربوبیت کے لیے میدان ہموار کرنے کی جو ضرورت ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ آپ ایسی معنوی تحریف کے مرتکب ہوں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



(۲) اس کے مفہوم میں جو "ہنگامی صورتوں میں" کی پچر لگائی گئی ہے۔ یہ قرآن کے کسی لفظ یا سیاق وسباق سے متبادر نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہنگامی صورتوں میں مسلمان ضرورت سے زائد خرچ کر لیا کریں۔ لیکن عام حالات میں ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن جب آپ نے مسلمانوں کے خرچ کرنے کے اختیار کو حکومت کے جبری سلب کا جامہ پہنا دیا تو پھر "ہنگامی صورتوں میں" کا اضافہ بھی کچھ بے جا معلوم نہیں ہوتا۔ آپ سمجھانا یہ چاہ رہے ہیں کہ کمیونزم یا آپ کے نظام ربوبیت کے انقلاب کے لیے اگر حکومت عوام سے "وہ سب کچھ" چھین لے تو انہیں افسوس نہ ہونا چاہیئے کیونکہ یہ قرآن کا حکم ہے۔

**زکوٰۃ کی ادائیگی کا بالکل جداگانہ مفہوم:** اب تک پرویز صاحب جو کچھ فرما رہے تھے اس کا ماحصل یہ تھا کہ ایک اسلامی حکومت جو کچھ مسلمانوں سے بطور ٹیکس لیتی ہے۔ اس کا نام زکوٰۃ ہے۔ یعنی لینے والی حکومت ہوتی ہے اور دینے والے مسلمان لیکن بعد میں جب آپ نے "قرآنی نظامِ ربوبیت" تصنیف فرمائی تو زکوٰۃ کی ادائیگی کا مفہوم یکسر الٹ دیا۔ آپ "ایتائے زکوٰۃ" (یعنی زکوٰۃ دینا) کو ایک اصطلاح قرار دیتے ہوئے اس کے معنی بیان فرماتے ہیں۔ "نوع انسانی کی نشوونما کا سامان (یعنی روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ) بہم پہنچانا (تزکیہ کے معنی ہیں نشوونما۔ بالیدگی)" (قرآنی نظامِ ربوبیت ص ۸۷) پھر اس کتاب میں اس اصطلاح کے معانی کی تفصیلات یہ بیان فرمائیں کہ اسلامی حکومت میں حکومت لوگوں سے ان کی محنت کا ماحصل لے لیتی ہے۔ پھر وہ لوگوں کو سامان نشوونما مہیا کرتی ہے تو حکومت کے لوگوں کو اس طرح نشوونما دینے کا فعل ایتائے زکوٰۃ کہلاتا ہے گویا اب اس فعل کے مخاطب عام لوگوں کے بجائے حکومت بن جاتی ہے۔ حکومت دینے والی اور لوگ لینے والے یہ ہے ایتائے زکوٰۃ کا جدید اور تازہ بتازہ مفہوم، جس میں نہ زکوٰۃ اور ٹیکس کو "ایک ہی بات ثابت کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ ہی اسلامی حکومت کو شرح زکوٰۃ میں حسب ضروریات ملی اضافہ کا حق ثابت کرنے کی۔ البتہ یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ﴾ کا کیا مطلب ہوا؟ یہاں لفظ مِنْ کا کیا فائدہ ہے؟

زکوٰۃ کے مسائل بیان کرنے کے بعد پرویز صاحب نے انفرادی صدقات وخیرات اور صدقہ فطر پر رائے زنی فرما کر ان کا خوب مضحکہ اڑایا ہے۔ لہٰذا ایسے ارشادات عالیہ کا جائزہ بھی پیش خدمت ہے۔

**صدقہ وخیرات:** "مسلمان سرمایہ داروں کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگ دوسروں کا خون چوس کر خود امیر بنتے اور انہیں غریب محتاج بنا دیتے ہیں اور پھر عید وشب برات پر ان کی طرف چند ٹکے پھینک کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کار ثواب سے ان کی عاقبت سنور جائے گی..... قوم میں غریبوں اور محتاجوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ اگر غریب نہ رہیں گے تو پھر خیرات کے احکام کی تعمیل کس طرح ہوگی۔ غور کیجیے نظام سرمایہ داری کے جراثیم کا اثر کس قدر دور رس ہوتا ہے۔" (ایضاً ص ۴۰)

ہم سمجھتے ہیں کہ سرمایہ داری کے جراثیم واقعی بڑی دور تک مار کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہم یہ سمجھتے ہیں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



کہ کمیونزم یا نظامِ ربوبیت کے جراثیم سرمایہ داری کے جراثیم سے بھی زیادہ مہلک ہیں کیونکہ کمیونزم میں زندگی بالکل حیوانی سطح پر آجاتی ہے۔ اس نظام میں رعایا کو سونے کو چھت پہننے کو کپڑا اور کھانے کو خوراک اگر مل جاتی ہے تو یہ چیزیں تو پالتو حیوانوں کو بھی نصیب ہو جاتی ہیں۔ کیا ایسی زندگی کی یہی خوبی بہت ہے کہ کھانے کو مل جاتا ہے؟ اس نظام میں چونکہ اجتماعیت کے مقابلہ میں انفرادیت کا جنازہ نکال کے رکھ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا پرویز صاحب بھی ہر ہر بات میں اجتماعیت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ وہاں انفرادیت کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مثلاً اسی زیرِ بحث مسئلہ صدقہ وخیرات کو لیجیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿ إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۷۱)

اگر تم صدقہ وخیرات کو ظاہر کر کے دو تو بھی اچھا ہے۔ اور اگر چھپا کر اہل حاجت کو دو تو یہ تمہارے لیے خوب تر ہے۔

دیکھئے اس آیت میں خطاب جماعت کو نہیں بلکہ افراد کو ہے کیونکہ جماعت یا حکومت چھپا کر کسی کو نہیں دے سکتی اسے اس کا ریکارڈ رکھنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت میں چھپا کر دینے کو ظاہراً دینے سے بہتر قرار دیا جا رہا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ بالخصوص صدقہ وخیرات کے معاملہ میں انفرادیت کو بھی ایک بلند مقام حاصل ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اسلام نے اجتماعیت کے بجائے انفرادیت کو زیادہ اہمیت دی ہے تو بے جا نہ ہوگا قیامت کے دن کی انفرادی مسئولیت اس کی بہت بڑی دلیل ہے۔

پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ محتاج اور فقیر طبقہ کا خالق سرمایہ دار ہے۔ یہ بات بھی خالص اشتراکی ذہن کی پیداوار ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ﴾ (الزخرف۴۳/ ۳۲)

اس دنیا کی زندگی میں ان کے درمیان سامان زیست کو تقسیم کرنے والے ہم ہیں ہم ہی نے ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے۔ تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے خدمت لے سکے۔

اس آیت کی روشنی میں بتائیے کہ امیر وغریب کی تقسیم سرمایہ داروں نے کی ہے یا اللہ تعالیٰ نے؟

**اسلامی نظام میں فقراء کا وجود:** اس کے بعد پرویز صاحب فرماتے ہیں:

"اسلام جس نظام کو نافذ کرنا چاہتا ہے اس میں ہر شخص کی ضروریات زندگی کی کفالت حکومت کے ذمہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نظام میں محتاجوں کی جماعت کا مستقل وجود ہو ہی نہیں سکتا...." لہٰذا اسلام میں خیرات کی ضروریات یا تو ایسے عبوری دور میں پڑے گی۔ جب آپ کا نظام ربوبیت ہنوز بروئے کار نہ آیا ہو یا بعض مقامی اور ہنگامی حوادث کے موقع پر۔" (ایضاً ص۴۸۔۴۹)

اب دیکھئے اقتباس بالا میں پرویز صاحب کئی غلط باتیں کہہ گئے۔ مثلاً:

(ا) اسلام میں ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت قطعاً حکومت کے ذمہ نہیں ہے۔ حکومت کے ذمہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



محتاجوں کی کفالت ہے۔ ہر شخص کی ضروریات زندگی کی نہیں۔ اگر ایسا ہے تو کوئی آیت پیش فرمایئے تاکہ اس بات کا دو ٹوک فیصلہ ہو جائے کہ اسلام میں ایسی اشتراکیت یا نظام ربوبیت کی گنجائش بھی ہے یا نہیں؟

(۲) محتاجوں کی کفالت کا تصور خود اس بات کا متقاضی ہے کہ ایک اسلامی حکومت میں محتاجوں کا وجود ممکن ہے۔ سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ﴾ (۵:۳) یعنی آج کے دن میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔ سورہ مائدہ کا ترتیب نزول کے لحاظ سے نمبر ۱۱۲ ہے۔ یعنی یہ رسول اکرم کی بالکل آخری زندگی میں نازل ہوئی۔ پھر اس کے بعد سورہ توبہ جس کا ترتیب نزول کے لحاظ سے نمبر سورہ مائدہ کے بعد آتا ہے یعنی نمبر ۱۱۳ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ ۞ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا ﴾ (التوبۃ ۹/ ۶۰) صدقات (یعنی زکوٰۃ وخیرات) فقیروں' مسکینوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے۔

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

① اس آیت کے نزول سے پہلے یا کم وبیش اس دور میں دین اسلام مکمل ہو چکا تھا۔

② اس مکمل شدہ نظام دین یا اسلامی حکومت میں فقراء ومساکین موجود تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ فقراء ومساکین کا وجود نہ عبوری دور سے تعلق رکھتا ہے اور نہ مقامی یا ہنگامی حوادث سے۔

③ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر صدقات کا جامع لفظ استعمال فرمایا۔ جو قانونی زکوٰۃ اور ترغیبی خیرات سب کو محیط ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ محتاجوں کی کفالت اگرچہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے تاہم اغنیائے جماعت کو زکوٰۃ کے علاوہ خیرات کے ذریعہ بھی اس طبقہ کی ضروریات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اب پرویز صاحب یہ قرآنی آیات تو دیکھتے نہیں اور جب اشتراکیت کا چشمہ چڑھا لیتے ہیں تو انہیں شرع مبین کا اصل نکتہ اقبال کے اس شعر میں نظر آنے لگتا ہے۔

کس نہ باشد در جہاں محتاج کس نکتہ شرع مبیں ایں است وبس

اقبال کے اس شعر کا مطلب تو یہ تھا کہ اسلامی حکومت محتاجوں کی کفیل ہوتی ہے۔ لیکن پرویز صاحب کو اس شعر میں بھی اشتراکیت ہی اشتراکیت نظر آتی ہے۔

پھر اس سلسلہ میں آپ کو صحیح احادیث تو درکنار کوئی ضعیف سے ضعیف قول بھی مل جائے تو وہ بھی آپ کے نزدیک قرآنی آیات سے بھی زیادہ قابل حجت ہوتا ہے۔ مثلاً وہ قول جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا "اگر میری حکومت میں دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو قیامت کے دن مجھ سے اس کی باز پرس ہوگی" اس قول کے غلط ہونے کی اس سے بڑی کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ کتوں کی کفالت اسلامی حکومت کی ہرگز ذمہ داری نہیں ہے۔ شاید پرویز صاحب کا قرآنی معاشرہ ان کا بھی کفیل ہو۔ جیسا کہ وہ ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ کا مطلب بتایا کرتے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



ہیں۔

**پرویز صاحب کی تضاد بیانی:** پرویز صاحب کا ارشاد ہے کہ "قوم میں غریبوں اور محتاجوں کی موجودگی کو اس لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ اگر قوم میں غریب نہ رہیں گے تو پھر صدقہ وخیرات کے احکام کی تعمیل کس طرح ہوگی۔" (ایضاً ص ۴۷)۔

صدقہ وخیرات کے احکام کی تعمیل کے متعلق پرویز صاحب یہ فرماتے ہیں کہ یہ سب عبوری دور سے متعلق احکام تھے۔ پھر جب اسلامی نظام قائم ہو گیا تھا یا آئندہ ہو جائے گا اور فقیر اور محتاج لوگوں کا وجود ہی باقی نہ رہے گا۔ تو ان احکام پر عمل کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ پھر صرف صدقہ اور خیرات کے احکام تک ہی یہ بات منحصر نہیں۔ بلکہ قرضہ وراثت اور لین دین کے جملہ احکام عبوری دور سے متعلق ہیں (قرآنی نظام ربوبیت میں ص ۲۸۷۔ ۲۲۹ ملخصاً) جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ وخیرات' میراث وبیع اور لین دین کے دوسرے احکامات کم از کم عبوری دور میں ضرور واجب التعمیل ہوتے ہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ آج کا دور قرآنی حکومت کا دور نہیں بلکہ عبوری دور ہے۔

**زکوٰۃ کی ادائیگی سے فرار کی راہیں:** اب صورت حال یہ ہوئی کہ چونکہ ہماری حکومت ہنوز اسلامی نہیں لہٰذا زکوٰۃ کی ادائیگی ضروری نہیں اور جب اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی تو پھر زکوٰۃ کی ادائیگی کی ویسے ہی ضرورت نہ رہے گی۔ کیونکہ جب معاشرہ سے فقیروں کا وجود ہی ختم ہو جائے گا تو پھر زکوٰۃ کے احکام از خود ہی پیچھے ہٹتے چلے جائیں گے۔ زیادہ واضح الفاظ میں زکوٰۃ کا حکم عبوری دور میں اس لیے قابل عمل نہیں کہ حکومت اسلامی نہیں اور اسلامی حکومت میں اس لیے قابل عمل نہیں کہ محتاج ہی باقی نہ رہیں گے۔ گویا پرویز صاحب اور آپ کی جماعت زکوٰۃ وخیرات کے احکام کی تعمیل سے بہرحال فرار ہی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت خواہ کیسی بھی ہو۔ کیا آپ کی اس ذہنیت سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ خالص یہودی ذہنیت دراصل پرویز اینڈ کو کے حصہ میں ہی آئی ہے۔

اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ جب موجودہ حکومت نے جب زکوٰۃ آرڈیننس نافذ کر دیا تو یہ حضرات زکوٰۃ کی ادائیگی سے فرار کی راہیں سوچنے لگے۔ چنانچہ ماہنامہ "طلوع اسلام" اپریل ۱۹۸۸ء کے ص ۴۰ پر ایک استفسار کے جواب میں یہ مشورہ دیا گیا کہ:

"جو حضرات قرآن کریم کی روشنی میں اپنے آپ کو حکومت کے نافذ کردہ احکام کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے کا مکلف نہیں سمجھتے اس قسم کا ڈیکلریشن گوشہ مجاز میں داخل کر دیں ڈیکلریشن فارم میں جہاں لکھا ہے میں مسلمان ہوں اور--- فقہ کا پابند ہوں۔

آپ لکھئے میں مسلمان ہوں اور قرآنی فقہ کا پابند ہوں:

اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس اعلان کے بعد آپ نہ صرف آئندہ ادائیگی زکوٰۃ سے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



مستثنیٰ قرار پائیں گے بلکہ جو زکوٰۃ پہلے کٹ چکی ہے وہ بھی آپ کو واپس مل جائے گی۔ ایک صاحب نے اطلاع دی ہے کہ اسے وضع کردہ رقم واپس مل گئی ہے۔ اگر کوئی ڈاک خانہ بنک نیشنل سیونگز کی شاخ اس پر کسی قسم کا اعتراض کرے تو آپ ان سے کہیے کہ وہ اپنے احکام بالا سے اس پر فیصلہ لے لیں اور اگر وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوں تو آپ (مذکورہ بالا) ایڈمنسٹریٹر زکوٰۃ کو خط لکھئے اور ان کی طرف سے جو جواب موصول ہو اس سے ہمیں بھی مطلع فرمایئے۔"

ادائیگی زکوٰۃ سے بچنے کی یہ مہم اگر کسی سرمایہ دار اور دنیا دار طبقہ کی طرف سے چلائی جاتی تو یہ بات قابل فہم تھی لیکن ہمیں حیرت ہے کہ یہ حیلے ان حضرات کی طرف سے پیش کیے جا رہے ہیں جو ربوبیت عامہ کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ اور جن کے خیال کے مطابق۔

(الف) ضرورت سے زائد سارے کا سارا مال مفاد عامہ کے لیے کھلا چھوڑ دینا چاہیئے (انفاق فی سبیل اللہ) اور یہ تو واضح ہے کہ جو رقم بینک' ڈاک خانہ یا نیشنل سیونگز میں جمع ہو وہ ضرورت سے زائد ہی ہوتی ہے۔

(ب) زکوٰۃ ادا کرنے والے سنت کی رو سے تو مسلمان قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن سنت ان کے لیے حجت ہی نہیں۔ اور قرآن کی رو سے جو کچھ زائد مال ہو وہ سب دے ہی دینا چاہیئے۔

(ج) قرآن کی تعلیم کا نقطہ ماسکہ ایتائے زکوٰۃ ہے تو کیا قرآنی فقہ قرآن کے نقطہ ماسکہ سے کوئی الگ چیز ہے؟

(د) ممکن ہے یہ حضرات موجودہ حکومت کو اسلامی ہی نہ سمجھتے ہوں۔ پھر بھی جب حکومت نے اعلان کر دیا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم صرف غریبوں اور محتاجوں پر صرف کی جائے گی تو پھر آخر زکوٰۃ کی ادائیگی سے فرار کیوں ہے؟ یہی تو آپ کا نصب العین ہے۔ [1]

**صدقہ فطر اور ڈاک کے ٹکٹ:** صدقہ فطر سے متعلق پرویز صاحب ایسی تمام روایات کو درست تسلیم کرتے ہیں۔ جن میں اجتماعی طور پر صدقات وصول کرنے اور انہیں خرچ کرنے کا ذکر ہے۔ لیکن اگر کہیں سے آپ کو کسی انفرادی عمل کی بو بھی آجائے تو پھر بگڑ بیٹھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

"اب سنت رسول ﷺ اللہ کا صرف اتنا حصہ پیش کیا جاتا ہے کہ نماز سے پہلے صدقہ فطر نکال کر اپنے اپنے طور پر غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو روزے معلق رہ جائیں گے۔ خدا تک نہیں پہنچیں گے گویا صدقہ فطر ملت کے اجتماعی مصالح کے لیے نہیں بلکہ ڈاک کے ٹکٹ ہیں جنہیں روزوں پر چسپاں کر کے لیٹر بکس میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ روزے مکتوب الیہ (اللہ تعالیٰ) تک پہنچ جائیں۔

---

[1] خالی جگہ میں حنفی فقہ لکھنے سے ڈھائی فیصد زکوٰۃ ہوتی ہے اور جعفری فقہ لکھنے سے ۲ فیصد اور قرآنی فقہ لکھنے سے غالباً بالکل چھٹی ہی مل جاتی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



آج سارے عالم اسلام کو چھوڑیئے صرف پاکستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں سے چھ کروڑ بھی ایسے فرض کر لیے جائیں جن کی طرف سے صدقہ فطر ادا کیا جاتا ہے۔ اور فی کس بارہ آنے (پچھتر پیسے) کے حساب سے اس کا شمار کیا جائے تو عید کے دن دس بجے سے پہلے ساڑھے چار کروڑ کی رقم صرف اس فنڈ میں جمع ہو سکتی ہے اور کچھ نہیں تو خانماں برباد پناہ گزینوں کو چھت تو نصیب ہو سکتی ہے۔" (ایضاً ص ۵۱)

دیکھا آپنے صرف اور صرف اجتماعیت یا اشتراکیت کا بھوت پرویز صاحب کے ذہن پر کس قدر مسلط ہو چکا ہے۔ آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ روزے سن ۲ھ میں فرض ہوئے اور اسی طرح صدقہ فطر بھی جب کہ مہاجرین نئے نئے مدینے آئے تھے۔ پھر جب رسول اللہ نے اجتماعی طور پر صدقہ فطر اکٹھا کیا۔ تو آپ کو کسی روایت سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ رسول اللہ نے اس رقم سے بے خانماں برباد مہاجرین کے لیے چھتوں کا بندوبست فرمایا تھا۔

صدقہ فطر کی ادائیگی کا مقصد نبیؐ نے یہ بتایا کہ اگر روزوں کی ادائیگی میں کوئی چھوٹی موٹی لغزش یا بھول چوک ہو گئی ہو تو اس صدقہ کی ادائیگی سے دور ہو جاتی ہے اور روزے اللہ کے ہاں مقبول ہو جاتے ہیں۔ یہی روزوں کے معلق ہونے کا مطلب ہے اور اس کی دلیل قرآن میں موجود ہے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا ﴾ (۹:۱۰۲) اور اس آیت کی تفصیل ہم پہلے پیش کر چکے ہیں کہ زکوٰۃ کے دو بنیادی مقصد ہیں: (۱) کسب مال میں چھوٹی موٹی لغزشوں سے اموال کی پاکیزگی اور (۲) بخل اور دوسرے اخلاقی رذیلہ سے دل کی صفائی۔ تو اگر زکوٰۃ سب مال کی لغزشوں کو دور کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے تو صدقہ فطر روزوں میں لغزشوں کے دور کرنے اور انکے عنداللہ مقبول ہونے کا ذریعہ کیوں نہیں بن سکتا؟

مگر پرویز صاحب کو روزوں کے مقبول یا نہ مقبول ہونے سے کوئی غرض نہیں۔ انہیں تو بے خانماں برباد مہاجرین کی چھتوں سے غرض ہے۔ ان کے کھانے پینے کی نہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ جس محتاج کو یہ رقم جس صورت میں بھی ملے گی وہ اس کی کوئی نہ کوئی ضرورت ضرور پورا کرے گی۔ اور وہ ضرورت یہ ہے کہ جو نادار لوگ جو ناداری کی وجہ سے عید کی خوشیوں میں شریک نہیں ہو سکتے وہ بھی شریک ہو سکیں۔ بتایئے اگر اس رقم سے چند مہاجرین کو بعد میں چھتیں میسر آبھی جائیں تو دوسرے محتاج عید کی خوشیوں میں کیسے شریک ہو سکتے ہیں جب کہ ان کے پاس کھانے یا پہننے کے لیے کچھ نہ ہو؟

رہا ڈاک کے ٹکٹوں کے چسپاں کرنے' لیٹر بکس میں ڈالنے اور مکتوب الیہ (اللہ تعالیٰ) تک پہنچنے کا مسئلہ تو یقین رکھیے کہ ان ذرائع سے رسول اللہ اور صحابہ کرام کے روزے تو نہیں پہنچتے تھے۔ خواہ وہ اجتماعی طور پر صدقہ فطر اکٹھا اور تقسیم کیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس دور میں یہ سب چیزیں مفقود تھیں۔ البتہ گمان غالب یہ ہے کہ جب پرویز صاحب کا مزعومہ قرآنی معاشرہ اور حکومت قائم ہوگی۔ اور صدقہ فطر سے بے خانماں مہاجرین کے لیے چھتیں مہیا کرے گی تو ان کے روزے انہی ذرائع سے اللہ تعالیٰ تک پہنچا کریں گے۔ کیونکہ آج کل یہ ذرائع موجود ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ③ قربانی

ایک چور کا اپنے سے بڑے چور سے سوال: قرآنی فیصلے میں اس بحث کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ پڑھے لکھے طبقہ میں سے کوئی صاحب پرویز صاحب سے قربانی کی دینی حیثیت پوچھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ کم از کم مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ ایسے محسوس کرتا ہے کہ اس سے قوم کا بہت سا روپیہ بے کار جاتا ہے۔ لیکن اس بات کو زبان پر نہیں لاتا۔ آج کل اقتصادی حالات سخت پیچیدہ ہیں۔ گھر گھر مہاجر پڑے ہیں۔ ایسا طبقہ قربانی دینے پر آمادہ نہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو "چور" محسوس کرتے ہیں۔ میں خود بھی انہیں مجرموں میں سے ایک ہوں۔ اسلئے دریافت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ "قربانی کی دینی حیثیت کیا ہے" (قرآنی فیصلے ص ۵۲ ایضاً)

اس سوال سے آپ یہ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ "پڑھا لکھا طبقہ" سے مراد کون لوگ ہیں؟ اور اس پڑھے لکھے طبقہ کو دین کے فرائض واحکام سے جس قدر وابستگی ہوتی ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ اب قربانی کا مسئلہ چونکہ صاحب حیثیت لوگوں سے متعلق ہے اور یہ پڑھا لکھا طبقہ بھی اکثر صاحب حیثیت ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا مال کے ضیاع کا واسطہ دے کر اپنے سے بڑے چور اور دین کے واحد اجارہ دار سے اس قربانی سے فرار کی راہ دریافت کر رہا ہے تاکہ قربانی بھی نہ کرنی پڑے اور ان کے اسلام پر بھی کوئی حرف نہ آسکے۔

پرویز صاحب کا جواب: پرویز صاحب اس پڑھے لکھے سائل کو مطمئن کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"یہ بالکل درست ہے کہ حضرت خلیل اکبر اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں قرآن نے یہ کہیں نہیں کہا کہ اس واقعہ عظیم کی یاد میں جانوروں کو ذبح کیا کرو۔ حتیٰ کہ حضرت اسماعیل کی جگہ مینڈھا ذبح کرنے کا واقعہ بھی قرآن میں نہیں تورات میں ہے" (قرآنی فیصلے ص ۵۴)۔

اب دیکھئے اس دو تین سطر کے جواب میں جناب پرویز صاحب نے قرآن کی صریح وضاحت کے علی الرغم دو جھوٹ بولے ہیں۔ ارشاد باری ہے۔

﴿ وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴿١٠٧﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي ٱلْءَاخِرِينَ ﴿١٠٨﴾ ﴾ (الصافات ۳۷/ ۱۰۷۔۱۰۸)

اور ہم نے ایک بڑی قربانی کے عوض اسماعیل کو چھڑا لیا۔ اور اس واقع (ذبح عظیم) کو پیچھے آنے والوں میں (باقی) چھوڑ دیا۔

اَلْفِدی وَالْفِدآء کے معنی کسی کی جانب سے کچھ دے کر اسے مصیبت سے بچالینا ہے۔ (مفردات امام راغب) گویا اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی قربانی کا عوضانہ دے کر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جان بچالی اب اگر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس "بڑی قربانی" [1] کی تفصیل یعنی "مینڈھا" کا لفظ قرآن میں نہیں بلکہ تورات میں ہو تو اس سے اصل واقعہ میں کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر اس ذبح عظیم کے واقعہ یعنی سنت ابراہیمی کو آنے والی نسلوں میں باقی چھوڑنا بھی قرآن سے ثابت ہے، یہ دوسرا جھوٹ ہے۔

پھر اسکے بعد دوران حج اپنا خود ساختہ فلسفہ پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: "مقام حج کے علاوہ کسی دوسری جگہ (یعنی اپنے اپنے شہروں میں) قربانی کیلئے کوئی حکم نہیں' تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نبی ﷺ نے مدینہ میں قربانی نہیں کی۔ جب حج کیلئے تشریف لے گئے ہیں تو وہاں جاکر جانوروں کی قربانی کی ہے اور جب تشریف نہیں لے گئے تو اپنی طرف سے قربانی کے جانور امیر حجاج کے ہاتھوں وہاں بھیج دیئے۔ اسلئے یہ ساری دنیا میں اپنے اپنے طور پر قربانی کرنا ایک رسم ہے۔ اسی طرح حاجیوں کی وہ قربانیاں جو وہ آج کل کرتے ہیں۔ محض ایک رسم رہ گئی ہے۔ ایک ایک حاجی پانچ پانچ سات سات دنبے انفرادی طور پر ذبح کر دیتا ہے اور چونکہ اس قدر گوشت کا کچھ مصرف نہیں ہوتا۔ اسلئے ان ذبح شدہ جانوروں کو گڑھے کھود کر دبا دیتے ہیں۔ (قرآنی فیصلے ص ۵۶)

یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جب پرویز صاحب تاریخ کے حوالہ سے کوئی بات کریں تو تاریخ سے ان کی مراد عموماً احادیث اور روایات ہی ہوتی ہیں۔ اقتباس بالا میں آپ نے "تاریخ سے پتہ چلتا ہے" کا ذکر فرما کر اپنے لیے بہت سی الجھنیں پیدا کر لی ہیں جو یہ ہیں۔

**۱۔ مقامی قربانی اور حج کی قربانی کے لیے الگ الگ لغت:** ۱۔ وہ قربانی جو حج کے دوران منیٰ میں کی جاتی ہے۔ اس کے لیے هَدْی کا لفظ مخصوص ہے اور جو قربانی کوئی شخص حج کے علاوہ عید کے دن اپنے شہر میں کرتا ہے اس کے لیے اُضْحِیة (ج اَضاحی) کا" اب آپ صحاح ستہ کی جملہ کتب ملاحظہ فرما لیجیے۔ ان تمام کتابوں میں محدثین نے اضاحی کے لیے الگ کتاب (کتاب الاضاحی) مخصوص کی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر شخص کا اپنے اپنے شہر میں قربانی کرنا بھی ضروری ہے۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ مَا هٰذِهِ الاضَاحِي (یعنی یہ قربانیاں کیا ہیں؟) تو آپ نے فرمایا۔

«سُنَّةَ أَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ» "یعنی تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت۔" [2]

اور یہی مطلب ہے قرآن کی آیت ﴿ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴾ (۳۷:۱۰۸) کا اور ہم نے اس واقعہ (ذبح عظیم کو) آنے والی نسلوں میں (باقی) چھوڑا۔

**۲۔ مقامی قربانی کے دلائل:** آپ فرماتے ہیں "تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نبی ﷺ نے مدینہ میں قربانی نہیں کی" اس اقتباس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نبی ﷺ کی ذات سے بھی اتنا بڑا جھوٹ منسوب فرما سکتے ہیں۔ وہاں آپ کی تاریخ دانی کا بھی پتہ چلتا ہے آپ وضاعین کو کوستے تو تھکتے نہیں اور اپنا

---

[1] پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ یہ مینڈھے کے ذبح ہونے کا قصہ تو اسرائیلی انسانوں میں سے ایک افسانہ ہے' جس کی قرآن تائید نہیں کرتا۔ [2] احمد۔ ابن ماجہ بحوالہ مشکوۃ' کتاب المناسک۔ باب فی الاضحیہ الفصل الثالث)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



یہ حال ہے کہ غیر شعوری طور پر اور بلا تکلف ایسے جرم کا ارتکاب کر جاتے ہیں۔ جس کی سزا جہنم ہے۔

اب ہم یہ بتائیں گے کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ میں قربانی کی تھی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ہم بخاری کتاب الاضاحی سے چند احادیث پیش کرتے ہیں۔ حضرت انس بن مالک ؓ روایت کرتے ہیں کہ۔

«إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُضَحِّيْ بِكَبْشَيْنِ اَمْلَحَيْنِ اَقْرَنَيْنَ وَوَضَعَ رِجْلَهُ عَلَى صَفْحَتِهِمَا وَذَبَحَهُمَا بِيَدِهِ»

نبی اکرم ﷺ دو چتکبرے سینگ دار مینڈھوں کی قربانی کیا کرتے تھے آپ اپنا پاؤں ان کے پٹھے پر رکھتے اور اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے تھے۔ (بخاری' کتاب الاضاحی' باب: وضع القدم علی---)

اس حدیث سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

(الف) یہ حدیث کتاب الاضاحی میں ہے۔ لہٰذا مدینہ میں مقامی قربانی سے تعلق رکھتی ہے۔ نیز یضحّی کے الفاظ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے۔

(ب) ایک سے زیادہ قربانیاں کرنا بھی آپ کی سنت ہے۔

(ج) یہ قربانیاں آپ ہر سال کیا کرتے تھے۔

(۲) براء بن عازب کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

«إِنَّ أَوَّلَ مَا نَبْدَأُ بِهِ فِي يَوْمِنَا هٰذَا نُصَلِّي ثُمَّ نَرْجِعُ فَنَنْحَرُ»(حواله ايضا، باب سُنَّة الاضحية)

"ہمارے آج کے دن (یعنی عید یوم النحر کے دن) پہلا کام جو ہم کرتے ہیں وہ نماز پڑھنا ہے پھر نماز سے لوٹ کر ہم قربانی کرتے ہیں۔"

اس حدیث میں جس قربانی کا ذکر ہے وہ مدینہ سے متعلق ہے کیونکہ حاجی اس دن عید کی نماز ہی نہیں پڑھتے۔ نیز یہ حدیث کتاب الاضاحی باب سنۃ الاضحیہ میں درج ہونے کی وجہ سے مقامی قربانی ہی قرار دی جاسکتی ہے۔

«كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُضَحِّيْ بِكَبْشَيْنِ وَاَنَا اُضَحِّي بِكَبْشَيْنِ»

رسول اللہ ﷺ دو مینڈھوں کی قربانی کیا کرتے تھے اور میں بھی دو مینڈھوں کی قربانی کرتا ہوں۔ (حوالہ ایضاً' باب فی اضحیۃ النبی.....)

(۴) حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ:

«عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ الضَّحِيَّةُ كُنَّا نُمَلِّحُ مِنْهُ فَنُقَدِّمُ بِهِ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ بِالْمَدِيْنَةِ» (بخاري، كتاب الاضاحي)

"ہم مدینہ میں قربانی کے گوشت کو نمک مرچ لگا کر رکھ دیا کرتے تھے پھر اس کو نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔" (بخاری حوالہ ایضاً)

(۵) ابو امامہ بن سہل انصاری روایت کرتے ہیں۔ کہ ہم مدینہ میں قربانی کو خوب کھلا پلا کر موٹا کرتے تھے۔ اور عام مسلمانوں کا بھی یہی طریقہ تھا۔" (بخاری حوالہ ایضاً)۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اب بخاری کے علاوہ صحاح کی دوسری کتابوں سے بھی چند احادیث ملاحظہ فرما لیجیے۔

(۶) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم مدینہ میں دس سال رہے اور ہمیشہ قربانی کرتے رہے۔" (ترمذی معہ تحفہ الاحوذی ج ۲ ص ۲۵۹)۔

(۷) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قربانی کے دن اللہ تعالیٰ کو انسان کے عملوں سے خون بہانے سے بڑھ کر کوئی عمل محبوب نہیں ہے۔" (حوالہ ایضاً ص ۳۵۲)۔

(۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص استطاعت رکھتا ہو پھر قربانی نہ کرے۔ وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔" (ابن ماجہ اردو ص ۳۸۱ مطبوعہ مکتبہ سعودیہ کراچی نمبر۱)۔

**۳۔ ایک سے زیادہ جانوروں کی قربانی:** اس اقتباس میں ایک طرف تو آپ فرما رہے ہیں کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے قربانی کے جانور امیر حجاج کے ہاتھوں مکہ بھیجے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی فرما رہے ہیں کہ "حاجیوں کی قربانیاں جو وہ آج کل کرتے ہیں محض ایک رسم رہ گئی ہے۔ ایک ایک حاجی پانچ پانچ سات سات دنبے انفرادی طور پر ذبح کر دیتا ہے۔" (ایضاً ص ۵۶)۔

اب ہم تو یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کے جانور (جمع کا صیغہ) مکہ بھیجیں اور ان کی اتباع میں کوئی حاجی پانچ سات دنبے (اگرچہ اس میں مبالغہ آرائی شامل ہے) قربانی کرے تو یہ تو سنت کا اتباع ہوا رسم کیسے بن گئی؟

**مالی ضیاع کی فکر:** پڑھے لکھے طبقہ۔ یعنی ماڈرن مسلمان کو جو ہر شرعی عمل کو مادیت پرستی کی آنکھوں سے دیکھنے کا عادی ہے۔ کو قربانی کے سلسلہ میں مال کے ضیاع کا جو درد اٹھا ہے۔ اس درد میں پرویز صاحب ان کے شریک ہی نہیں بلکہ زیادہ درد مند ہیں۔ چنانچہ وہ صرف کراچی شہر کا حساب لگا کر بتاتے ہیں کہ صرف کراچی شہر میں پندرہ لاکھ روپیہ اس قربانی کی نذر ہو جاتا ہے۔ تو پورے پاکستان کا خود حساب لگا لیجیے۔ (ایضاً ص ۵۶)۔

بجا فرمایا آپ نے۔ اب جو ان سے بھی زیادہ پڑھا لکھا طبقہ ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ دن میں جب پانچ نمازیں فرض ہیں۔ اور ہر نماز باجماعت پر اوسطاً آدھ گھنٹہ صرف ہو تو ایک آدمی کے اوقات کار میں سے روزانہ اڑھائی گھنٹے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور وقت ہی اصل دولت ہے اب اگر پوری قوم کے وقتی ضیاع کا حساب لگایا جائے اور ملکی معیشت پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو بات کہاں تک جا پہنچتی ہے۔

اس پڑھے لکھے طبقہ کو بھولے سے یہ خیال نہ آئے گا کہ پکچرز دیکھنے پر قوم کا روپیہ کس قدر ضائع ہو رہا ہے مزید برآں اس کے اخلاق کیسے بگڑ رہے ہیں وجہ یہ ہے کہ پکچرز دیکھنا اس طبقے کا اپنا پسندیدہ شغل ہے۔ اس مہذب طبقہ کو اگر مالی ضیاع کا درد اٹھتا ہے تو قربانی پر جس سے غریب طبقہ کو بھی عید کی خوشی میں شریک ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**قربانی کا فلسفہ:** پرویز صاحب کے نزدیک قربانی صرف حاجی پر فرض ہے۔ اور اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ جملہ مسلمان جب مکہ اکٹھے ہوں تو اس بے آب وگیاہ وادی میں ایک وقت پاکستان والے باقی ممالک کی اس قربانی کے گوشت سے ضیافت کریں گے دوسرے وقت ایران والے اور تیسرے وقت شام والے پھر اس گوشت کی ضیافت میں دوسرے لوگوں کو بھی شامل کر لیا جائے گا۔ امیروں کو بھی اور غریبوں کو بھی۔ ص (۵۴)

چلئے یوں ہی سہی مگر سوال یہ ہے کہ:

(۱) اس طرح قربانی کے تین دنوں میں کوئی پانچ سات ممالک تو اس کار خیر میں حصہ لے سکیں گے باقی کے چالیس مسلم ممالک کو قربانی سے چھٹی مل جائے گی جب کہ قربانی ہر حاجی پر واجب ہے؟

(۲) ہر حاجی کم از کم ایک قربانی تو ضرور کرتا ہے۔ پھر کچھ زیادہ بھی کرتے ہیں۔ پھر کچھ غیر حاجی اور غیر موجود لوگ بھی وہاں قربانی کے جانور بھیج دیتے ہیں۔ جیسے آپ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ قربانی کے جانور امیر حجاج کے ہاتھوں مکہ روانہ فرمایا کرتے تھے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جتنے حاجی ہوتے ہیں کم از کم ان کی تعداد سے دوگنا جانور ضرور ذبح کیے جاتے ہیں۔ اور آج بھی یہ بات مشاہدہ کی جا سکتی ہے کہ مکہ میں رہنے والوں یا مذبح میں اس موقعہ پر موجود لوگوں کی تعداد حاجیوں کے مقابلہ میں دسواں حصہ بھی نہیں ہوتی۔ اب آپ خود ہی بتا دیجیے کہ قربانی کے گوشت کے ضیاع کا مناسب حل کیا ہو سکتا ہے؟

پھر یہ گوشت کے ضیاع کا مسئلہ بھی وہاں مکہ میں ہی پیدا ہوتا ہے۔ جسے آپ بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ رہا دوسرے شہروں کا معاملہ تو وہاں قربانی کا گوشت قطعاً ضائع نہیں ہوتا۔ وہ سب کا سب امیر یا غریب انسانوں کی خوراک ہی بنتا ہے۔ غالباً پرویز صاحب نے بلدیہ والوں کو کہیں اوجھڑا اٹھاتے دیکھ لیا ہوگا۔ (جسے لوگ ان ایام میں باہر پھینک دیتے ہیں) اور آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ اف کس قدر گوشت ضائع ہو رہا ہے۔

قربانی سے متعلق پرویز صاحب کی "قرآنی بصیرت" پڑھ کر ایک اور صاحب نے اس اجمال کی تفصیل پوچھی تو آپ نے فرمایا۔

"اجمال ہو یا تفصیل بات تو صرف اتنی ہے کہ یہ جو بقر عید کے موقعہ پر ہم ہر شہر اور ہر قریہ اور ہر گلی اور ہر کوچہ میں بکرے اور گائیں ذبح کرتے ہیں۔ یہ قرآن کے کس حکم کی تعمیل ہے؟ اور جواب یہ ہے کہ قرآن میں اس کے متعلق کوئی حکم نہیں یہ ایک رسم ہے جو متوارث چلی آرہی ہے۔" (ایضاً ص ۵۷)

اب دیکھئے قرآن میں اس کے حکم پر ضمناً بحث پہلے آچکی، کچھ بعد میں آئے گی سردست قابل غور یہ بات ہے کہ اگر یہ رسم متوارث ہے۔[1] — — — — — —

---

[1] آگے چل کر ص ۷۰ پر لکھتے ہیں کہ یہ چیزیں (یعنی قربانی وغیرہ) ہزار برس سے امت میں متواتر چلی آرہی ہے۔ یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا بانی کون تھا اور یہ تحریک کیسے پروان چڑھی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



تو پرویز صاحب کو یہ تو سراغ لگانا چاہیے تھا کہ یہ رسم کس دور میں شروع ہوئی اور کس شخص نے ابتداء کی تھی؟

پھر اس کی تفصیلات میں آپ نے بہت سے موضوعات کو چھیڑ کر خلط مبحث کر دیا۔ اور بہت سی باتوں کا رونا رویا ہے۔ کہیں تقلید پرستی کا ذکر ہے۔ کہیں ہندوانہ فلسفہ کا کہیں عجمی سازشوں کا' ملوکیت کا' پیشوائیت کا' تصوف کا' اور کہیں دین اور مذہب کا' گویا یہ سب عوامل ہیں۔ جنہوں نے قربانی اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو متوارث رسوم بنا دیا ہے۔ البتہ ص ۶۲ پر اس موضوع سے متعلق بات کو پھر سے دہرایا ہے اور فرماتے ہیں۔

"سارے قرآن میں ایک جگہ بھی نہیں کہ مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ بھی قربانی دی جائے گی (قربانی کا لفظ بھی قرآنی نہیں۔)" (ایضاً ص ۶۳)

**قربانی کا لفظ قرآن میں:** اب دیکھئے جس لفظ کو ہم اپنی زبان میں قربانی کہتے ہیں۔ اسی لفظ کو عربی زبان میں "قربان" کہتے ہیں۔ مفہوم دونوں کا ایک ہے۔ اور یہ لفظ قرآن میں کئی بار آیا ہے۔ اب اگر پرویز صاحب کو اپنی بات کی پچ میں یہ لفظ نظر ہی نہ آئے تو اس کا کیا علاج ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ ﴾ (المائدۃ ۵/ ۲۷)

"اور (اے محمد) ان کو آدم کے دو بیٹوں کی خبر پڑھ کر سناؤ ان دونوں نے اللہ کے ہاں قربانی پیش کی۔ ان میں سے ایک کی قربانی تو قبول ہوگئی مگر دوسرے کی نہ ہوئی۔"

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

(1) قربانی یا قربان کا لفظ قرآن میں موجود ہے۔ اور اللہ کے حضور قربانی پیش کرنے کا عمل حضرت آدم کے بیٹوں سے آج تک متوارث چلا آرہا ہے۔ اور یہ قربانی کا عمل اس وقت بھی اسی طرح مشروع و معروف تھا۔ ورنہ اس کے قبول اور عدم قبول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(2) حضرت آدم علیہ السلام ایک مخصوص فردِ واحد تھے۔ جب کہ اس بات سے پرویز صاحب نے قصہ آدم و ابلیس میں انکار کیا ہے۔

(3) وہ قربانی کھائی نہیں جاتی تھی۔ (ورنہ ہر حال میں مقبول متصور ہوتی) اس کے باوجود اس مالی ضیاع کو مقبول سمجھا جاتا تھا۔

(4) یہ قربانی حج کے موسم اور مقام پر بھی نہ ہوتی تھی۔ دوسرے مقام پر ہے:

﴿ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ عَهِدَ إِلَيْنَا أَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُولٍ حَتَّىٰ يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ

"جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے عہد کیا ہے کہ ہم اس وقت تک کسی بھی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی لے کر نہ آئے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ (آل عمران ۳/ ۱۸۳)

جس کو آگ آکر کھا جائے اے پیغمبران سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے کئی پیغمبر تمہارے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے اور وہ نشانی بھی جو تم کہہ رہے ہو۔ پھر اگر تم سچے ہو تو ایسے رسولوں کو قتل کیوں کرتے رہے ہو۔"

اس آیت سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

(1) مسلمانوں سے پہلے سابقہ امتوں میں بھی قربانی کا دستور تھا۔ اور یہ قربانی یا قربان کا لفظ قرآن میں موجود ہے۔

(2) قربانی کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا اور اسے انبیاء علیہم السلام بھی بجالاتے تھے اور ان کی امت بھی۔

(3) اس قربانی کی مقبولیت کی علامت یہ تھی کہ آسمانوں سے آگ آتی اور اسے کھا جاتی ہے۔ گویا اس طرح کا مالی ضیاع اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا پسندیدہ عمل تھا۔

(4) اور یہ بات سابقہ امتوں میں اتنی معروف و مشہور تھی کہ وہ نئے مبعوث انبیاء سے بطور تصدیق ایسی "مقبول قربانی" کا مطالبہ کرتے تھے گویا اسی طرح کی مقبول نشانی جسے آگ کھا جائے انبیاء کی شناخت کا معروف ذریعہ علامت تھی۔

اب دیکھئے قربانی کے گوشت کو خود کھانے اور دوسروں کو کھلانے کی رعایت بھی صرف امت محمدیہ کو ملی ہے۔ ورنہ پہلے تمام تر قربانی "مالی ضیاع" ہی ہوتا تھا۔ اب پرویز صاحب کا فلسفہ قربانی ملاحظہ فرمایئے۔ ان کے خیال میں مکہ میں بھی اتنی ہی قربانی مناسب ہے جو ضیافتوں کی صورت میں انسانی خوراک بن سکے اور جو قربانی خواہ مخواہ بچ جائے تو اس کو پرویز صاحب اور پڑھا لکھا طبقہ مالی ضیاع کا نام دیتے ہیں۔ اور قوم کے درد میں ان کے سینہ میں ہوک سی اٹھنے لگتی ہے۔ اب خود ملاحظہ فرمایئے کہ شریعت کے پیش کردہ فلسفہ قربانی اور ان حضرات کے پیش کردہ فلسفہ قربانی میں کتنا فرق ہے۔

لفظ نحر کی لغوی تحقیق: ایک تیسرے مستفسر نے قربانی کے وجوب کی دلیل ﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴾ سے پیش فرمائی۔ تو پرویز صاحب نحر کی لغوی تحقیق پیش کرتے ہوئے۔ اس لفظ کے معنی چھاتی کے اوپر کا مقام' سینہ پر ہاتھ باندھنا' نماز میں ہاتھ پر ہاتھ باندھنا اور آخر میں اس کے معنی اونٹ ذبح کرنا بتاتے ہیں۔

پرویز صاحب کی یہ لغوی تحقیق بھی ناقص اور نامکمل ہے۔ امام راغب نے نَحرُ البعیر کے معنی اونٹ کے سینہ میں برچھا مار کر اسے ذبح کرنا لکھا ہے۔ نہ کہ محض نحر کے معنی اونٹ ذبح کرنا۔ گویا نحر سے مراد صرف ذبح یا قربانی کرنا ہے۔ اور صاحب منجد کے نزدیک نحر کے معنی گلے میں چوٹ لگانا۔ ذبح کرنا انْتَحَرَ بمعنی خود کشی کرنا۔ اَلْمَنْحَرُ گلے میں زخم لگانے کی جگہ اور النَّحِیْر کے معنی ذبح کیا ہوا جانور ہے۔ گویا نحر کے معنی اونٹ ذبح کرنا نہیں۔ بلکہ محض ذبح کرنا یا قربانی کرنا ہے۔

پھر فرمایا اب تمام مختلف معانی میں سے اگر نحر کے معنی اونٹ ذبح کرنا ہی لیے جائیں۔ تو پھر اس سے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



(۱) قربانی کرنا اور وہ بھی (۲) ہر گلی کوچہ میں قربانی کرنا کس طرح ثابت ہو سکتا ہے؟ ﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴾ میں صل (نماز پڑھ) اور انحر (اونٹ ذبح کرنے) کا حکم مطلق (عام) ہے۔ اسے مقید (خاص) کر کے صل سے مراد "عید کی نماز" اور انحر سے مراد اونٹ کی قربانی کس اصول کے تحت کی جا سکتی ہے؟" (ایضاً ص ۷۳)۔

معلوم ہوتا ہے اس مقام پر پرویز صاحب کچھ بوکھلا سے گئے ہیں۔ ہم تو ثابت ہی یہ کر رہے ہیں۔ کہ انحر سے مراد محض قربانی کرنا ہے اونٹ قربانی کرنا نہیں۔ اور صل سے مراد محض نماز پڑھنا ہے" عید کی نماز پڑھنا نہیں پھر جس طرح صل کا لفظ عام ہے اور نماز ہر جگہ اپنے وقتوں پر پڑھی جاتی ہے۔ اسی طرح قربانی کا حکم بھی عام ہے اور یہ ہر جگہ ہونی چاہیے۔ اپنے وقت پر (یعنی قربانی کے دن بھی) اور اس سے آگے پیچھے بھی۔ یہی کچھ تو ہم کہتے ہیں پھر اور کیسے اصول کا آپ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں؟ اور ہمارا سوال صرف یہ ہے کہ جب یہ نماز اور قربانی کا حکم عام ہے تو آپ اس سے عید کی نماز اور اس دن کی قربانی کو خارج کیسے کر سکتے ہیں؟ خواہ یہ کسی بھی مقام پر ہوں؟ فصل لربک وانحر میں بھی عمومیت پائی جاتی ہے اور اسی طرح درج ذیل آیت میں بھی۔

﴿ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٢﴾ ﴾ (الأنعام ٦/ ١٦٢)

اے پیغمبر! آپ کہہ دیجیے کہ میری نماز میری قربانی' میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

**سورہ کوثر اور اونٹ:** آخر میں پرویز صاحب نے سورہ کوثر کی لاجواب تفسیر فرمائی۔ اس تفسیر کا مرکزی خیال "اونٹ" ہے اور اس کے نکات درج ذیل ہیں۔

① یہ سورہ ہجرت سے پہلے ہی نازل ہوئی جب کہ مشرکین مکہ نے آپ پر قافیہ زیست تنگ کر رکھا تھا۔

② اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو خیر کثیر کی بشارت بھی دی اور یہ بھی بتا دیا آپ کا دشمن ہی خائب وخاسر رہے گا۔

③ اس سورہ میں آپ ﷺ کو اونٹ کی قربانی کا حکم دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ آپ ہجرت کر کے مدینہ جا رہے تھے۔ وہاں یہود آباد تھے۔ اور ان پر اونٹ حرام تھا۔ ان کے ساتھ سمجھوتہ کی صورت میں ان کے جذبات کا احترام ضروری تھا۔ لیکن قرآن نے پہلے ہی کہہ دیا کہ ان سے سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ ان کے علی الرغم اونٹوں کو ذبح کیا جائے گا۔ یعنی وہاں بھی غلبہ تمہارا ہی رہے گا۔ (قرآنی فیصلے ص ۷۴ ملخصاً)

اب دیکھئے کہ:

(۱) اگر نحر کے معنی اونٹ کی قربانی کی بجائے صرف قربانی لیے جائیں (جیسا کہ میں مفردات اور منجد کے حوالے پیش کر چکا ہو) تو اس تفسیر کی عمارت از خود دھڑام سے نیچے گر جائے گی۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



(۲) آپ فرما رہے ہیں کہ یہود سے سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ حالانکہ آپ نے مدینہ جاتے ہی ان سے سمجھوتہ کیا جو میثاقِ مدینہ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ البتہ اس میثاق میں اونٹ' اس کی قربانی اور یہودیوں کے جذبات وغیرہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

(۳) پھر اس تفسیر کے نتیجہ کے طور پر چند نکات پیش فرمائے ہیں۔ ان میں سے ہم صرف انہی کا جواب دیں گے جن کا جواب پہلے نہیں آیا۔

(ا) آپ فرماتے ہیں "عام روایات کے مطابق سورہ کوثر مکہ میں نازل ہوئی تھی اور اس وقت نہ عید و بقر عید کی نماز تھی (حتیٰ کہ جمعہ کی نماز بھی نہیں) اور نہ ہی قربانی کا کوئی سوال تھا"

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم نحر کے معنی صرف قربانی کرنا قرار دے رہے ہیں۔ اس میں نہ اونٹ کی قربانی کی قید ہے۔ نہ بقر عید کے دن کی قربانی کی۔ یعنی قربانی کسی بھی جانور کی دی جا سکتی ہے۔ اور کسی وقت بھی دی جا سکتی ہے۔ پھر جب یہ حکم اتنا عام ہے تو اس سے بقر عید کے دن کی قربانی کو خارج بھی کیسے کیا جا سکتا ہے؟

(۲) اگر وانحر سے مراد "قربانی" ہے تو اس حکم کے مطابق قربانی اونٹ کی دی جانی چاہیئے نہ کہ بھیڑ بکری اور گائے بیل کی۔ نحر کا لفظ اونٹ ذبح کرنے کے لیے خاص ہے اور جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔" (ایضاً ص ۷۶)

جواب: نحر کا لفظ اونٹ کی قربانی کے لیے خاص نہیں ہے۔ اور یہ لفظ اور جانوروں کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ منجد کے حوالہ سے واضح کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے جانوروں کی قربانی کے سلسلہ میں درج ذیل آیت بھی وضاحت کر رہی ہے۔

﴿ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ﴾ (الحج ۲۲/ ۳٤)

اور ہم نے ہر ایک امت کے لیے قربانی کا طریق مقرر کیا تاکہ جو مویشی چارپائے اللہ نے ان کو دیئے ہیں۔ (ان کے ذبح کرنے کے وقت) ان پر اللہ کا نام لیں۔

بہیمۃ الانعام میں بھیڑ' بکری' مینڈھا' گائے' بیل اونٹ وغیرہ نرمادہ سب شامل ہیں۔ لہٰذا ان سب جانوروں کی قربانی جائز ہوئی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان جانوروں کی قربانی سابقہ امتوں پر بھی واجب تھی۔

۳۔ اپنے دعویٰ کی خود تردید: آپ فرماتے ہیں کہ "مدینہ میں یہودیوں کی خواہش کے علی الرغم اونٹوں کو ذبح کیا جائے گا۔ اور غلبہ تمہارا ہی رہے گا۔ گویا یہ دونوں کام مدینہ میں ہوئے۔ پھر جب آپ خود ہی مدینہ میں اونٹ کی قربانی تسلیم فرما رہے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مکہ کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی قربانی اللہ کی منشاء کے مطابق ہوتی رہی ہے اور ہو سکتی ہے۔ اور یہی کچھ ہم کہتے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ④ اطاعتِ والدین

**اطاعتِ والدین قرآن کی رو سے غیر ضروری ہے :** اطاعت والدین کو غیر ضروری اور خلاف قرآن بتاتے ہوئے جناب پرویز صاحب رقم طراز ہیں کہ:

"دنیا کے تمام مذاہب اور اخلاق کے دبستانوں میں یہ چیز (اطاعت والدین) ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔" ایسے مسلّمہ کی حیثیت جو کسی بھی غور وفکر یا تنقید و تبصرہ کا محتاج ہی نہیں۔ ان کے ہاں کبھی کسی نے اتنا خیال کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس میں دو راہیں ہو سکتی ہیں لیکن قرآن کو دیکھئے کہ اس نے دنیا میں پہلی بار یہ آواز بلند کی ہے جو لوگ عقل کے انحطاط کے دور میں جا چکے ہوں ان کے فیصلے واجب الاتباع نہیں ہوا کرتے۔ ماں باپ حسنِ سلوک اور نرم برتاؤ کے مستحق ہیں۔ اور بس جب تک بچہ بچہ ہے اس کے نگران اور کفیل ہیں۔ جب وہ عقل کی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو اپنے لیے آپ فیصلے کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے تجربوں سے مشورہ فائدہ تو اٹھا سکتا ہے لیکن اسے ان کے فیصلوں کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔" (قرآنی فیصلے ص۱۲۸)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

① اخلاق کے تمام دبستان اور دنیا کے تمام مذاہب اطاعتِ والدین کی فرضیت پر متفق ہیں۔ ان مذاہب میں وہ اہل کتاب بھی شامل ہیں۔ جن پر وحی الٰہی نازل ہوتی رہی۔ گویا اطاعتِ والدین ان سب انبیاء کی تعلیم کا ایک حصہ ہے۔

② پھر ان مذاہب میں مسلمان بھی شامل ہیں جنہیں قرآن جیسی کتاب دی گئی۔ اس کتاب قرآن میں پہلی بار یہ صدا بلند کی گئی کہ اطاعت والدین ایک بے معنی چیز ہے لیکن قرآن کی اس صدا پر مسلمانوں نے کان تک نہ دھرا۔ اور وہ بھی دوسرے مذاہب کی طرح اطاعتِ والدین کو فرض ہی سمجھتے رہے۔ تا آنکہ ادارہ طلوعِ اسلام نے قرآن کی اس پہلی بار کی صدا کا صحیح مفہوم سمجھا اور وہ مفہوم یہ ہے کہ "والدین کے فیصلے واجب الاتباع نہیں ہوا کرتے۔"

③ ماں باپ صرف اپنی اولاد سے حسن سلوک اور نرم برتاؤ کے مستحق ہیں اور بس یعنی اطاعت کے بغیر بھی نرم برتاؤ اور حسن سلوک ممکن ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**اطاعتِ والدین کے نقصانات:** پھر اپنے اس موقف کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ:

"جب تک ماں باپ زندہ ہیں ان کا لڑکا خواہ ساٹھ ستر برس کا ہی کیوں نہ ہو جائے اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے اپنی صوابدید کے مطابق کرے۔ اسے ان کے فیصلوں کی تعمیل کرنی ہوگی۔ جن کی عقل کے متعلق اس کے خدا کا فیصلہ ہے کہ اس عمر میں اوندھی ہو جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کو فرض سمجھنے والی اولاد ساری عمر عقلی طور پر اپاہج اور ذہنی طور پر بچے کے بچے رہ جاتے ہیں۔" (ایضاً ص۱۲۹)

اب دیکھئے اقتباسِ بالا میں آپ نے جو مثال پیش فرمائی ہے وہ عقلی اور نقلی دونوں لحاظ سے درست نہیں۔ عقلی لحاظ سے اس طرح کہ جو اولاد خود ساٹھ ستر برس کی عمر کو پہنچ چکی ہے اس کے والدین سو سال کے لگ بھگ ہی ہو سکتے ہیں۔ اس عمر میں وہ اپنی نان شبینہ حتیٰ کہ نقل وحرکت تک کے لیے دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس حالت میں وہ کیا فیصلے دے سکتے ہیں۔ اور اولاد کو کیسے حکم دے سکتے ہیں؟ وہ تو اس عمر میں اپنی رائے بھی بتانے کے اہل نہیں رہتے۔ پھر یہ بھی غور کیجیے کہ جو اولاد ساٹھ ستر برس کی عمر کو پہنچ چکی ہے وہ تو خود ارذل العمر کی حدود میں داخل ہو چکی ہے۔ پھر اسے کیا حق ہے کہ وہ اپنے فیصلے آپ کرے۔ اب فیصلے کرنے کے لیے اس کی اولاد موجود ہے۔ جو کم از کم چالیس سال کی عمر تک پہنچ کر عقل کی پختگی حاصل کر چکی ہے۔ لہٰذا ساٹھ ستر سال کی اولاد کے لیے اور اس واقعاتی دنیا میں اطاعت والدین کا سوال بھی کم ہی پیدا ہوتا ہے۔

اور نقلی لحاظ سے یہ مثال اس لیے غلط ہے کہ قرآن نے یہ کہیں نہیں کہا کہ اس عمر میں لوگوں کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔

﴿ وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِى ٱلْخَلْقِ ﴾ (یس ۳۶/ ۶۸) "اور جس کو ہم بڑی عمر دیتے ہیں اسے خلقت میں اوندھا کر دیتے ہیں۔"

یعنی بچے سے جوان کرتے ہیں پھر جوان سے بوڑھا کر دیتے ہیں۔ جوانی میں وہ طاقت ور تھا۔ بڑھاپے میں وہ کمزور ہو جاتا ہے پہلے اس کا جسم بھرا ہوا اور سڈول تھا۔ بڑھاپے میں وہ نحیف اور نزار ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں اس کی خلقت کے اوندھا ہونے کا ذکر ہے عقل کا نہیں۔ اس مضمون سے ملتی جلتی دوسری آیت یہ ہے:

﴿ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰٓ أَرْذَلِ ٱلْعُمُرِ لِكَىْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ﴾ (النحل ۱۶/ ۷۰) اور تم میں سے کچھ ایسے ہیں جو خراب عمر کو پہنچ جاتے ہیں اور جاننے کے بعد بے علم ہو جاتے ہیں۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی یادداشت کمزور ہو جاتی ہے وہ اپنا سابقہ حاصل کیا ہوا علم بھی بھول جاتے ہیں۔ اس آیت میں بھی عقل کے اوندھے ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**اطاعت کس عمر میں؟:** آپ فرماتے ہیں جب تک بچہ بچہ ہے وہ (والدین) اس کے نگران اور کفیل ہیں۔ جب وہ عقل کی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو اپنے لیے اپ فیصلے کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔" (ایضاً ص ۱۳۸)۔

اب دیکھئے بچہ جب تک والدین کی نگرانی اور کفالت میں ہوتا ہے۔ وہ ان کی نافرمانی کر ہی نہیں سکتا۔ ورنہ اس کی تعلیم و تربیت رک جاتی ہے۔ پھر نابالغ ہونے کی وجہ سے وہ شرعی احکام کا مکلف ہی نہیں ہوتا۔ اطاعت والدین کا سوال ہی اس وقت تک پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ عاقل و بالغ ہو جائے۔ یعنی پندرہ سولہ سال کی عمر (پرویز صاحب کی زبان میں نکاح کی عمر) کا ہو جائے۔ اور یہی وہ عمر ہوتی ہے جس میں جوانی کا جوش جذبات کی فراوانی اور عقل کی ناپختگی ہوتی ہے۔ اور درحقیقت یہی وہ دور ہوتا ہے جس میں بچہ کو والدین کی اطاعت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ تاآنکہ وہ اپنی عقل کی پختگی تک نہ پہنچ جائے اور یہ عقل کی پختگی عموماً چالیس سال کی عمر میں جاکر تکمیل کو پہنچتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے۔

﴿ حَتَّىٰٓ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُۥ وَبَلَغَ أَرۡبَعِينَ سَنَةً ﴾ "یہاں تک کہ انسان اپنی پختہ عمر کو یعنی چالیس سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے۔" (الأحقاف ٤٦/ ١٥)

گویا عقل کی پختگی کا معیار اللہ تعالیٰ کے ہاں چالیس سال کی عمر ہے۔

اب پرویز صاحب اس جذباتی دور کو جو بلوغت سے لے کر پختگی عمر تک ہوتا ہے اور جس میں والدین کی اطاعت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یکسر گول کر جاتے ہیں اور لکھتے ہیں "کہ جب تک بچہ بچہ ہے والدین اس کے نگران اور کفیل ہیں۔ جب وہ عقل کی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنے فیصلے آپ کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔" (حوالہ ایضاً)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کو اپنے اس "گھپلے" کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اس میں شبہ نہیں کہ ہماری موجودہ معاشرت (جس میں خاندانوں میں مشترکہ زندگی بسر ہوتی ہے) عائلی زندگی کا تقاضا ہے کہ افراد خاندان متفقہ فیصلوں کے ماتحت زندگی کی منازل طے کریں اور خود سر اور سرکش نہ ہو جائیں لیکن خودسری اور سرکشی اور شے ہے اصابت رائے اور شے "پھر اس عبارت پر حاشیہ دے کر فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ یاد رکھئے خود فیصلے کرنے کے لیے عقل کی پختگی اور رائے کی اصابت لاینفک شرط ہے۔ اس لیے بچہ جب تک اس منزل تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک اسے لامحالہ بڑوں کے فیصلوں کے مطابق چلنا ہوگا۔" (حوالہ ایضاً ص ۱۳۹) اب قابلِ غور امور یہ ہیں کہ:

① کیا بڑوں میں والدین شامل ہوتے ہیں یا نہیں؟ یا صرف اطاعت والدین کی مخالفت میں ان بڑوں میں والدین کا نام لینا گوارا نہیں کیا گیا؟

② قرآن نے جو پہلی بار صدا بلند کی تھی کہ بڑوں کے فیصلے واجب الاتباع نہیں ہوتے اس صدا کے خلاف اب آپ خود ہی کیوں نوجوانوں کو ایسے مشورے دینے لگے۔

③ اب اگر چھوٹے بڑوں کے فیصلوں کے پابند ہوں گے تو اس طرح تو وہ عقلی لحاظ سے اپاہج بن جائیں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



گے۔ اس بات کا آپ کے پاس کیا علاج ہے؟

**اطاعتِ والدین قرآن کی رو سے فرض ہے:** ارشاد باری ہے:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾ (العنکبوت ۲۹/ ۸)

"اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور اگر تیرے والدین اس بات کے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے جس کی حقیقت کا تجھے علم نہیں تو پھر ان کی اطاعت نہ کر۔"

اور سورہ لقمان میں فرمایا:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿١٤﴾ وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ﴾

(ابراھیم ۳۱/ ۱۴۔۱۵)

"اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں تاکیدی حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے اسے تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اٹھایا اور دو سال تک دودھ پلایا۔ یہ کہ تو میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرے (تم سب کو) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور اگر والدین اس بات کے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے جس کا تجھے علم نہیں تو پھر ان کی اطاعت نہ کرنا۔ تاہم دنیوی امور میں ان کا اچھی طرح ساتھ دے۔"

ان آیات سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں:

1. ماں باپ سے حسنِ سلوک ہر حالت میں فرض ہے۔ خواہ والدین مشرک ہوں یا کافر جوان ہوں یا بوڑھے۔
2. اگر والدین اولاد کو شرک (یا دوسرے اللہ کی معصیت کے کاموں پر) پر مجبور کریں تو یہی ایک صورت ہے کہ ان کی پیروی نہ کی جائے۔ باقی سب حالتوں میں ان کی اطاعت لازم ہے اس طرح اولاد اپنے والدین پر کوئی احسان نہیں کرتی بلکہ اپنا فرض ادا کرتی ہے۔
3. اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر کے بعد ساتھ ہی والدین کے شکر کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے لہٰذا اس کا شکر واجب ہوا اور والدین اولاد کے لیے واسطہ تربیت ہیں۔ لہٰذا اللہ کے بعد دوسرے نمبر پر ان کا شکر بھی واجب ٹھہرایا۔ یہ ہے مقام والدین۔

**کیا اطاعت کے بغیر والدین سے حسنِ سلوک ممکن ہے؟:** اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



نے بے شمار مقامات پر والدین سے حسنِ سلوک یا نیکی کا برتاؤ کرنے کی جو تاکید فرمائی ہے تو کیا یہ اطاعت والدین کے بغیر ممکن بھی ہے یا نہیں؟ اس بارے میں درج ذیل آیات ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

﴿ وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُن جَبَّارًا عَصِيًّا ﴾ (مریم ۱۹/ ۱۴)

"اور وہ (یعنی حضرت یحییٰ) اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے والے تھے اور ان پر دباؤ ڈالنے والے یا نافرمان نہ تھے۔"

معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے والدین کا' خواہ وہ کسی عمر میں ہوں۔ سرکش اور نافرمان ہو وہ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا" نہیں ہو سکتا گویا حسنِ سلوک کے لیے دو باتیں ضروری ہیں (۱) نرمی (۲) فرمانبرداری۔

**بڑھاپے میں بھی اطاعت والدین ضروری ہے:** اب ہم پرویز صاحب کی اس بات کو پھر سامنے لاتے ہیں کہ: لیکن قرآن کو دیکھئے کہ اس نے دنیا میں پہلی بار یہ صدا بلند کی ہے کہ جو لوگ عقل کے انحطاط کے دور میں پہنچ چکے ہوتے ہیں' کے فیصلے واجب الاتباع نہیں ہوا کرتے۔" (ایضاً ص۱۲۸) اب قرآن اس سلسلہ میں جو کچھ کہتا ہے وہ بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسماعیل سے فرماتے ہیں۔

﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ﴾ (الصافات ۳۷/ ۱۰۲)

تو جب حضرت اسماعیل اپنے باپ حضرت ابراہیم کے کاموں میں حصہ لینے کی عمر کو پہنچے تو حضرت ابراہیم نے کہا "اے میرے پیارے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب تم دیکھو کہ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ حضرت اسماعیل نے کہا اے میرے باپ جو آپ کو حکم ہوا وہی کچھ کیجیے۔

---

۱۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اس وقت پیدا ہوئے جب حضرت ابراہیم بوڑھے ہو چکے تھی۔

۲۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حضرت اسماعیل عاقل وبالغ ہو چکے تھے۔ ان میں کم از کم اتنا عقل وشعور آچکا تھا کہ ان سے رائے لی جا سکے۔

۳۔ اللہ کا حکم حضرت ابراہیم کو ہوا تھا حضرت اسماعیل کو نہیں ہوا تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود حضرت اسماعیل نے والد کی اطاعت کی وہ مثال قائم کی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی نہ اس واقعہ سے پہلے اور نہ اس کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے سے بھی انکار نہیں کیا۔ اور یہ نہیں سوچا کہ یہ تو خواب کی بات ہے یا یہ کہ نعوذ باللہ اب باپ بوڑھا ہو گیا ہے جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔ یا یہ کہ باپ تو محض میری رائے پوچھ رہا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



ہے کوئی حکم تو نہیں دے رہا۔ یا یہ کہ اگر خواب میں حکم ہوا ہے تو میرے باپ کو ہوا ہے مجھے تو نہیں ہوا' بلکہ اپنے باپ کی منشاء کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فَلَمَّا اَسْلَمَا کہہ کر اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کہ حضرت اسماعیل کی اپنے باپ کے منشاء کی اطاعت بھی عین اللہ کی اطاعت تھی کیا اس سے بڑھ کر بھی بوڑھے والدین کی اطاعت کے سلسلہ میں قرآن سے کوئی ثبوت درکار ہے؟

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی　　سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

نتائج: تصریحات بالا سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

① بلوغت سے پہلے انسان ویسے ہی کافی حد تک والدین کی اطاعت پر مجبور ہوتا ہے۔ اور یہ سوال دراصل ہے بھی خارج از بحث کیونکہ اس عمر میں انسان شرعی احکام کا مکلف نہیں ہوتا۔

② بلوغت سے لے کر چالیس سال کی عمر تک (یعنی پختگی عقل یا اصابت رائے کی عمر تک) جو چالیس سال کی عمر کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ انسان کو والدین کی اطاعت ضرور کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس عمر میں جوانی کا جوش اور جذبات میں شدت انسان کی عقل پر غالب ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنا نفع نقصان بھی درست طور پر سوچنے کے قابل نہیں ہوتا اور اس کی اپنی عافیت بھی اسی بات میں ہوتی ہے کہ وہ بڑوں کی اطاعت کرے۔

③ چالیس سال کی عمر کے بعد اس کی عقل پختہ ہو جاتی ہے لیکن والدین کہولت کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں۔ والدین خود ہی اولاد کے محتاج ہونے کی وجہ سے اپنا کوئی حکم اپنی اولاد کے سر تھوپ نہیں سکتے۔ تاہم اس عمر میں بھی اولاد اگر اپنے والدین کی مرضی کو مقدم رکھے تو یہ بہت بڑی سعادت ہے۔ اگر کہیں اختلاف واقع ہو جائے۔ پھر بھی اولاد کو یہ حق نہیں کہ وہ ان سے بحث وجدال کرے یا ان کو دبائے۔ بلکہ حکم یہ ہے ایسی حالت میں بھی ان کو اف تک نہ کہے اپنی بات نرمی سے پیش کر کے والدین کو بدلائل قائل کرنے کی کوشش کرے اور دنیوی امور میں یعنی ان کے قیام وطعام کے سلسلہ میں ان کی خدمت دل وجان سے کرے۔

④ اگر والدین اللہ سے شرک کرنے یا معصیت کے کاموں پر اولاد کو مجبور کریں یعنی اللہ کے مقابلے میں کوئی حکم دیں تو ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ خواہ یہ ان کی عمر کا کوئی دور ہو۔

اصل مسئلہ طلاق: اب اصل مسئلہ کی طرف آیئے جس کی بناء پر پرویز صاحب نے قرآن کی یہ پہلی بار صدا کا مطلب سمجھانا شروع کر دیا۔ وہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی سائل نے یہ سوال لکھ بھیجا کہ میرے والدین نے میری شادی اپنی مرضی کے مطابق کی۔ اب وہ میری بیوی سے ناراض ہیں اور مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں اسے طلاق دے دوں۔ حالانکہ اس بیوی سے میرے تعلقات خوشگوار ہیں اور میں اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ تو والدین کا نافرمان ہے۔ لہٰذا خدا کے عذاب میں ماخوذ ہو جائے گا۔ اب

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



بتایئے اس بارے میں قرآن کا کیا حکم ہے" (ایضاً ص۱۲۶)

اب دیکھئے کہ اس واقعہ میں ایک کے بجائے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔

ایک پہلو یہ ہے کہ والدین پختہ عقل کے ہیں اور لڑکا عقل خام کے دور میں ہے۔ جب کہ جذبات (اور بالخصوص شہوانی جذبات) عقل پر غالب رہتے ہیں۔ لہٰذا والدین ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ اس بیوی کے گھر میں رہنے سے آئندہ ہمارے خاندان پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ نیز جب وہ طلاق دینے پر مجبور کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ لڑکے کے دوسرے نکاح کی ذمہ داری بھی قبول کر رہے ہیں۔ یہ سب باتیں والدین کی اطاعت کے حق میں جاتی ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ طلاق کو اللہ تعالیٰ نے ابغض الحلال فرمایا ہے لہٰذا اس سے حتی الوسع پرہیز لازم ہے۔ پھر اس میں بہو ساس کی زبان زد عام مناقشت کا پہلو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اور اس مناقشت میں قصور عموماً فریقین کا ہوتا ہے۔ کسی کا تھوڑا کسی کا زیادہ یہ پہلو لڑکے کے حق میں جاتا ہے۔

اندریں صورت ایسے معاملات کا فیصلہ ثالث کی صورت میں ہوگا۔ خواہ یہ ثالث مرد کی برادری سے تعلق رکھتا ہو یا عورت کی برادری سے یا دونوں سے یا یہ کہ حکومت ثالث ہو۔

ایسا ہی ایک واقعہ دور نبوی ﷺ میں پیش آیا تھا۔ "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ لیکن میرا باپ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) اسے ناپسند کرتے تھے۔ لہٰذا میرے باپ نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں۔ مگر میں نے انکار کیا۔ اور معاملہ رسول اللہ کے سامنے پیش کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اے عبداللہ (ابن عمر) اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔" (ترمذی' ابواب الطلاق' باب رجل یسالہٗ ابوہ ان یطلق إمراتہ)

رسول اللہ کا یہ فیصلہ بحیثیت قاضی کا تھا۔ جو آپ نے تمام امور پر غور کرنے کے بعد فرمایا تھا۔ اب اگر منکرین حدیث اس واقعہ کو محض حدیث میں ہونے کی وجہ سے حجت نہ سمجھیں تو بھی یہ معاملہ قرآن کریم کے حکم ﴿ فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ﴾ کے مطابق تھا اور یہ تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ سب صحابہ و صحابیاتؓ کے لیے حکم تھے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ⑤ ناسخ و منسوخ

ناسخ و منسوخ پر بحث کرنے سے پیشتر پرویز صاحب حسب عادت روایات کا رونا روتے اور ان پر برسنے سے اس کا آغاز فرماتے ہیں پھر آیت مانَنسَخ کی تمہید کے طور پر دو باتیں بیان فرمائیں جو درج ذیل ہیں۔

مَانَنسَخ مِنْ اٰیَةٍ کا پرویزی مفہوم: (۱) سابقہ انبیاء پر جو احکام بذریعہ وحی نازل ہوتے تھے وہ وقتی اور عارضی ہوتے تھے۔ جب کوئی نیا نبی آتا تو اس کے لیے احکام پہلے احکام سے مختلف ہوتے تھے کیونکہ زمانہ کے تقاضے بدل چکے ہوتے تھے۔ قرآن میں بھی ایسے نئے احکام نازل ہوئے جو سابقہ انبیاء پر نازل شدہ شریعت کے احکام سے مختلف ہیں۔ اور بہتر اس لیے ہیں کہ اب غیر متبدل ہیں اور قیامت تک کے ادوار کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں۔ یہ ہے مفہوم مَا نَنسَخ مِنْ اٰیَةٍ.... نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا کا۔

(۲) سابقہ انبیاء کی وحی کا اکثر حصہ حوادث ارضی وسماوی کی وجہ سے یا خود انسانی دسیسہ کاریوں کے باعث فراموش ہو جاتا تھا۔ بعد میں آنے والا رسول اس فراموش شدہ حصہ کو منجانب اللہ حاصل کر کے پھر لوگوں کو دے جاتا تھا۔ ایسا فراموش شدہ حصہ جس کا باقی رکھنا مقصود تھا اسے قرآن دوبارہ لے آیا یہ مفہوم ہے اَوْنُنْسِهَا..... اَوْمِثْلِهَا کا۔

ترجمہ میں خود ساختہ اضافے: اب دیکھئے اہل کتاب کا اعتراض یہ تھا کہ اگر قرآن بھی اس خدا کی طرف سے ہے تو بعینہ ان کی کتابوں جیسا کیوں نہیں اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ مَا نَنسَخْ مِنْ ءَايَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ أَوْ مِثْلِهَآ ﴾ (البقرة ۲/ ۱۰۶)

(پرویزی ترجمہ) ہم جن سابقہ احکام کو منسوخ کر دیتے ہیں ان کی جگہ جدید نبی کی وساطت سے ان سے بہتر احکام بھیج دیتے ہیں۔ اور سابقہ تعلیم میں جو حصہ فراموش کر دیا جاتا ہے۔ اس کی جگہ اس کی مثل لے آتے ہیں۔ (قرآنی فیصلے ص ۲۳۷)

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مندرجہ پرویزی ترجمہ یا مفہوم میں سابقہ اور جدید نبی کی وساطت سے کن قرآنی الفاظ کا ترجمہ ہے؟ نیز یہ کہ اَوْنُنْسِهَا کا ترجمہ ہم فراموش کر دیتے ہیں" کے بجائے فراموش کر دیا جاتا ہے" گرامر کے کس قاعدہ کی رو سے کیا گیا ہے؟ کیا یہ بات تو نہیں کہ پرویز صاحب نے پہلے ایک نظریہ قائم کیا پھر اس آیت کے مفہوم میں اپنی ضرورت کے مطابق اپنی طرف سے اضافہ کر کے اس نظریہ کو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



ثابت کر دکھایا۔ اور یہی کچھ یہودی کیا کرتے تھے۔

پھر اس نظریہ کی تائید میں جو دوسری آیت آپ نے پیش فرمائی اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"یہی اسلوب قرآن میں کارفرما ہے چنانچہ منکرین قرآن کا یہ اعتراض سورہ نحل میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿ وَإِذَا بَدَّلْنَآ ءَايَةً مَّكَانَ ءَايَةٍ وَٱللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوٓاْ إِنَّمَآ أَنتَ مُفْتَرٍۭ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾ ﴾
(النحل ١٦/ ١٠١)

"جب ہم ایک پیغام کی جگہ دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کر رہا ہے۔ تو یہ کہتے ہیں کہ اے رسول! تو یہ کچھ اپنی طرف سے کہتا ہے کیونکہ یہ ان کتابوں سے الگ ہے جو ہمارے پاس ہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جانتے نہیں (کہ وحی کا اسلوب کیا ہے)"

دیکھئے بات کس قدر واضح ہے۔" (قرآنی فیصلے ص ۲۳۷)۔

اب دیکھئے اس آیت سے بات تو اسی قدر واضح ہوتی ہے کہ پرویز صاحب نے آیت کا ترجمہ پیغام بیان فرمایا ہے جو لغوی لحاظ سے غلط ہے۔ باقی جس قدر بات واضح ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیت پرویز صاحب کے نظریہ کی تردید کر رہی ہے۔ کیونکہ اس میں دوران نزول قرآن تبدیلی آیات کا ذکر ہو رہا ہے اس آیت کے کسی لفظ سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں آیت سے مراد سابقہ احکام ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سابقہ کس لفظ کا ترجمہ ہے۔ نیز یہ کہ اگر حکم یا پیغام کو بدل کر لانا ہی وحی کا اسلوب ہے۔ تو نزول قرآن کے ۲۳ سالہ عرصہ میں یہ اسلوب کیوں بدل گیا؟ اور کون سی بات اس دوران اس اسلوب کو بدلنے سے مانع ہوئی۔

پھر فرماتے ہیں "اسی تنسیخ آیات یا تبدیلی احکام سابقہ کے متعلق سورہ رعد میں ہے۔

﴿ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِـَٔايَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ ٱللَّهِ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ﴿٣٨﴾ يَمْحُواْ ٱللَّهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِندَهُۥٓ أُمُّ ٱلْكِتَٰبِ ﴿٣٩﴾ ﴾
(الرعد ١٣/ ٣٨-٣٩)

"کس رسول کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی پیغام لے آتا۔ (خدا کا قانون اس باب میں یہ ہے کہ) ہر معیاد کے لیے ایک حکم معین ہے۔ (اس قانون کے مطابق) اللہ جس (پیغام) کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس اصل کتاب کے مطابق ہوتا رہتا ہے جو تغیرات سے ماورا ہے۔"

یہ تو ہوا پیغامات سابقہ کی جگہ دوسرے پیغام لانے کی بابت" (قرآنی فیصلے ص ۲۳۸)

اب دیکھئے جہاں تک احکام کی تبدیلی کا تعلق ہے۔ اس بات سے تو کسی کو انکار نہیں پرویز صاحب کا موقف یہ ہے کہ اس تبدیلی احکام کی صورت صرف سابقہ احکام کی تبدیلی ہے مگر دلیل میں جو آیت پیش

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



فرما رہے ہیں۔ اس سے سابقہ پیغامات ہی کی جگہ دوسرے پیغام لانے کی شرط کا کوئی ذکر نہیں ہم یہ پوچھتے ہیں کہ آخر یہ "سابقہ" کس لفظ کا معنی ہے۔ جس پر آپ پیش کردہ نتیجہ میں زور دے رہے ہیں۔ مَاکَانَ لِرَسُوْلٍ کا معنی تو یہ ہے کہ "کسی رسول کے اختیار میں نہیں" لیکن آپ نے کَانَ کے معنی کو "تھا" سے مختص کر کے سابقہ کا مفہوم پیدا کر لیا۔ گویا آپ نے ان تینوں آیات میں "سابقہ" یا اس سے ملتے جلتے الفاظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے اپنے نظریہ کی تائید فرمائی ہے۔

آیت نمبر ۳ میں آپ نے ام الکتاب کی تشریح میں "جو تغیرات سے ماورا ہے" کا اضافہ فرمایا۔ یہ بھی دلچسپ اضافہ ہے جو حکم مٹتا ہے وہ بھی ام الکتاب میں ہے اور جو باقی رہتا ہے وہ بھی۔ جس کتاب میں یہ مٹنے اور باقی رہنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے وہ تغیرات سے ماوراء کیسے ہوئی؟ اگر آپ ایسے اضافے اپنے دماغ میں ہی محفوظ رکھتے تو کیا یہ زیادہ بہتر نہ تھا؟

بھلا دینے کی تشریح: اب تک تو بحث تھی مَانَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ..... نَاْتِ بِخَیْرٍ مِنْهَا کی اب اَوْنُنْسِهَا..... اَوْ مِثْلِهَا کی بحث ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں کہ "سورہ حج میں اس حقیقت کو (یعنی یہود ونصاریٰ نے اپنی کتابوں کا کچھ حصہ فراموش کر رکھا تھا۔ اور کچھ حصہ میں تحریف بھی کر ڈالتے تھے) ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں فرمایا۔

﴿ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّآ إِذَا تَمَنَّىٰٓ أَلْقَى ٱلشَّيْطَٰنُ فِىٓ أُمْنِيَّتِهِۦ فَيَنسَخُ ٱللَّهُ مَا يُلْقِى ٱلشَّيْطَٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ ٱللَّهُ ءَايَٰتِهِۦ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٥٢﴾ ﴾

(الحج ۲۲/ ۵۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی اور رسول نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا کہ اس کے تلاوت کردہ (پیغام خداوندی) میں شیطان نے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ ملا نہ دیا ہو (شیاطین یہ کرتے تھے لیکن) اللہ شیطان کی اس آمیزش کو (دوسرے رسول کی بعثت سے) مٹا دیتا تھا اور اپنے پیغام کو پھر محکم بنا دیتا تھا۔ اللہ علم والا ہے۔ محکم پیغامات رکھنے والا ہے"

امید ہے کہ ان اشارات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی۔ کہ مَانَنْسَخْ مِنْ اٰیَة کا صحیح مفہوم کیا ہے؟" (قرآنی فیصلے ص ۲۴۰)

اب دیکھئے اس آیت میں پرویز صاحب کی تصریح کے مطابق ذکر تو نُنْسِهَا کا ہونا چاہیئے تھا لیکن آیت ایسی پیش فرمائی جس میں پھر یَنْسِخُ یعنی نسخ ہی کی بات مذکور ہے۔

(۲) "دوسرے رسول کی بعثت سے" کا اضافہ کر کے فصل زمانی کا ذکر اپنے نظریہ کی تائید کے لیے کر لیا گیا ہے۔"

(۳) یَنْسِخُ اور یُحْکِمُ دونوں مضارع کے صیغے ہیں لیکن آپ نے ان کے معنی مٹا دیتا تھا اور محکم بنا دیتا تھا کر کے اپنا الو سیدھا کر لیا ہے۔ اب بتایئے کہ تحریف اور کسے کہتے ہیں؟ اور یہودیوں کا اس کے علاوہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اور کیا جرم تھا؟

مندرجہ بالا آیت کا آپ سیدھا سادا ترجمہ فرما دیتے تو الجھاؤ پیدا نہ ہوتا۔ مندرجہ آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ تم سے پہلے کوئی نبی یا رسول ﷺ ایسا نہیں گزرا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو۔ اور چونکہ تم بھی رسول ہو لہٰذا تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا کہ جب اس نے آیت الٰہی کو پڑھ کر سنایا تو شیطان نے اس پیغام الٰہی میں رخنہ اندازی کی' وسوسہ ڈالا اور لوگوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کیا۔ جب بھی ایسی صورت پیش آتی ہے۔ تو اللہ شیطانی شبہات و وساوس کا دفعیہ کر کے اپنے احکام یا پیغام کو محکم بنا دیتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو سابقہ انبیاء کا حوالہ دے کر تسلی دے رہے ہیں کہ پہلے انبیاء کی بھی ایسے ہی مخالفت ہوتی رہی۔ جیسے آپ کی ہو رہی ہے۔ اس مخالفت کے طوفان میں اللہ تعالیٰ حق کو ہی مستحکم فرماتے ہیں۔ یہ سورہ نحل کی آیت ہے جو ہجرت سے تھوڑا عرصہ قبل نازل ہوئی۔ جب کہ آپ ﷺ کفار و مشرکین مکہ کی ایذا دہی سے تنگ آ کر ہجرت کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ اب اس آیت یا مندرجہ بالا دیگر آیات سے یہ ثابت کرنا کہ نسخ سے مراد صرف سابقہ انبیاء کی وحی کا نسخ ہے۔ اور آپ پر جو وحی نازل ہوئی اس میں نسخ ناممکن ہے۔ پرویز صاحب جیسے قرآن کے ادنیٰ طالب علم ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

بے چارے ملا پر پرویز صاحب کا غصہ: یہ تو بات تھی نسخ سے متعلق' بھلا دینے سے متعلق آپ کو کوئی ایسی آیت نہیں مل سکی جسے اَوْنُنْسِهَا کی تائید میں پیش کر سکتے۔ قرآنی آیات کے ترجمہ و مفہوم میں جس قسم کا توڑ مروڑ اور حسب پسند اضافے آپ نے اپنی طرف سے کر کے ان آیات کو اپنے نظریہ کے تابع بنانے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس کا جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں۔ آپ کے لیے تو یہ سب کچھ روا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کی ناراضگی بے چارے ملا پر ہے کہ وہ آپ کی ایسی تحریفات کو تسلیم کیوں نہیں کرتا۔ فرماتے ہیں:

"پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ قرآن کی بعض آیتیں دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں۔ تو اس سے قرآن بھیجنے والے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ملا بے چارے کو اس سے کیا واسطہ کہ خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ کے متعلق کیا خیال قائم ہوتا ہے۔ اسے تو صرف اس سے غرض ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اس میں کہیں فرق نہ آجائے۔ خواہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہود کی مکذوبات ہوں مجوس کی مخترعات ہوں یا صنادید عجم کی خرافات' ملا کے نزدیک جو کچھ "کتاب" میں چھپا ہوا ہے سند ہے۔" (قرآنی فیصلے ص ۳۴۰)

پرویز صاحب کا یہ نظریہ بھی غلط ہے کیونکہ چھپا ہوا تو آپ کا بہت سا لٹریچر بھی ہے لیکن ملا اسے قطعاً تسلیم نہیں کرتا۔ اور اس کی دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس "ملا" کے پاس بھی تسلیم کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی معیار ہے ضرور۔ اور دوسری یہ کہ آپ کے لٹریچر میں یہود کی مکذوبات' مجوس کی مخترعات یا صنادید عجم کی خرافات سے بھی زیادہ غلاظت اور تحریف بھری ہوئی ہے۔ جبھی تو وہ دوسری سب باتیں ماننے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



کے باوجود آپ کے ارشادات جلیلہ کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔

**اللہ تعالیٰ کا بعض قرآنی آیات کو بھلا دینا:** اب ہم نُنسِهَا کی تائید میں ایسی آیت پیش کرتے ہیں جو پرویز صاحب کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ارشاد باری ہے۔

﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰٓ ۝ إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُ ﴾ (الطارق ۸۷/ ۶۔۷) ہم تمہیں پڑھائیں گے جسے تم بھولو گے نہیں مگر جو کچھ اللہ چاہے۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ کچھ آیات قرآنی ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو نازل بھی ہوئیں پڑھی بھی جاتی رہیں۔ لیکن بعد میں بھلا دی گئیں اور وہ شامل کلام اللہ نہ ہو سکیں۔ آیۃ رجم جس کا حوالہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے طویل خطبہ میں دیا تھا۔ اسی قبیل سے تھی۔ نیز فَمَا اسْتَطَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ سے آگے اِلٰی اَجَلٍ مُسَمًّی کے الفاظ بھی اسی قبیل سے تھے۔ جس کی رو سے مجاہدین جنگ کے لیے محاذ جنگ کے دوران متعہ حلال ہوتا رہا۔ لیکن آخر میں اس کی ابدی حرمت ہو گئی اور یہ آخری الفاظ بھی شامل قرآن نہ ہو سکے۔

پھر قرآن میں کچھ ایسی آیات بھی موجود ہیں۔ جن سے دلالتاً بعض آیات قرآنی کا منسوخ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ارشاد باری ہے۔

﴿ ۞ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَسْتَحْىِۦٓ أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً ﴾ (البقرۃ ۲/ ۲۶) اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ ایک مچھر کی مثال بیان کرے۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی آیت بھی نازل کی تھی۔ جس میں مچھر کی مثال بیان کی گئی تھی۔ جسے کافروں نے اضحوکہ بنایا تھا۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے مندرجہ آیت نازل فرمائی۔ اور چونکہ وہ مچھر کی مثال والی آیت قرآن میں نہیں۔ لہٰذا اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ آیت بھلا دی گئی ہے۔

## طلوعِ اسلام سے چند سوالات

اب ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جو کچھ پرویز صاحب فرماتے ہیں وہ ہی صحیح ہے۔ یعنی قرآن کریم ناسخ ومنسوخ روا نہیں۔ کیونکہ اس سے خدا اور رسول ﷺ کے متعلق بڑا غلط تصور پیدا ہوتا ہے۔ اب ہماری گزارش یہ ہے کہ مندرجہ ذیل احکامات کے متعلق ادارہ طلوع اسلام وضاحت فرما دے کہ ان پر کیسے عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

**(ا) حقِ وصیت کس کو؟:** سورہ بقرہ میں ہے۔

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا ٱلْوَصِيَّةُ لِلْوَٰلِدَيْنِ وَٱلْأَقْرَبِينَ

"تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ جانے والا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



بِالْمَعْرُوفِ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۸۰) ہو تو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کر جائے۔"

اور سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ نے والدین کا حصہ تو خود ہی مقرر فرما دیا۔ (۴:۱۱) اور قریبی رشتہ داروں میں سب سے زیادہ قریب انسان کی اپنی اولاد ہی ہو سکتی ہے اس کے متعلق بھی فرما دیا کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے گا۔ ارشاد باری ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ (النساء٤/ ١١) "اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہو گا۔"

اب ایک طرف تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر والدین اور اقربین کے لیے وصیت کو فرض قرار دے رہے ہیں اور دوسری طرف انہی والدین اور اقربین کے حصے مقرر فرما کر پہلا عطا کردہ اور فرض کردہ حق وصیت خود ہی ختم کر رہے ہیں۔ اور وصیت خود فرما رہے ہیں اب جو شخص ناسخ و منسوخ کو درست نہیں سمجھتا۔ وہ ان آیات پر عمل کیسے کرے اور کیوں؟ دونوں پر عمل تو بہرحال ناممکن ہے۔

**(۲) زانی کی سزا):** سورہ نور میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ (الشوریٰ٤٢/ ٢) "زانی مرد ہو یا عورت ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔"

اور سورہ نساء میں فرمایا:

﴿وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ﴿١٥﴾﴾ (النساء٤/ ١٥) "تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بدکاری کریں ان پر اپنے لوگوں میں سے چار شخصوں کی شہادت لو۔ اگر وہ ان کی بدکاری کی گواہی دیں تو ان عورتوں کو تا مرگ گھروں میں نظر بند رکھو۔ یا اللہ ان کے لیے کوئی اور سبیل پیدا کر دے۔"

اگر قرآن میں ناسخ و منسوخ تسلیم نہ کیا جائے تو ان دونوں آیتوں میں سے کس پر عمل ہو گا اور کیوں؟ نیز ﴿أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا﴾ کے معنی بھی بتا دیجیے۔

**جرمِ فحش -- ایک دلچسپ انکشاف:** اس تعارض سے بچنے کی خاطر پرویز صاحب نے زنا کے مقابلہ میں ایک قابل حد جرم "جرم فاحش" کی دریافت فرمائی ہے۔ لیکن اس دریافت پر پھر مزید سوال پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً:

1. یہ جرم فحش ہے کیا بلا؟ جس پر شہادتوں کا سب سے زیادہ نصاب ۴ شہادتیں مقرر کیا گیا۔ جو زنا کی شہادتوں کا نصاب ہے۔ زنا اور جرم فحش میں مابہ الامتیاز کیا چیز ہے؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



2 پرویز صاحب نے خود قرآنی فیصلے ص ۱۶۴ پر پانچ جرم ایسے گنوائے ہیں۔ جن کی سزا قرآن نے مقرر کی ہے اور وہ ہیں قتل' چوری' زنا' قذف اور بغاوت اگر جرم فحش زنا سے الگ کوئی جرم ہے تو اسے کیوں چھوڑ گئے ہیں؟

3 جرم فحش کی سزا اللہ تعالیٰ نے حبس دوام بتائی اور ﴿ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴾ کہہ کر اس کو بدلنے کا وعدہ فرمایا۔ قرآن میں وہ کونسی آیت ہے جو اس وعدہ کو پورا کرتی ہے؟

**(۳) اللہ تعالیٰ کا علم:** اب ہم چند ایسی آیات پیش کرتے ہیں جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے دوران بھی ناسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ انفال میں (جو جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی) مسلمانوں کی جرأت ایمانی کا معیار مقرر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

﴿ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَٰبِرُونَ يَغْلِبُوا۟ مِاْئَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّاْئَةٌ يَغْلِبُوٓا۟ أَلْفًا مِّنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ﴾ (الأنفال۸/ ٦٥)

"اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دو سو کافروں پر غالب رہیں گے۔ اگر سو ہوں تو ایک ہزار پر غالب رہیں گے۔"

اس آیت میں معیار یہ مقرر کیا گیا ہے۔ کہ ایک مسلمان کو دس کافروں پر غالب رہنا چاہیئے۔ پھر اس آیت مذکورہ سے اگلی آیت میں فرمایا:

﴿ ٱلْـَٰٔنَ خَفَّفَ ٱللّٰهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّاْئَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا۟ مِاْئَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوٓا۟ أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ ٱللّٰهِ ﴾ (الأنفال۸/ ٦٦)

"اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی اور معلوم کر لیا کہ تم میں کمزوری واقع ہو گئی ہے لہٰذا اگر تم میں سے ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر ہزار ہوں تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے۔"

اس آیت میں معیار یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کو دو کافروں پر ضرور غالب رہنا چاہیئے۔ گویا پہلی آیت کی رو سے نسبت اگر ۱۔۱۰ کی تھی تو دوسری آیت کی رو سے یہ نسبت صرف ۱۔۲ رہ گئی۔ اب بتایئے کہ:

① آج کل مسلمان کی جرات ایمانی کا معیار کیا ہے؟ جب کہ پہلی آیت بھی منسوخ نہیں ہوئی۔

② دوسری آیت میں جو اللہ تعالیٰ نے اتنی زبردست تخفیف فرما کر اس معیار کو اتنا ہلکا کر دیا کہ پانچواں حصہ رہ گیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے علم کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور اس کے رسول کے متعلق کیا؟

**(۴) ازواج النبی ﷺ:** اللہ تعالیٰ سورہ احزاب میں فرماتے ہیں:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ إِنَّآ أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَٰجَكَ ٱلَّٰتِىٓ ءَاتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّآ

"اے نبی! ہم نے تمہارے لیے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے حق مہر دے دیئے ہیں۔ حلال کر دی ہیں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



﴿أَفَآءَ ٱللَّهُ عَلَيْكَ﴾ (الأحزاب ۳۳/ ۵۰) اور تمہاری وہ لونڈیاں بھی جو اللہ نے تمہیں مال غنیمت سے دلوائی ہیں۔"

پھر اسی سورہ احزاب کی صرف ایک آیت چھوڑ کر فرمایا:

﴿لَا يَحِلُّ لَكَ ٱلنِّسَآءُ مِنۢ بَعْدُ وَلَآ أَن تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَٰجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ﴾ (الأحزاب ۳۳/ ۵۲) "اے نبی ﷺ! اس کے بعد تم کو اور عورتیں جائز نہیں اور نہ ہی ان بیویوں میں تبدیلی جائز ہے۔ اگرچہ تمہیں ان کا حسن پسند آئے مگر لونڈیوں کے سلسلہ میں تم کو اختیار ہے۔"

اب دیکھئے ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نبی کو اختیار دے رہے ہیں کہ جن عورتوں کے تم حق مہر ادا کر سکو ان کو نکاح میں لا سکتے ہو۔ اور دوسری آیت میں یہ اختیار ختم کر دیا گیا ہے۔ اب بتایئے کہ اس سے اللہ کے علم کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور رسول ﷺ کے متعلق کیا؟ جب کہ کوئی آیت دوسری کی ناسخ بھی نہیں۔

(۵) غلام اور لونڈیاں: جنگی قیدیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ﴿فَإِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً﴾ (۴-۴۷) اس کا ترجمہ پرویز صاحب نے یہ کیا کہ "انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دو یا احسان رکھ کر" (قرآنی فیصلے ص ۸۴) جس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے سے منع فرما دیا ہے۔

اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ خود ہی عام مسلمانوں کو ہی نہیں خصوصاً اپنے نبی کو جنگی قیدیوں کے لونڈی غلام بنانے بلکہ لونڈیوں سے تمتع کی بھی اجازت فرما رہے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کی دونوں آیات سے واضح ہوتا ہے۔ اور ﴿مِمَّآ أَفَآءَ ٱللَّهُ﴾ کے الفاظ اس پر صریح دلالت کر رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانا جائز ہے یا نہیں؟ بالخصوص جب کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ کا کوئی سلسلہ نہیں۔ نیز یہ کہ ایسے متضاد احکامات سے اللہ اور اس کے رسول کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے؟

بات سیدھی سی تھی جسے طلوع اسلام نے خدا کے علم میں نقص کی آڑ میں ناسخ و منسوخ سے انکار کر کے خواہ مخواہ الجھا دیا ہے۔ کسی بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح اور پھر ان میں اعلیٰ اخلاق پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تدریج کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور یہی حکمت خداوندی کا تقاضا تھا۔ نزول قرآن کے دوران اسی تدریج کو ملحوظ رکھ کر احکامات میں رد و بدل کیا جاتا رہا۔ اب کوئی شخص اسی حکمت خداوندی کو اللہ کے علم میں نقص تصور کر کے اسے ناسخ و منسوخ سے انکار کا بہانہ بنائے۔ تو اسے اپنی ہی عقل کا ماتم کرنا چاہیئے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ⑥ عذابِ قبر

اس "قرآنی فیصلہ" کے مضمون نگار پرویز صاحب کے بجائے ان کے استاد جناب حافظ اسلم صاحب جیراجپوری ہیں۔ اس مضمون کی ابتدا میں انہوں نے دو باتوں پر زور دیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

(ا) زندگی اور موت صرف دو دو بار ہے: قرآن میں صرف دو بار کی زندگی اور دو بار کی موت کا ذکر ہے۔ تو پھر یہ برزخ کی زندگی اور عذاب قبر کیسے درست سمجھا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب اپنے ایک کتابچہ "روح' عذاب قبر اور سماع موتیٰ" میں بڑی تفصیل سے دے چکا ہوں۔ یہاں صرف چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

قرآن میں بطور سنۃ اللہ یا قانون الٰہی واقعی دو بار کی زندگی اور دو بار کی موت کا ذکر ہے۔ لیکن قرآن ہی میں اس سنۃ اللہ سے استثناء کی بھی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً:

مستثنیات: ① حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو قُم باذن اللہ کہہ کر زندہ کر دیا کرتے تھے (۳-۴۹) پھر جو مردے ان کے زندہ کرنے سے جی اٹھتے تھے۔ وہ بعد میں مرتے بھی ہوں گے۔ تو اس طرح ان کے حق میں ۳ بار کی زندگی اور تین بار کی موت قرآن ہی سے ثابت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح۔

② حضرت عزیر علیہ السلام جب ایک اجڑی بستی کے پاس سے گزرے۔ تو یہ خیال آیا کہ اللہ اس مردہ بستی کو کیسے زندہ کرے گا۔ اس خیال کا آنا ہی تھا کہ اللہ نے انہیں وہیں موت دے دی۔ پھر سو سال بعد زندہ کیا (۲:۲۵۹) گویا ان کے حق میں بھی تین بار کی زندگی اور تین بار کی موت قرآن سے ثابت ہے۔

③ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص قتل ہو گیا جس کے قاتل کا پتہ نہ چلتا تھا اور سب مشتبہ افراد ایک دوسرے کے سر الزام تھوپ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو پھر اس کا ایک ٹکڑا لاش پر مارو۔ تو مقتول خود اپنے قاتل کا پتہ بتائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مقتول کو بھی زندہ کیا ۲:۷۳) اب اس مقتول کے لیے بھی ۳ بار کی زندگی اور ۳ بار کی موت ثابت ہوئی۔

④ موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر جانے کے لیے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا۔ انہیں لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کے کسی جرم کی پاداش میں کڑک دار بجلی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی التجا پر انہیں دوبارہ زندگی ملی۔ ارشاد باری ہے۔

﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ﴾ "پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد دوبارہ زندہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



(البقرۃ۲/ ۵۶) کیا۔"

گویا ان ستر آدمیوں کی ۳ بار کی زندگی ۳ بار کی موت قرآن سے ثابت ہوئی۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ بعث بعد الموت اگرچہ سنۃ اللہ کی رو سے قیامت کو ہی ہوگا۔ تاہم اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اس کا اظہار فرما سکتے ہیں۔

اگرچہ قرآن میں استقصاء سے اس سے زیادہ مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ تاہم ہمارے دعوی کی تائید کے لیے یہ بھی بہت کافی ہیں۔ گو ایسے واقعات شاذو نادر ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں تاہم ان کے امکان سے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

(۲) مردوں کا احساس وشعور: دوسری بات جس کو حافظ اسلم صاحب نے متعدد آیات قرآنیہ سے ثابت کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد سے لے کر یوم حشر تک مردوں میں کسی قسم کا احساس وشعور نہیں ہوتا۔ جسم تو ویسے ہی مٹی میں گل سڑ جاتا ہے۔ روح پر بھی یہ زمانہ بس ایک گھڑی کی مانند گزرتا ہے۔ بالفاظ دیگر جب کوئی مرتا ہے اسی وقت ہی اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا برزخ کا زمانہ یا برزخ کی زندگی ناممکن سی باتیں ہیں۔ قبر میں پڑے مردوں کا کسی بات کا سننا تو درکنار شعور واحساس تک نہیں ہوتا۔

مستثنیات: ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بلاشبہ سنۃ اللہ یہی ہے کہ قبر میں پڑے ہوئے مردے سن نہیں سکتے۔ لیکن اس میں بھی استثناء موجود ہے ارشاد باری ہے۔

﴿ إِنَّ ٱللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَآءُ ۖ وَمَآ أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِى ٱلْقُبُورِ ﴿٢٢﴾ ﴾ (الفاطر۳۵/ ۲۲) "اللہ تو جس کو چاہے سنا سکتا ہے لیکن (اے پیغمبر ﷺ) تم قبروں میں مدفون لوگوں کو نہیں سنا سکتے۔"

اب دیکھئے جن مردوں کو عیسیٰ علیہ السلام قم باذن اللہ کہتے تھے۔ اللہ ان کو سنانا تھا تو تبھی تو وہ جی اٹھتے تھے۔ یعنی ان میں احساس وشعور ہوتا تھا۔ اسی طرح مذکورہ بالا چار مثالیں ہیں جن میں مردوں کا ذکر آیا ہے۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے سنا دیا تھا۔ اور سننے کے لیے چونکہ احساس وشعور مستلزم ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اللہ اگر چاہے تو مردوں میں احساس وشعور بھی پیدا کر سکتا ہے اور انہیں سنا بھی سکتا ہے۔ انہیں زندہ اٹھا کھڑا کر سکتا ہے۔ لیکن کسی دوسرے کے لیے یہ بات ممکن نہیں۔

عرصہ برزخ کا اقرار: برزخ بمعنی دو چیزوں کے درمیان ایک تیسری چیز ہوتی ہے جو اوٹ یا آڑ کا کام دیتی ہے۔ یہ لفظ برزخ صرف فصل مکانی کے لیے ہی استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ فصل زمانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

﴿ وَمِن وَرَآئِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٠٠﴾ ﴾ (المؤمنون۲۳/ ۱۰۰) "اور ان مرنے والوں کے لیے آڑ ہے اس دن تک کہ جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔"

اس بات کو حافظ صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ درج بالا آیت انہوں نے خود بھی درج فرمائی ہے۔ پھر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

"یعنی برزخ کی مدت مرنے والوں کی موت سے لے کر حشر تک ہے کہ اس میں وہ اپنے رب کی حضوری [1] سے آڑ میں رکھے جائیں گے اور جب حشر ہوگا اللہ کے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے۔" (قرآنی فیصلے ص ۳۱۲)

اب قبلہ حافظ صاحب کے اس اقرار فصل زمانی کو خوب ذہن نشین رکھیے کیونکہ آگے چل کر وہ اس اقرار سے انکار کر دیں گے۔

**عذابِ قبر کا ثبوت:** اب دیکھئے جن مردوں کو عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے زندہ کیا کرتے تھے۔ یا حضرت موسیٰ کے جن ستر منتخب شدہ ساتھیوں کو اللہ نے مار ڈالا تھا۔ ان سب پر عرصہ برزخ شروع ہو چکا تھا۔ اب اسی عرصہ برزخ میں اللہ تعالیٰ نے ان میں احساس وشعور پیدا کیا۔ انہیں سنایا اور انہیں زندہ بھی کر دیا۔ تو کیا وہی اللہ تعالیٰ اس عرصہ برزخ میں ان مردوں کو رنج وراحت نہیں پہنچا سکتا؟ اس بات سے انکار عقلاً محال ہے اور اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں عذاب وثواب قبر کہہ دیا جاتا ہے۔

**شہداء کی زندگی:** مردوں کے احساس وشعور کے متعلق چند مستثنیات کو تو ہم نے ذکر کیا ہے۔ اب ایک استثناء کا حافظ صاحب خود بھی ذکر فرما رہے ہیں۔ اور وہ ہے شہداء کی زندگی۔ آپ فرماتے ہیں کہ "شہداء برزخ یعنی آڑ میں نہیں۔ بلکہ عِنْدَ رَبِّهِمْ اپنے رب کی حضوری میں ہیں۔ جہاں ان کو نئی زندگی مل گئی ہے اور وہ روزی پاتے ہیں۔ (قرآنی فیصلے ص ۳۱۳)

اب دیکھئے جس آیت کا ترجمہ حافظ صاحب نے پیش فرمایا ہے۔ اس سے صرف برزخ مکانی کی نفی ثابت ہوتی ہے۔ رہا برزخ زمانی کا معاملہ تو وہ شہداء کے لیے بھی ایسے ہی ہے جیسے دوسروں کے لیے کیونکہ وہ بھی زمین میں دفن کیے جاتے ہیں اور قیامت کو وہ بھی اسی طرح اپنی قبروں سے اٹھیں گے۔ جیسے دوسرے لوگ۔ تاہم اس عرصہ برزخ میں شہداء میں زندہ ہونے کی وجہ سے احساس وشعور ضرور موجود ہوتا ہے۔ اگرچہ ہم ان کے احساس وشعور کو سمجھ نہیں سکتے۔

**قبلہ حافظ صاحب کا برزخ کی مدت یا فصلِ زمانی سے انکار:** ہم پہلے حافظ صاحب کا یہ اقتباس پیش کر چکے ہیں کہ "برزخ کی مدت مرنے والوں کی موت سے لے کر حشر تک ہے" (قرآنی فیصلے ص ۳۱۲) اب وہ خود ہی اپنے اس اقرار سے منحرف ہو کر فرماتے ہیں کہ "موت اور حشر میں مردوں کے لیے فصل زمانی نہیں ہے۔" (قرآنی فیصلے ص ۳۱۸) اب اس انحراف کی وجہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اگر یہ فصل

---

[1] "یہ رب کی حضوری سے" کے الفاظ حافظ صاحب کا طبع زاد اضافہ ہے رب کے حضور تو ہر مرنے والا مرتے دم ہی حاضر ہو جاتا ہے۔ آڑ میں نہیں رکھا جاتا۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



زمانی تسلیم کر لی جائے تو اس میں ثواب وعذاب قبر کا امکان بھی پایا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ نے مناسب سمجھا کہ اس فصل زمانی کا قصہ ہی پاک کردو۔ اور اس انکار پر بطور دلیل دو آیات پیش فرمائیں۔

﴿ يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ ﴾ "ہائے ہماری شامت کس نے ہم کو ہماری خواب گاہ سے اٹھادیا۔" (قرآنی فیصلے ص۳۱۸) (یس۳۶/ ۵۲)

حافظ صاحب اس خواب گاہ سے مراد وہ بستر لیتے ہیں جس پر مریض کو موت واقع ہوئی تھی۔

(۲) پھر فرماتے ہیں کہ رقاد کے معنی سونا ہے۔ جیسا کہ سورہ کہف میں ہے:

﴿ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۚ ﴾ "اور تو ان کو بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔" (قرآنی فیصلے ص۳۱۸) (الکھف۱۸/ ۱۸)

اب دیکھئے کہ رقاد کے معنی تو واقعی سونا ہے اور رقود کے معنی سویا ہوا شخص لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ مرقد کے معنی صرف بستر مرگ ہی ہو سکتا ہے۔ قبر نہیں ہو سکتا آپ فرماتے ہیں کہ شعراء لوگ مرقد کا لفظ قبر کے لیے غلط طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اب ہم بتائیں گے کہ یہ غلطی نہ عوام کی ہے نہ شعراء کی بلکہ قبلہ حافظ صاحب خود ہی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ کیونکہ نیند اور موت میں دو باتیں قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً:

**نیند اور برزخ:** (۱) نیند اور موت دونوں صورتوں میں روح کو اللہ تعالیٰ قبض کر لیتے ہیں۔ (۳۹:۴۲)

(۲) نیند اور موت دونوں سے اٹھانے کے لیے بَعَثَ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ حافظ صاحب نے جو اصحاب کہف والی آیت درج فرمائی ہے۔ اس واقعہ میں بھی ﴿ وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ﴾ (۱۹:۱۸) کے الفاظ آتے ہیں۔ حالانکہ ان کی نیند طبعی نیند نہ تھی۔ بلکہ وہ ﴿ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴾ (۱۱:۱۸) یعنی کئی سالوں سے اسی حالت خواب میں پڑے ہوئے تھے۔

لہٰذا مرقد کا لفظ جیسے خواب گاہ کے لیے درست ہے ویسے ہی قبر کے لیے بھی درست ہے۔ پھر ان اقدار مشترک سے ضمناً درج ذیل نتائج بھی حاصل ہوتے ہیں۔

(i) جس طرح بحالت خواب پوری زندگی نہیں ہوتی۔ بحالت برزخ پوری موت نہیں ہوتی۔

(ii) جس طرح حالت خواب میں روح رنج وراحت سے دوچار ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بحالت برزخ بھی رنج وراحت سے دو چار ہو سکتی ہے۔ جسے عذاب وثواب قبر کہہ دیا جاتا ہے اور یہ باتیں احساس وشعور سے تعلق رکھتی ہیں گویا جیسے خواب میں روح کو احساس وشعور ہوتا ہے۔ اسی طرح برزخ میں بھی روح کو احساس وشعور ہوتا ہے۔ اگرچہ ہم اسے سمجھ نہیں سکتے۔

(iii) جس طرح خواب اور برزخ دونوں صورتوں میں فصل زمانی ہر ایک کے مشاہدہ کی باتیں ہیں۔ جس طرح جاگنے پر سونے والے کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کتنا عرصہ سویا رہا۔ جب تک گھڑی نہ دیکھ لے یا چاند سورج اور ستاروں کے ذریعہ معلوم نہ کر لے یا کسی سے دریافت نہ کر لے۔ اسی طرح قبر سے اٹھنے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



والوں کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ وہ کتنا عرصہ اس خوابیدگی کی حالت میں پڑے رہے۔ کسی نے کہا ایک دن اور کسی نے کہا کہ دن کا کچھ حصہ حالانکہ یہ مدت کم وبیش تین سو سال تھی۔

ان سب حقائق کے علی الرغم حافظ صاحب مندرجہ بالا دو آیات کے ٹکڑے پیش کر کے فرماتے ہیں کہ:

"الغرض یہ امر قرآن کی نصوص صریحہ سے ثابت ہو گیا۔ کہ موت اور حشر میں مردوں کے لیے فصل زمانی نہیں ہے۔" (حوالہ ایضاً)

**برزخ میں قیام کی مدت؟:** بعد ازاں حافظ صاحب تین آیات ایسی پیش فرماتے ہیں جن میں قیامت کے دن کفار کے اس مکالمہ کا ذکر ہے۔ جس میں کافر کہیں گے کہ ہم تو صرف دن کی ایک ساعت ٹھہرے رہے اور جب زمین میں ٹھہرنے کی بات ہوگی تو وہ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یوم (۲۳:۱۱۳) کہیں گے۔ حافظ صاحب اس سے ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ زمانہ برزخ کی مدت کو تو وہ بہت کم سمجھیں گے یعنی دن کی ایک گھڑی اور زمین میں ٹھہرنے کی مدت کو وہ زیادہ مدت سمجھیں گے۔ یعنی دن یا اس کا کچھ حصہ پھر وہ برزخ کی مدت کے سلسلہ میں اس "دن کی ایک گھڑی" سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اور نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں:

"اہل برزخ کو زمانہ کا مطلق احساس نہیں ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا چاہیئے کہ مرنے والے کے لیے موت ہی کا دن حشر کا دن ہے۔" (حوالہ ایضاً ص ۳۲۲)

دیکھا آپ نے کس طرح حافظ صاحب بتدریج عالم برزخ اور عذاب قبر سے فرار فرما رہے ہیں۔ جب عالم برزخ کا وجود ہی ختم کر دیا تو اس دور میں احساس وشعور کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے۔ اب قبلہ حافظ صاحب کے پہلے اقرار کو ایک دفعہ پھر سامنے لایئے۔ فرمایا: "یعنی برزخ کی مدت مرنے والوں کی موت سے لے کر حشر تک ہے اس میں وہ اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جائیں گے۔ اور جب حشر ہوگا اللہ کے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے۔"

**عذابِ قبر اور انصاف کا تقاضا:** فرماتے ہیں:

"یہاں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اللہ کے یہاں انصاف ہے۔ یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ کہ جس نے حضرت نوح کا انکار کیا وہ پانچ ہزار سال پہلے سے عذاب سہے اور برزخ میں جلے اور جس نے محمد ﷺ کا انکار کیا وہ پانچ ہزار یا دس ہزار برس بعد۔" (ایضاً ص ۳۲۴)

اب دیکھئے قرآن کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ گنہگار اور کافر تو درکنار، مشرک کی بھی کسی نہ کسی وقت عذاب دوزخ سے رہائی کا امکان ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ وَٱلْمُشْرِكِينَ فِى نَارِ جَهَنَّمَ خَٰلِدِينَ فِيهَآ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ ٱلْبَرِيَّةِ ۝٦ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟

"جو لوگ اہل کتاب سے کافر رہے اور مشرکین بھی یہ لوگ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ لوگ بدتر مخلوق ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اَلصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ﴿٧﴾ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ (البینۃ۹۸/ ٦۔۹)

کرتے رہے۔ وہ تمام خلقت سے بہتر ہیں ان کا صلہ ان کے پروردگار کے ہاں ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ ان میں وہ ابد الاباد تک رہیں گے۔"

اب دیکھئے جہاں نیکو کاروں کی جزاء کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے تو ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا﴾ فرمایا اور جہاں کفار اور مشرکین کی سزا کا ذکر کیا تو صرف ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طویل مدت کے بعد ہی سہی۔ کسی نہ کسی وقت کافر اور مشرک کی آگ سے رہائی ممکن ہے۔

اب کوئی مرنے والا جتنی سزا عالم برزخ میں بھگت لے گا اور آخرت میں اسے اس لحاظ سے کم مدت یہ سزا ملے گی اور کم مدت رہنے والے کو زیادہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے انصاف سے متعلق قبلہ حافظ صاحب کا وہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے جس کے وہ مکلف نہ تھے۔

## قرآن سے عذابِ قبر کا ثبوت

اب قرآن کریم میں بعض آیات ایسی بھی پائی جاتی تھیں جن سے عذاب قبر پر واضح اشارات ملتے تھے۔ اور علمائے امت نے ان آیات سے عذابِ قبر کا استنباط کیا ہے۔ حافظ صاحب نے اس مضمون کے آخر میں "اعتراضات کا جواب" کے ذیلی عنوان کے تحت ان کا بھی جواب عنایت فرمایا ہے لکھتے ہیں۔

"اب میں ان چند آیات کو بھی لکھ دیتا ہوں جسے لوگوں نے غلط فہمی سے برزخ کا عذاب سمجھا ہے۔

**(ا) فرشتوں کا خطاب:**

﴿اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٣٢﴾﴾ (النحل١٦/ ٣٢)

"جن کو فرشتے اس حالت میں وفات دیتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں (تو ان سے) کہتے ہیں کہ تمہارے اوپر سلامتی ہو۔ تم جنت میں داخل ہو ان کاموں کے عوض جو تم کرتے تھے۔"

یہ آیت خاص دارِ آخرت کے متعلق ہے۔ برزخ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کا سلسلہ بیان یہ ہے:

﴿وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٠﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ۚ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣١﴾ اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ

"اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے اور کیسا اچھا گھر ہے پرہیز گاروں کا ہمیشہ رہنے والے باغات میں وہ داخل ہوں گے۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں جو کچھ وہ چاہیں گے ان کو ملے گا۔ اسی طرح اللہ پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا۔ جن کی جانیں ملائکہ نے اس حالت میں قبض کی ہیں کہ وہ پاک تھے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٢﴾ کہیں گے تم پر سلامتی ہو۔ اپنے عمل کے بدلے جنت میں چلو۔" (قرآنی فیصلے ص ۳۲۵)
(النحل ۱۶/ ۳۰۔۳۲)

**حافظ صاحب کی علمی خیانت:** اب دیکھئے عذاب وثواب قبر کا بیان اسی سورہ النحل کی آیت نمبر ۲۸ سے شروع ہو کر آیت نمبر ۳۳ پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ آیت نمبر ۲۸ میں فرشتوں کے کافروں کی روح قبض کرنے اور ان سے ہم کلام ہونے کا بیان ہے اور کافروں کے مرنے سے پیشتر ہی عذاب کی وعید فرشتے سنا دیتے ہیں۔ اور یہ بیان آیت نمبر ۲۹ تک ہے۔ آیت نمبر ۳۰ اور نمبر ۳۱ میں پرہیزگاروں کا بیان ہے۔ اور انہیں اس دنیا میں بتایا جاتا ہے کہ آخرت کا گھر بہتر ہے اور پرہیزگاروں کے لیے یہ آخرت کا گھر کیا ہی اچھا گھر ہے۔ جس میں باغات اور نہریں ہیں۔ پھر آیت نمبر ۳۲ اور نمبر ۳۳ میں فرشتوں کا موت کے وقت پرہیزگاروں کے پاس آنے اور انہیں اس دنیا میں موت سے پہلے جنت میں داخل ہونے کی خوشخبری دینے کا بیان ہے۔ اب قبلہ محترم حافظ صاحب نے یہ کیا کہ آیت نمبر ۳۰ جس میں پرہیز گاروں کو اس دنیا میں جنت کے وعدہ کا بیان ہے وہ آپ نے وَلَدار الْاٰخرة سے شروع کی اور اس آیت کا پہلا حصہ چھوڑ دیا۔ پھر آیت نمبر ۳۰ کے باقی ماندہ اور آیت نمبر ۳۱ کا بیان آیت نمبر ۳۲ سے متعلق کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ یہاں برزخ کی تو بات ہی نہیں ہو رہی وہ تو دار آخرت کی بات ہے۔ حالانکہ ان آیات میں بیان یہ ہوا ہے کہ فرشتے مرنے والے کو مرنے سے پیشتر ہی اسی ارضی دنیا میں اس کے انجام سے آگاہ کر دیتے۔ بدکاروں کو اُدْخُلُوْا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ کہتے اور پاک لوگوں کو اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ کہتے ہیں۔ اور مرنے کے ساتھ ہی عذاب وثواب قبر شروع ہو جاتا ہے۔

**(۲) آلِ فرعون کی آگ پر پیشی:** حافظ صاحب فرماتے ہیں: "دوسری آیت جس سے لوگوں کو عذاب برزخ کا خیال ہوا یہ ہے۔"

﴿ وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿٤٥﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿٤٦﴾ ﴾ (المؤمن ۴۰/ ۴۵۔۴۶)

"اور آل فرعون کو آگ کے بڑے عذاب نے گھیر لیا۔ جس پر وہ صبح وشام پیش کیے جائیں گے اور قیامت کے دن کہا جائے گا۔ کہ آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو۔"

آیت کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ آل فرعون غرق ہونے کے بعد روزانہ صبح وشام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں یہ عذاب برزخ ہے پھر جب قیامت کا دن ہوگا تو فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ ان کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو یہ مفہوم ان تمام قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے جو پہلے بدلائل بیان کر دی گئی ہیں۔ کیونکہ برزخ میں آل فرعون روزانہ صبح وشام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں۔ تو ان میں زندگی اور آگ کی اثر پذیری کی صلاحیت یعنی شعور واحساس بھی ہونا چاہیئے۔ جن کا قرآن تصریحاً انکاری ہے اور قرآنی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



تعلیمات میں اختلاف نہیں ہو سکتا" (قرآنی فیصلے ص۳۲۶)۔

اسے کہتے ہیں بنائے فاسد علی الفاسد قرآنی تعلیمات میں تو اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن آپ کے بیان میں تو اختلاف واضح ہے کبھی فرماتے ہیں کہ موت سے لے کر حشر تک کا عرصہ برزخ ہے۔ اور کبھی کہتے ہیں کہ مرنے والوں کا حشر موت کے وقت سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور فصل زمانی ہے ہی نہیں۔

پھر فرماتے ہیں "دراصل ساری خرابی اس وجہ سے ہوئی کہ یُعْرَضُوْنَ کے معنی یہاں زمانہ حال کے' لیے گئے ہیں یعنی وہ پیش کیے جاتے ہیں حالانکہ یہاں اس کے معنی استقبال کے ہیں کیونکہ کفار جن میں آل فرعون بھی شامل ہیں۔ ان کی آگ پر پیشی قیامت ہی کے دن ہوگی۔" (ایضاً ۳۲۷)۔

اور پھر اس قیامت ہی کے دن کے متعلق دو آیات پیش فرمائی ہیں۔ (۴۰:۴۶) اور (۱۱:۹۸) ان میں صرف قیامت کے دن آگ پر پیشی یا آگ میں داخل ہونے کا ذکر ہے۔ گویا آپ کی دلیل یہ ہوئی کہ چونکہ قیامت کے دن آگ پر پیشی یا داخلہ ہوگا لہٰذا قیامت سے پہلے آگ پر پیشی نہیں ہو سکتی اور اس وجہ سے آپ یُعْرَضُوْنَ کا ترجمہ "پیش کیے جاتے ہیں" گوارا نہیں فرماتے۔ اس دلیل میں جتنا وزن ہے وہ آپ خود ہی ملاحظہ فرما لیجیے۔

پھر فرماتے ہیں کہ غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا سے مراد دوام ہے کیونکہ برزخ غیر زمانی ہے۔ اس میں نہ صبح ہے نہ شام۔ اب اس آیت کا دوسرا حصہ پہلے حصہ کی تشریح ہوگا۔ یعنی آل فرعون کو آگ کا دائمی عذاب دیا جائے گا۔ اور وہ اس طرح ہوگا کہ فرشتوں کو حکم ملے گا کہ ان کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو۔" (ص۳۲۷ قرآنی فیصلے)۔

گویا حافظ صاحب کے خیال میں ﴿ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ﴾ کا سارا جملہ ہی بے کار ہے کیونکہ اس جملے کا پورے کا پورا مطلب ﴿ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾ میں آجاتا ہے یہ ہے قبلہ حافظ صاحب کی قرآن کے معاملہ میں دیانت۔ اپنی بات کی پچ میں آکر قرآن کی فصاحت وبلاغت کا ستیاناس کر دیا۔

(۳) آل نوح کا انجام: فرماتے ہیں "جو حال آل فرعون کا ہے بجنسہٖ وہی حال قوم نوح کا ہے۔ یعنی وہ بھی قیامت ہی کے دن آگ میں داخل کیے جائیں گے۔

﴿ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ﴾ (نوح ۷۱/ ۲۵) "وہ غرق کیے گئے اور آگ میں داخل کیے گئے۔"

آپ فرماتے ہیں کہ قیامت جنت' دوزخ وغیرہ کے لیے قرآن میں جابجا ماضی کے صیغے استعمال ہوئے حالانکہ یہ سب یوم قیامت کو مستقبل میں ہوگا۔ اس لیے قوم نوح کے متعلق جو ماضی کے صیغے مستعمل ہوئے ہیں۔ یہ قیامت کے دن کے لیے ہیں۔ کیونکہ دوسرے مقامات میں فیصلہ حساب کتاب اور عذاب وثواب کے دن کی تصریح کر دی ہے کہ وہ یوم الحشر ہے۔ لہٰذا ماضی کے صیغوں سے استدلال صحیح نہیں" (ایضاً ص۳۲۱)۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اب دیکھئے کہ حافظ صاحب دراصل چاہتے یہ ہیں کہ آپ اُغرقوا کا معنی تو ماضی میں ہی کیجیے لیکن اُدخلوا کا معنی مستقبل میں کیجیے۔ ہم قبلہ حافظ کی بات مان لیتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ادخلوا پر فا داخل ہوئی ہے جو تعقیب و ترتیب کے لیے آتی ہے لہٰذا اس آیت کے مندرجہ ذیل دو ہی ترجمے ہو سکتے ہیں۔

① وہ غرق کیے گئے پس آگ میں داخل کئے گئے حافظ صاحب نے آیت کے معنی تو یہی لکھے ہیں مگر ان معنوں سے برزخ کا عذاب ثابت ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ ترجمہ آپ کو گوارا نہیں۔ اسی لیے آپ نے اس کی اتنی لمبی چوڑی تشریح فرمائی ہے۔

② وہ غرق کیے جائیں گے پس آگ میں ڈالے جائیں گے" یعنی دونوں کام مستقبل میں قیامت کو ہوں گے۔ یہ ترجمہ حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ آل نوح اسی دنیا میں مدتوں پہلے غرق تو ہو چکی ہے۔

لہٰذا لامحالہ ان دونوں الفاظ کا ترجمہ ماضی کے صیغوں میں ہی کیا جائے گا۔ اس آیت کا یہ ترجمہ نہیں ہو سکتا کہ "وہ غرق کیے گئے اور آگ میں داخل کیے جائیں گے۔"

(۴) اللہ کے حضور پیشی: آپ فرماتے ہیں:

"چوتھی آیت جو عذاب قبر کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے یہ ہے۔"

﴿ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ ٱلظَّٰلِمُونَ فِى غَمَرَٰتِ ٱلْمَوْتِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ بَاسِطُوٓا۟ أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوٓا۟ أَنفُسَكُمُ ۖ ٱلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ ٱلْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ غَيْرَ ٱلْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ ءَايَٰتِهِۦ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٩٣﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَٰدَىٰ كَمَا خَلَقْنَٰكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُورِكُمْ ﴾ (الأنعام ۶/ ۹۳-۹۴)

"اور کاش تو دیکھے جب یہ ظالم موت کے سکرات میں ہوتے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی جانیں نکال دو۔ آج کے دن تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا اس لیے کہ تم اللہ پر جھوٹ باندھتے اور اس کی آیات سے تکبر کرتے تھے۔ (اللہ فرمائے گا) اور تم ہمارے پاس اکیلے آئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا تھا اسے پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔"

"اس آیت میں اَلْیَوْمَ کے لفظ سے لوگوں نے سمجھا ہے کہ یہ برزخ کا عذاب ہے۔ مگر جب یہ ثابت ہو چکا کہ برزخ غیر زمانی ہے۔ اور موت اور قیامت کے دن میں مردوں کے لحاظ سے فصل نہیں۔ تو آج یعنی موت کا دن بعینہٖ قیامت کا دن ہے۔ چنانچہ آیت میں اَوَّلَ مَرَّةٍ کا لفظ صاف تصریح کر رہا ہے کہ حیات اخروی کا واقعہ ہے۔" (ص ۳۲۱)

اس اقتباس میں حافظ صاحب نے نیا نکتہ یہ بیان فرمایا ہے کہ چونکہ اس آیت میں اَوَّل مرۃ کا لفظ ہے اور یہ لفظ ایک دوسرے مقام پر حشر کے دن کے لیے آیا ہے لہٰذا یہی مرنے والے کی موت کا دن ہی اس کی قیامت کا دن ہے۔ مردے کے لیے کوئی فصل زمانی نہیں یعنی آپ کے خیال میں یہ ناممکن ہے کہ اللہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



تعالیٰ ایک مرتبہ تو یہی کلمہ موت کے دن کہے اور دوسری بار یہی کلمہ حشر کے دن بھی کہہ دے۔

**حافظ صاحب کے افکار کا خلاصہ:** اگر آپ "عذاب قبر" سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو حافظ صاحب کے مندرجہ ذیل مشوروں پر عمل کیجیے۔

① مرقد کے معنی صرف خواب گاہ یا بستر مرگ ہے اس کے معنی قبر نہ کیجیے۔ اگر قبر کریں گے تو فصل زمانی کے ثابت ہونے کا بھی خطرہ ہے اور عذاب قبر کا بھی۔

② چونکہ کفار قیامت کے دن کہیں گے کہ ہم دنیا میں دن یا اس کی ایک گھڑی ٹھہرے رہے۔ لہٰذا ان کی اس بات کو حقیقت پر محمول فرمایئے۔ پھر اس ایک گھڑی کا بھی انکار کر دیجیے۔ تاکہ فصل زمانی ثابت نہ ہو سکے۔

③ یُعْرَضُونَ (مضارع) کا معنی صرف مستقبل میں کیجیے۔ اسی طرح اُدْخِلُوْا (ماضی) کا معنی بھی مستقبل میں ہی کیجیے ورنہ عذاب قبر کے گلے پڑ جانے کا خطرہ ہے۔

④ چونکہ قیامت کے دن اللہ کہیں گے کہ "تم ہمارے پاس اسی طرح آئے جس طرح ہم نے اوّل مرۃ پیدا کیا تھا۔ لہٰذا یہ تسلیم کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ موت کے وقت یہ اَوَّلَ مَرَّۃ والی بات نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ پھر وہی عذاب والا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

**حدیث اور عذابِ قبر:** آخر میں حافظ صاحب کی تان حدیث پر ٹوٹتی ہے اور وہ اس عقیدہ کی ایجاد پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ عقیدہ حدیث کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ میرے پاس مدینہ کی دو یہودی بڑھیا عورتیں آئیں۔ انہوں نے کہا قبر میں مردوں کو عذاب ہوتا ہے۔ میں نے ان کو جھٹلایا۔ جب وہ چلی گئیں اور رسول اللہ ﷺ گھر تشریف لائے تو یہ بات میں نے آپ سے ذکر کی۔ آپ نے فرمایا "ہاں ان دونوں عورتوں نے سچ کہا۔ مردوں پر قبر میں عذاب ہوتا ہے جس کو سارے چوپائے سنتے ہیں۔" پھر اس کے بعد میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے بعد عذاب قبر سے پناہ مانگتے تھے۔ یعنی اس وقت تک رسول عظیم ﷺ عذابِ قبر سے خالی الذہن تھے۔ ان یہودی عورتوں کے کہنے سے خیال پیدا ہو گیا....."

یہ اور اسی قسم کی حدیثیں ہیں جن سے اس عقیدہ کی تخلیق ہوئی۔" (ایضاً ص ۳۳۲)

یہ حدیث بخاری (کتاب الجنائز۔ باب عذاب قبر) میں موجود ہے۔ اس کو نقل کرنے میں بھی حافظ صاحب نے ایک جگہ تصرف فرمایا اور ایک جگہ تحریف کے مرتکب ہوئے۔ تصرف یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس "دو بڑھیا یہودی عورتیں" نہیں آئی تھیں بلکہ لفظ یہودیۃ یعنی ایک یہودی عورت آئی تھی۔ اور تحریف یہ ہے کہ حافظ صاحب کے الفاظ "انہوں نے کہا قبر میں مردوں کو عذاب ہوتا ہے۔ میں نے ان

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



کو جھٹلایا" قبلہ حافظ صاحب کا اپنی طرف سے اضافہ ہے۔ حدیث کے الفاظ یوں ہیں کہ ایک یہودیہ عورت آئی اور اس نے عائشہ کو کہا کہ خدا تجھے عذابِ قبر سے بچائے پھر جب رسول اکرم آئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے عذاب قبر کے متعلق پوچھا۔" اتنے کام حافظ صاحب بسا اوقات کر ہی لیا کرتے ہیں۔ خیر اب ہم ان کے اصل اعتراض کا جواب دیتے ہیں۔ جو یہ ہے کہ یہودی عورت کی یاد دہانی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عذاب قبر کا خیال آیا تھا۔ حالانکہ اس واقعہ سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو چونکہ اس بات کا علم نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس سے پیشتر کبھی اس بات کی طرف توجہ ہی نہ کی تھی۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد کیا کچھ وظائف پڑھتے ہیں۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ مسئلہ معلوم ہو گیا جو کہ ان کے لیے بالکل نیا تھا) تو انہوں نے اس معاملہ کی طرف توجہ دینا شروع کی تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ اکثر نمازوں کے بعد عذاب قبر سے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ مسئلہ رسول اللہ کے لیے نہیں بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے نیا تھا۔

یہ تو تھا قبلہ حافظ اسلم صاحب کے ارشادات جلیلہ کا جائزہ لیکن حیرانگی یہ ہے کہ آپ کے ان ارشاداتِ جلیلہ کو آپ کے شاگرد رشید جناب پرویز صاحب بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ وہ اسی کتاب قرآنی فیصلے کے صفحہ ۳۴۷ پر فرماتے ہیں کہ۔

"جب جسمانی نظام طبعی قانون کے تحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں) تو اس پختگی اور وسعت یافتہ قوت (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے اور اسکے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائے گا"

اس اقتباس کی رو سے مرنے کے بعد نفس یا روح کی زندگی ثابت ہوگئی۔ تو احساس وشعور، رنج وراحت، عذاب وثواب سب کچھ از خود ثابت ہو جاتا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ⑦ ترکہ اور وصیت

کسی صاحب نے پرویز صاحب کو لکھا کہ:

"آپ نے کئی مرتبہ لکھا ہے کہ "قرآن کریم کے احکام ہمارے وقتی مصالح اور مقتضیات کی رعایت رکھتے ہوئے ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم اپنے حالات کے مطابق فیصلہ کر لیں" اب سوال یہ ہے کہ قرآن ایک طرف تو انسان کو اس کی ملکیت کی چیزوں پر تصرف کا حق دیتا ہے۔ دوسری طرف ان کی تقسیم کے معاملہ میں اس کے مقتضیات کی کوئی رعایت نہیں رکھتا۔ بلکہ تقسیم وراثت کے ایسے حصے مقرر کر دیتا ہے جن میں تغیر و تبدل کا اسے اختیار نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص کا بڑا بیٹا ملازم ہے۔ ہزاروں روپے تنخواہ پاتا ہے اور صاحب جائیداد بھی ہے لیکن دوسرا لڑکا ابھی ایک سال کا بھی نہیں ہوا کہ اس کی موت کا وقت قریب آجاتا ہے۔ اب حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اس ننھے یتیم کی کفالت کے لیے ترکہ الگ کر دیا جائے۔ لیکن اسے اس پر کچھ اختیار نہیں قرآن کی رو سے بڑا بیٹا برابر کا حصہ لے جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اسی قسم کی مجبوریاں تھیں کہ زمینداروں نے لڑکیوں کو زمین سے حصہ دینا بند کر دیا تھا۔ ایک شخص کی تھوڑی سی اراضی ہے۔ اس کی لڑکی پچاس میل کے فاصلہ پر بیاہی ہوئی ہے اس شخص کے ورثہ میں سے اس لڑکی کا حصہ نکالیے تو چپہ بھر زمین نہ لڑکی کے کام کی نہ اس کے بیٹے کی۔ اسی طرح کی اور مثالیں ہیں کیا آپ تحریر فرمائیں گے کہ ان امور میں ذاتی مصالح اور مقتضیات کا لحاظ کیسے رکھا جائے گا۔" (قرآنی فیصلے ص ۱۱۶-۱۱۷)

پرویز صاحب کی فراہم کردہ بنیاد: اب دیکھئے مندرجہ بالا سوالنامہ میں سائل نے دو سوال اٹھائے ہیں اور دونوں وراثت سے متعلق ہیں اور ان دونوں سوالوں کی بنیاد پرویز صاحب کی یہ "قرآنی بصیرت" ہے۔ کہ قرآن کریم کے احکام ہمارے وقتی مصالح کی رعایت رکھتے ہوئے ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم اپنے حالات کے مطابق فیصلے کر لیں۔" اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ پرویز صاحب کی یہ مہیا کردہ بنیاد بھی درست ہے یا نہیں؟ قرآن کریم اس بنیاد کو غلط قرار دیتا ہے قرآن کریم نے سورہ نساء میں وراثت کے احکام بیان فرمائے تو ساتھ ہی بتا دیا۔

﴿ ءَابَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ

"تمہارے باپ بھی ہیں اور بیٹے بھی تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون نفع کے لحاظ تم سے زیادہ قریب

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾ (النساء ٤/ ١١) ہے۔ یہ حصے خدا کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ بے شک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔"

تو پھر جب ہم یہ بات جانتے ہی نہیں کہ ہمارے لیے کون سا اقرب زیادہ نفع رساں ہے۔ تو ہم اپنی صوابدید کے مطابق اپنے وقتی مصالح یا ذاتی مصالح یا مقتضیات کے مطابق فیصلے کیونکر کر سکتے ہیں؟ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ خدا کے ان مقرر کردہ حصوں میں ردو بدل کا کسی کو اختیار نہیں۔ نیز یہ بھی کہ اللہ نے یہ حصے اپنے علم و حکمت کی بناء پر مقرر کیے ہیں۔ اب جو شخص اللہ کے ان مقرر کردہ حصوں کو ذاتی مصالح اور مقتضیات کی سان پر چڑھا کر اپنے حالات کے مطابق فیصلے کرنا چاہتا ہے۔ وہ دراصل اللہ کے احکام کا نافرمان اور اس کے علم و حکمت کا منکر ہے۔

اللہ کی حکمت جہاں انفرادی مصالح کی مقتضی ہوتی ہے وہاں وہ ایسے ہی احکام دیتی ہے۔ جیسے انفرادی ملکیت کا حق اور جہاں اجتماعی مفاد کی مقتضی ہوتی ہے۔ وہاں اس کے مطابق احکام دیتی ہے۔ جیسے احکامِ میراث' اور ان احکام کی خلاف ورزی' حدود اللہ کو توڑنے کے مترادف ہے۔

**پرویز صاحب کی تضاد بیانی:** اس سوالنامے کے جو جوابات پرویز صاحب نے مرحمت فرمائے وہ تو آئندہ زیر بحث آرہے ہیں۔ سردست ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ پرویز صاحب خود بھی اپنی فراہم کردہ بنیاد پر مطمئن نظر نہیں آتے چنانچہ آخر میں لکھتے ہیں کہ:

"ہم اپنے مصالح اور مقتضیات کے مطابق جزئیات طے کرنے کے لیے صرف انہی امور میں مجاز ہیں۔ جن کی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ جن جزئیات کو قرآن نے خود متعین کر دیا ہے۔ ان میں کسی کو ردوبدل کا حق نہیں۔ اور قرآن کریم نے اگر ان کے ساتھ خود ہی بعض شرائط بھی لگا دی ہیں۔ تو ان شرائط کی پابندی بھی ضروری ہے (تقسیم وراثت کے احکام مشروط ہیں وصیت کے ساتھ)" (قرآنی فیصلے ص ۱۱۲)

اس اقتباس میں دو باتیں قابل غور ہیں:

① قرآن نے یہ جزئیات متعین فرما دی ہیں کہ بیٹوں کا حصہ برابر ہوگا خواہ ایک صاحبِ جائیداد ہو اور دوسرا یتیم' نیز قرآن نے یہ بھی متعین فرما دیا کہ بیٹی اگرچہ پچاس میل کے فاصلہ پر ہی بیاہی ہو اس کو متروکہ اراضی کا حصہ ملے گا۔ اراضی کی صورت میں نہ سہی عوض نقد کی صورت میں ہی سہی (اور یہی دو سوال سائل نے کیے تھے) لہٰذا ان امور میں ذاتی مصالح اور مقتضیات قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

② آپ فرماتے ہیں "تقسیمِ وراثت کے احکام مشروط ہیں وصیت کے ساتھ" اب دیکھئے ایک شخص کسی حادثہ کا شکار ہو کر مرجاتا ہے یا وصیت کرنا اپنے مرض کی وجہ سے بھول جاتا ہے۔ تو کیا اس کا ترکہ تقسیم نہیں ہوگا؟ شرط کا تو یہی تقاضا ہے کہ اگر وہ پوری نہ ہو تو مشروط احکام از خود ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ شرط کیسے ہوئی؟ پرویز صاحب خود بھی دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ "اگر انسان وصیت نہ کر سکا ہو یا اس کا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



ترکہ وصیت سے بڑھ جائے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ورثے کی تقسیم اس کے وارثوں پر نہیں چھوڑی بلکہ اس کے حصے خود مقرر کر دیئے ہیں۔" (ایضاً ص۱۰۹) جس کا صاف مطلب ہے کہ وصیت نہ ہونے کی صورت میں بھی میراث تقسیم ہوگی۔ تو پھر احکام وراثت وصیت کی شرط کے ساتھ مشروط کیسے ہوئے؟

پرویز صاحب کا ذہنی انتشار: بات دراصل یہ ہے کہ اس سوال نامہ نے پرویز صاحب کو خاصا پریشان کر دیا اور وہ اپنے مختلف اور متضاد نظریات کو ایک ساتھ نباہنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ مثلاً:

① وہ صرف حق ملکیت زمین کے ہی منکر نہیں۔ ہر طرح کی انفرادی ملکیت کے بھی منکر ہیں۔ چنانچہ آپ کی تصنیف "قرآنی نظام ربوبیت" اس کا زندہ ثبوت ہے۔ جس طرح آپ نے سوال نمبر۲ کے جواب میں زمین کی حق ملکیت سے انکار کر کے سائل کے ذاتی مصالح اور مقتضیات کو یکسر پامال کر دیا ہے۔ اسی طرح آپ کے پہلے سوال یعنی تقسیم میراث کے سلسلہ میں یہی رویہ اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ جس شخص کی نہ زمین اپنی ہو نہ مکان' نہ روپیہ پیسہ بلکہ سب کچھ سرکاری ہی ہو۔ جب وہ مرے گا تو جو کچھ اس کے پاس چارپائی بستر' کرسیاں یا برتن وغیرہ ہوں گے وہ تو سرکار کے ہوں گے۔ اس میں تقسیم وراثت کیسے ہو سکتی ہے؟ اب جو آپ ترکہ اور وصیت کے احکام کی تفسیر و تشریح فرما رہے ہیں اسے خواہ آپ پرویز صاحب کی حکمت عملی کہہ لیجیے یا تضاد بیانی بات ایک ہی ہے تاہم ان کی حکمت عملی وہی ہے جو آپ نے قرآنی نظام ربوبیت میں بیان فرمائی ہے۔ جیسا کہ ماہنامہ طلوع اسلام کی پیشانی پر بھی تحریر ہے۔

② وصیت اور ترکہ کا ذکر قرآن میں دو جگہ مذکور ہے ایک سورہ بقرہ میں اور یہ پہلی سورہ ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی یعنی سن ۱ھ اور سن ۲ ھ میں اس میں والدین اور اقربین کے متعلق وصیت کا اختیار میت کو دیا گیا ہے۔ پھر وصیت اور ترکہ کے احکام سورہ نساء میں رسول اللہ کی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوئے۔ ان احکام میں والدین اور اقربین کے حصے اللہ تعالیٰ نے خود مقرر کر کے ان رشتہ داروں سے متعلق وصیت کا اختیار میت سے چھین لیا ہے تاہم ان رشتہ داروں کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں یا دوسری قابل احتیاج جگہوں میں وصیت کا اختیار دیا ہے۔ اور ان دونوں قسم کے احکام کے درمیان سال کا عرصہ حائل ہے۔

اب پرویز صاحب چونکہ ناسخ و منسوخ کے بھی قائل نہیں۔ لہٰذا ان دونوں مقامات کے احکامات کو یوں گڈ مڈ کر دیا ہے۔ کہ انسان سرپیٹ کے رہ جاتا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود آپ سائل سے فرماتے ہیں۔ "امید ہے آپ کے وہ شکوک رفع ہو گئے ہوں گے۔ جن کا ذکر آپ نے خط میں فرمایا ہے" (ایضاً ص۱۱۱) اور دوسرے مقام پر فرمایا۔ "اب سوچ لیجیے۔ بات کس قدر واضح ہے۔" (ایضاً ص۱۰۹)

واضح بات؟: اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ واضح بات ہے کیا؟ وہ واضح بات یہ ہے کہ آپ سورہ بقرہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



کی وصیت سے متعلق آیت نقل کر کے فرماتے ہیں کہ "آیت کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ تم پر وصیت فرض قرار دی گئی ہے۔ اور انتہا اس پر کہ وصیت متقیوں کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان کو اس کے ترکہ کی تقسیم کے لیے وصیت کی اجازت ہے (بلکہ تاکید ہے) تو پھر قرآن کریم نے تقسیم وراثت کے حصے کس لیے مقرر کیے ہیں؟ اس کا جواب خود قرآن میں ہے۔ سورہ نساء میں پہلے اولاد' والدین اور بہن بھائیوں کے حصوں کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد فرمایا ہے ﴿ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ﴾ (۱۱:۴) یہ حصے میت کی وصیت اور قرضہ کے بعد ہوں گے۔ اسی طرح دوسرے رشتہ داروں کے حصوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے چار مرتبہ یہی الفاظ دہرائے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ اب آپ سوچ لیجیے بات کس قدر واضح ہے۔ یعنی ہر مسلمان پر وصیت فرض کی گئی ہے۔ اسے اپنی جائیداد واموال کی تقسیم میں پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مصالح ومقتضیات کے مطابق جسے جی چاہے دے دے اور جتنا جی چاہے دے دے۔" (ایضاً ص ۱۰۹)

اب دیکھئے اس "واضح بات" کے اقتباس میں کئی قابل وضاحت باتیں پھر جمع ہو گئی ہیں۔ مثلاً:

① جس وصیت کو آپ فرض اور مومنوں کے لیے ضروری قرار دے رہے تھے۔ اسے تیسری ہی سطر میں وصیت کی اجازت (بلکہ تاکید) پر محمول فرما رہے ہیں۔ دراصل یہ ذہنی انتشار اس لیے ہے کہ آپ تنزیل احکام کی حکمت الٰہیہ یا ناسخ ومنسوخ کے منکر ہیں۔ سورہ بقرہ کی رو سے فی الواقع وصیت فرض تھی۔ پھر جب سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ نے والدین اور اقربین کے حصے خود مقرر کر دیئے تو وصیت کی فرضیت ختم۔ اب یہ ایک اختیاری چیز رہ گئی۔

② آپ نے سوال یہ اٹھایا تھا کہ اگر وصیت کی اجازت بلکہ تاکید ہے تو قرآن نے حصے کیوں مقرر کیے؟" اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ قرآن میں رشتہ داروں کے حصوں کی تعیین کے بعد چار بار آیا ہے کہ "یہ حصے وصیت یا قرضہ کی ادائیگی کے بعد کیے جائیں گے۔ کیا سوال گندم جواب چینا کی اس سے واضح مثال مل سکتی ہے؟

③ چونکہ چار مقامات پر حصہ داروں کے حصے مقرر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "یہ تقسیم وصیت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی" تو اس سے آپ نے نتیجہ یہ پیش کیا ہے کہ" وصیت ہر مسلمان پر فرض کی گئی ہے۔ لہٰذا اسے اپنے اموال وجائیداد کی تقسیم میں پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مصالح ومقتضیات کے مطابق جسے جی چاہے دے اور جتنا جی چاہے دے۔" بتلایئے اس دعوی اور دلیل میں کوئی ربط ہے؟

## کیا چار بار تاکید کی وجہ سے قرض اٹھانا بھی فرض ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اگر چار بار تکرار کی وجہ سے وصیت فرض ہے تو قرضہ کیوں فرض نہیں؟ قرضہ کا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



لفظ بھی تو اسی طرح چاروں بار وصیت کے لفظ کے ساتھ آیا ہے۔ اسے کیوں درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا اور سارا زور وصیت پر صرف کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے چاہیئے تو یہ تھا کہ ہر انسان اپنی زندگی میں قرضہ ضرور لے اور یہ قرضہ بھی وصیت کے ساتھ ہی ادا ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ قرضہ اتنا ضروری ہے کہ اس کی ادائیگی کا ذکر قرآن کریم میں بہ تکرار چار دفعہ آیا ہے اور اس حکم کی تعمیل اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان قرض لے اور ادائیگی کے بغیر مرے۔

ان الفاظ کا مطلب تو صرف اتنا ہے کہاگر میت نے کوئی وصیت کی ہے یا اگر میت کے سر پر کچھ قرض ہے تو پھر ان دونوں کی یا حسب ضرورت کسی ایک کی ادائیگی ایسا فریضہ ہے جس کی چار بار تکرار کے ساتھ تاکید آئی ہے۔ گویا یہ چار بار کی تاکید وصیت کرنے کے لیے نہیں' وصیت (اگر ہو تو اس) کی ادائیگی کے لیے اسی طرح یہ تاکید قرضہ (اگر ہو تو اس) کی ادائیگی کے بعد وراثت تقسیم کی جائے۔ اور اگر میت نے نہ تو وصیت کی ہو نہ اس کے ذمہ کوئی قرض ہو تو ساری وراثت تقسیم ہو جائے گی۔ جیسا کہ آپ خود بھی فرما رہے ہیں کہ "لیکن اگر اتفاق سے ایسا ہو جائے کہ کسی وجہ سے انسان وصیت نہ کر سکا ہو یا اس کا ترکہ وصیت سے بڑھ جائے (قرضہ کا ذکر آپ نے یہاں بھی گوارا نہیں فرمایا۔ مولف) تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے ورثے کی تقسیم کے خود حصے مقرر کر دیئے ہیں"

رہی یہ بات کہ اگرچہ ﴿ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِيْ بِهَآ اَوْدَيْنٍ ﴾ کے الفاظ چار بار دہرائے گئے ہیں۔ مگر ان الفاظ سے یہ بات کیسے ثابت ہو سکتی ہے کہ اسے (میت کو) اپنی جائیداد واموال کی تقسیم میں پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مصالح ومقتضیات کے مطابق جسے جی چاہے اور جتنا جی چاہے دے دے؟" یہ پرویز صاحب کا اپنی طرف سے ایسا اضافہ ہے جسے وہ اس چار بار دہرائے گئے آیت کے ٹکڑے کے علاوہ اور بھی کسی آیت سے ثابت نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ یہی بات مسلمانوں میں اور طلوع اسلام میں باعث نزاع ہے۔ لہٰذا چاہیئے تو یہ تھا کہ پرویز صاحب کوئی ایسی آیت پیش فرما دیتے۔ جس سے نزاع کا فیصلہ ہو جاتا۔ یہ تو آپ سے بن نہ سکا۔ لہٰذا اس کا غصہ آپ نے جی بھر کر روایات پر نکالا ہے۔

پرویز صاحب کا یہ ذہنی انتشار ابھی ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"لیکن تقسیم جائیداد کے اس اختیار کو بھی بدلگام نہیں چھوڑا گیا کہ انسان مستحقین کو محروم کر دے اور اپنی جائیداد کی تقسیم میں نا انصافی سے کام لے۔ اس لیے جہاں وصیت اور قرضہ کا ذکر فرمایا وہاں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وصیت اور قرضہ سے مقصود (حقداروں کو) نقصان پہنچانا نہ ہو۔"

اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ اپنی اموال وجائیداد جسے چاہے دے دے اور جتنی چاہے دے دے۔ تو اس سے زیادہ حقداروں کے لیے اور کونسی بات ضرر رساں ہو سکتی ہے؟ مثلاً سائل کے سوال نمبر ا کے مطابق کوئی مرنے والا اپنی ساری جائیداد اپنے چھوٹے بچے کے نام کر جاتا ہے۔ تو یہ بڑے لڑکے کی حق تلفی اور قرآن کے خلاف نہ ہو گا؟ اور بڑا بیٹا یہ کوشش نہ کرے گا کہ اس چھوٹے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



لڑکے کو کسی نہ کسی طرح راستے سے ہٹا کر خود ساری جائیداد پر قابض ہو جائے کیونکہ مال وزر کی ہوس ایسی چیز ہے کہ وہ مال وزر مل جانے سے کم نہیں ہوتی بلکہ اور بڑھتی ہے۔ پھر یہاں بھائیوں کی رقابت کا مسئلہ بھی ہے۔

**آیاتِ وصیت کی تشریح:** پرویز صاحب اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اگر کسی نے ایسا کیا ہے (یعنی کسی مرنے والے نے وصیت کے ذریعہ حقداروں کو نقصان پہنچایا ہے) اور اس کا علم اس کی زندگی میں ہو گیا ہے تو جماعت کو حق دیا گیا ہے۔ کہ وہ اصلاح حال کی صورت پیدا کر دے۔"

﴿ فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ ﴾ (البقرۃ۲/ ۱۸۲)

"اگر کسی شخص کو وصیت کرنے والے سے بے جا رعایت کرنے یا کسی بے انصافی کا اندیشہ ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ بروقت مداخلت کر کے اور وارثوں (کو سمجھا بجھا کر ان) میں مصالحت کرا دے۔"

اگر یہ صورت حال اس کی موت کے بعد واقع ہو تو اس کی وصیت میں ضروری ردوبدل کر دیا جائے۔ لیکن یہ اختیار صرف اسلامی عدالت کو ہو گا افراد کو نہیں۔" (قرآنی فیصلے ص ۱۱۰)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ناجائز وصیت میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد بھی البتہ یہ سمجھ نہیں آسکی کہ اس کی زندگی میں جماعت کو یہ حق کیسے تفویض کیا گیا ہے۔ اور مرنے کے بعد اسلامی عدالت کو کیسے؟ یہ بات تو قرآنی مبصر صاحب ہی خوب سمجھتے ہیں۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ مبصر صاحب اس آیت کے آگے فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کے الفاظ عمداً چھوڑ گئے ہیں۔ اب فَمَنْ خَافَ' فَاَصْلَحَ اور علیہ تینوں الفاظ اس بات پر واضح دلیل ہیں۔ کہ اس سے مراد کوئی ایک فرد ہے۔ نہ کہ موت سے پہلے جماعت اور موت کے بعد اسلامی حکومت۔

ان آیات سے البتہ اور چند باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

① کوئی مرنے والا اپنی ساری جائیداد کی وصیت ایک آدمی کے حق میں نہیں کر سکتا وجہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات (۱۸۲:۲) کا مضمون آیت نمبر ۱۸۰ سے شروع ہوتا ہے اور اس میں والدین اور اقربون سب کے لیے وصیت کا حکم ہے۔

② وہ خدا کے مقرر کردہ وارثوں اور ان کے مقررہ حصوں میں ردوبدل نہیں کر سکتا۔ نہ ہی کسی ایک حقدار کے حصہ کو اپنی وصیت کے ساتھ بڑھا کر دوسروں کے حصوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ ایسا شخص حقیقتاً خدا کے ارشاد ﴿ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ﴾ (۱۱:۴) (تم نہیں جانتے کہ والدین اور اقربین میں سے کون نفع رسانی کے لحاظ سے تمہارے قریب تر ہے) سے انکار کرتا ہے۔

③ وہ بدلگام ہو کر جسے چاہے اور جتنی چاہے "کے مطابق بھی وصیت نہیں کر سکتا اگر وہ ایسا کرے گا تو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس کی وصیت میں ردوبدل کر کے اس کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔

**قانونِ وراثت پر پرویزی اعتراضات:** اب اگر یہی باتیں اگر رسول اللہ ﷺ کہہ دیں تو یہ حضرات چلانا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ خلاف قرآن ہے چنانچہ پرویز صاحب رقم طراز ہیں کہ:

"مقام حیرت ہے کہ مسلمانوں کا مسئلہ قانون وراثت کس قدر قرآن کے خلاف ہے۔ اور یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قانون وراثت ہم میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اس پر بجائے اس کے کہ انسان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جائے اور کیا کرے اس قانون میں یا تو سرے سے وصیت کی اجازت ہی نہیں اور اگر اجازت ہے تو صرف ایک تہائی میں اور وہ بھی وارثین کے لیے نہیں۔ فیا للعجب" (ص۱۱۰)

اس اقتباس میں:

① اس قانون میں سرے سے وصیت کی اجازت نہیں۔ "یہ ایسا الزام ہے جو ایسے قرآنی مفکر ہی دوسروں پر لگا سکتے ہیں۔ اور پھر خود ہی یہ کہہ کر اس الزام سے دستبردار بھی ہو جاتے ہیں کہ:

② "اور اگر اجازت ہے تو صرف تہائی مال میں" اب یہ تو قرآن سے ثابت ہے کہ وراثت کے اصل حقدار والدین اور اقربین ہیں۔ تو جب ان کے حصے اللہ نے خود مقرر کر دیئے جو غیر مبدل ہیں۔ ہیں۔ تو کوئی شخص سارے مال کی کیسے وصیت کر سکتا ہے؟ اب اگر ان حضرات کو کچھ تکلیف ہے تو صرف یہ کہ تہائی مال کی تحدید رسول اللہ نے کیوں کر دی؟ سوچنے کی بات ہے کہ وصیت میں اصلاح کا حق کسی دوسرے کو دیا جا سکتا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ کو کیوں نہیں دیا جا سکتا؟

③ وارثوں کے حق میں وصیت کی نفی قرآن سے ثابت ہے۔ کیونکہ یہ دوسرے حقداروں کے حق پر اثر انداز ہوتی ہے اور یہی ناانصافی کی بات ہے۔ جو جَنَفًا اَوْ اِثْمًا کے ضمن میں آتی ہے۔

اپنی اسی "قرآنی بصیرت" کو پرویز صاحب رسول اللہ ﷺ کے اتباع قرآن کی آڑ لیتے ہوئے یوں بیان فرماتے ہیں کہ:

"آپ اس کا خیال بھی کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم وصیت کو فرض قرار دے اور بلا مشروط یعنی پورے مال میں وصیت کا حق دے اور رسول اللہ یہ فرمائیں کہ نہیں۔ وصیت ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی غیر وارثین کے لیے خدا کے حکم میں ایسا ردوبدل یقیناً رسول اللہ ﷺ کی شان کے خلاف ہے۔ جن کا ایک ایک سانس قرآن کی اتباع میں گزرا۔" (ایضاً ص۱۱۱)

اب دیکھئے ان حضرات کو کبھی رسول اللہ کی شان کا خیال آتا ہے اور کبھی رواۃ پرستی کا لیکن انہیں یہ خیال کبھی بھولے سے بھی نہیں آتا کہ کہیں ہماری قرآنی بصیرت ہی ٹیڑھے راستے پر نہیں چل نکلی؟ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ نے وصیت اور ترکہ کے الگ الگ احکام کو یوں گڈمڈ کر دیا۔ کہ دونوں کا جنازہ نکال دیا۔

چونکہ پرویز صاحب وصیت سے متعلق اپنے اعتراضات کو اپنے رسالہ طلوعِ اسلام اور دوسرے لٹریچر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



کے ذریعہ بار بار اور مختلف طریقوں سے دہرا دہرا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمایا کرتے ہیں کہ وصیت کے متعلق دونوں احادیث--- ایک یہ کہ وصیت وارثوں کے حق میں نہیں ہو سکتی اور دوسری یہ کہ وصیت کی انتہائی حد ایک تہائی ترکہ تک ہے--- قرآن کریم کے صریحاً خلاف ہیں اور اپنے موقف کو وہ ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں۔ کہ میت کو اپنی جائیداد اموال کی تقسیم میں پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مصالح ومقتضیات کے مطابق جسے جی چاہی اور جتنا جی چاہے دے دے۔" (قرآنی فیصلے ص۱۰۹) لہٰذا اب ہم ایک دوسرے انداز سے قرآن ہی سے یہ ثابت کریں گے کہ پرویز صاحب کا یہ موقف قرآن کے صریحاً خلاف ہے نیز یہ کہ محولہ بالا احادیث قرآن کے عین مطابق ہیں۔

آپ کے موقف کا پہلا حصہ یہ ہے کہ میت جسے چاہے دے دے یہ بات مندرجہ ذیل آیات قرآنی کی رو سے غلط ہے۔

"جسے چاہے" میں سے والدین اور اقربین کو بہرحال خارج کرنا پڑے گا۔ یعنی جسے چاہے کا اطلاق صرف غیر وارثوں پر ہی ہو سکتا ہے کیونکہ والدین اور اقربین کے حصے تو خدا نے مقرر کر دیئے ہیں۔ لہٰذا وارثوں کے حق میں وصیت کی ضرورت ختم ہوگئی اور اگر کوئی شخص وارثوں کے مقرر کردہ حصوں کے بعد کسی وارث کے حق میں وصیت کرے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ:

(الف) خدا کے مقرر کردہ حصوں سے مطمئن نہیں اور نہ ہی اسے اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت پر کچھ اعتماد ہے:

(ب) والدین اور اقربین آبائی جانب ہو یا ابنائی جانب۔ ان دونوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ ءَابَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾ ﴾ (النساء٤/ ١١)

"تم نہیں جانتے کہ فائدہ کے لحاظ سے تمہارے باپ دادوں اور بیٹوں پوتوں میں سے کون تم سے زیادہ قریب ہے۔ یہ حصے خدا کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔"

اس آیت کی رو سے اگر کوئی شخص وارثوں میں سے کسی کے حق میں وصیت کرتا ہے۔ وہ تو گویا صرف اس آیت کی خلاف ورزی ہی نہیں کرتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت کو اور ﴿ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ﴾ کو بھی چیلنج کرتا ہے۔

(ج) اگر کوئی شخص وارثین سے کسی ایک وارث کے حق میں وصیت کر کے خدا کے مقرر کردہ حصہ میں اضافہ کر دیتا ہے۔ تو اس کا لامحالہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوسرے وارثوں کے حصوں میں اسی نسبت سے کمی واقع ہوگی۔ اس کے برعکس وہ کسی ایک وارث کا حصہ کم یا ختم کر کے دوسروں کا حصہ بڑھانا چاہتا ہے۔ تو ایسی وصیت باطل قرار پائے گی کیونکہ ایسی ہی وصیت جَنَفًا اور اِثْمًا کے ضمن میں آتی ہے جس کی اصلاح کر دینا ازروئے قرآن نہایت ضروری ہے۔

ان قرآنی دلائل سے واضح طور پر بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وارثوں کے حق میں وصیت کرنا قرآن کی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



منشاء کے خلاف ہے اور نیز پرویز صاحب کا یہ نظریہ کہ "جسے چاہے دے دے" کے زمرہ سے وارثوں کو بہرحال خارج کرنا ہی پڑے گا۔

اب پرویزی موقف کے دوسرے حصہ "جتنا چاہے دے دے" کی طرف آیئے۔ قرآن میں دو مقامات پر (یعنی سورہ بقرہ (۲:۱۸۰ اور سورہ نساء (۴:۱۱، ۱۲) میں) وصیت کے احکام آئے ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت کی رو سے وصیت والدین اور اقربون کے لیے فرض قرار دی گئی۔ اور سورہ نساء کی رو سے والدین اور اقربون کا حصہ اللہ نے خود مقرر فرما دیا۔ اور یہ بات ہم پہلے واضح کر چکے ہیں۔ کہ "جسے چاہے دے دے" میں وارثین شامل نہیں ہو سکتے۔ اب ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ تقسیم اموال کے وقت والدین اور اقربین کو کسی صورت میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں طرح کے نتائج کو ملانے سے نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی شخص اپنا سارا مال غیروارثین کے لیے وصیت نہیں کر سکتا۔ وہ "جتنا جی چاہے" مال نہیں دے سکتا بلکہ مال کا کچھ حصہ ہی وصیت کے ذریعہ دے سکتا ہے اور وہ بھی صرف غیروارثوں کو ہی دے سکتا ہے۔ وارثوں کو نہیں۔

اب رہی یہ بات کہ میت اپنے مال کا "کچھ حصہ" جو وصیت کر سکتا ہے وہ کیا ہونا چاہیئے تو قرآن کے دونوں مقامات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ متروکہ مال کے اصل حقدار والدین اور اقربون ہی ہیں۔ لہٰذا متروکہ مال کا زیادہ تر حصہ انہیں ہی ملنا چاہیئے اور کم تر حصہ ایسا ہونا چاہیئے جو میت اپنے اختیار سے کسی غیروارث کو بذریعہ وصیت دے سکتا ہے۔

اب اس "کم تر حصہ" کی تحدید فی الواقع قرآن میں مذکور نہیں بلکہ رسول اللہ نے بتایا کہ یہ "کم تر حصہ" زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال تک ہے۔ اس سے زیادہ حصہ مال کی وصیت کی جائے گی تو وہ جَنَفًا اور اِثْمًا کے ضمن میں آئے گی۔ جس میں ردوبدل اور ترمیم کی جا سکتی ہے۔ اور اس اصلاح کا حق قرآن نے ہر مصلح کو دیا ہے۔ پرویز صاحب یہ حق میت کی موجودگی میں جماعت کو اور میت کی موت کے بعد اسلامی عدالت کو دیتے ہیں۔ اب یہ بات تو شاید طلوعِ اسلام بھی تسلیم کرے گا کہ رسول اللہ اپنی امت کے سب سے بڑے مصلح، ہمدرد اور خیر خواہ بھی تھے اور اسلامی عدالت بھی۔ پھر اگر آپ کی یہ تحدید با اعتماد ذرائع سے درست ثابت ہو جائے۔ اور یہ تحدید قرآن کے خلاف بھی نہ ہو۔ بلکہ اس قاعدہ کے مطابق ہو کہ آپ ﷺ کو قرآن کے مجمل احکام کی تفسیر و تعین کا حق بھی قرآن ہی نے عطا کیا ہو۔ تو پھر معلوم نہیں کہ رسول اللہ کی ایسی متعین [1] کی ہوئی حد کو تقسیم کرنے میں طلوع اسلام کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اور وہ اس بات کا واویلا کرنے میں کیسے حق بجانب سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ احادیث قرآن کے صریحاً خلاف ہیں۔

---

[1] واضح رہے کہ مسلمانوں کی اکثریت جو سنتِ رسول کو حجت تسلیم کرتی ہے کے عقیدہ کے مطابق رسول اللہ نے یہ تحدید وحی خفی کے ذریعہ فرمائی جو بما انزل اللہ میں شامل ہوتی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



سائل کے سوالات: اب ہم سائل کے سوالات کا اسی مسلمہ قانون وراثت کے تحت جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کا پہلا سوال ایک سال کے یتیم ہو جانے والے بچے سے ہمدردی اور اس کے حق میں وصیت سے متعلق تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس ایک سال کے بچے کی ماں بھی یقیناً زندہ ہوگی۔ وہ وراثت میں حقدار بھی ہے اور اپنے بچے کے ساتھ والد سے زیادہ ہمدرد بھی۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ میت کے والدین میں سے دونوں یا کوئی ایک زندہ ہو۔ ان کی ہمدردیاں یقیناً یتیم ہونے والے بچے سے ہوں گی۔ وہ بھی وراثت کے حقدار ہیں۔ اور یہ سب رشتہ دار اس یتیم ہونے والے بچے کو اپنا اپنا حصہ دینے کو تیار ہیں۔ کیونکہ یہ ان کا طبعی تقاضا بھی ہے۔ لیکن بڑے بھائی کی صورت ایسی نہیں ہے اب اگر اس یتیم ہونے والے بچے کی ماں' دادی اور دادا سب مل کر اس کے بھائی کو اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ایثار کے لیے کہہ دیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ بھی اپنے حصے سے دستبردار ہونے پر رضامند نہ ہو جائے اور اگر نہ بھی ہو تو بھی اسے چھوٹے بھائی سے بہت کم حصہ ملے گا۔ ماں' دادی دادا سب ننھے کے لیے ایثار کریں گے۔

یہ تو ننھے سے ہمدردی کی بات تھی جس کا ازروئے شرع یہی حل ممکن ہے۔ رہی انصاف کی بات تو وہ وہی ہے جو اللہ نے بیان فرما دی۔ یعنی ان دونوں کا حصہ برابر ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ اگر کسی کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ ننھا بہت حد تک ہمدردی کے لائق ہے تو کسی کے دل میں یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ ننھے کی ضروریات ہیں ہی کیا۔ جو اس کو آدھا حصہ ملے؟ اس کو تو اتنا حصہ بھی بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے عافیت کی راہ یہی ہے کہ اللہ کے احکام کو بدل وجان قبول کر لیں اور انہی پر عمل کریں۔ خواہ ان احکام کی مصلحت ہماری ذاتی مصلحت سے ٹکرا ہی کیوں نہ رہی ہو۔ رہی پرویز صاحب کی تفسیر و تشریح تو وہ جیسی کچھ ہے وہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ان کا مقصد حقیقتاً ننھے سے ہمدردی نہیں بلکہ سنت کی مخالفت اور قرآنی اقدار کو متزلزل کرنا ہے۔

اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اراضی کو چپہ چپہ بانٹنے کی کوئی ضرورت نہیں اس زمین کی انصاف کے ساتھ قیمت لگا کر لڑکی کا حصہ اسے نقدی کی صورت میں دیا جا سکتا ہے۔ اب اگر لڑکی کا بھائی یا زمینداروں کا طبقہ اس بات میں بھی لیت ولعل کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کی نیت میں فتور ہے اور یہ لوگ دور جاہلیت کی طرح طبقہ اناث کو ان کے حق وراثت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ⑧ یتیم پوتے کی وراثت

کسی صاحب نے یتیم پوتے کی وراثت کے متعلق سوال کیا تو پرویز صاحب نے فرمایا:

"حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی چار مختصر سی آیات میں پورے کا پورا قانون وراثت جس حسن وخوبی اور جامعیت و اکملیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے۔ تو انسان قرآن کے اس اعجاز پر وجد کرنے لگ جاتا ہے۔" (قرآنی فیصلے ص ۱۱۳)

اب اگر اس وجد کی کیفیت میں پرویز صاحب نگہ بصیرت اس پر ڈال کر مندرجہ ذیل باتوں کا جواب مرحمت فرمادیں تو ان کی عین نوازش ہوگی۔ واضح رہے کہ جواب قرآن کریم ہی سے درکار ہیں۔

**طلوع اسلام سے چند سوالات:** ① قرآن کی کونسی آیت ہے جس میں چچا کی موجودگی میں یتیم پوتے کا حصہ مذکور ہے۔ اور وہ کتنا ہے؟ یہ مسئلہ اس لیے بھی اہم ہے کہ خود رسول اللہ کو اپنی چچاؤں کی موجودگی میں اپنے دادا عبدالمطلب کی وراثت سے حصہ نہیں ملا تھا۔ اب اگر یہ مسئلہ اتنا ہی اہم تھا تو قرآن کو یہ مسئلہ بالخصوص بیان کر دینا چاہیئے تھا۔ قرآن کی کسی آیت سے وضاحتاً تو درکنار اشارۃً یا دلالتاً بھی یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔

② قرآن کی کس آیت کی رو سے [1] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان مدعیان وراثت کو ترکہ (باغ فدک) کو محروم الارث بنا دیا تھا۔

③ قرآن میں ہے کہ اگر میت کی لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے دو تہائی ہے (۴:۱۱) اب اگر لڑکیاں دو ہی ہوں تو ان کو ترکہ کا کتنا حصہ ملے گا؟

④ قرآن میں ہے کہ ترکہ کی تقسیم وصیت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔ (۴:۱۱) اب اگر میت کا قرضہ ہی اس کے ترکہ سے زیادہ ہو تو کیا کیا جائے؟ بالخصوص اس صورت میں کہ قرض خواہ بھی ایک سے زیادہ ہوں؟

---

[1] اس واقعہ کو چونکہ پرویز صاحب نے درست تسلیم کر کے نظام ربوبیت (ص:۲۴) میں درج فرمایا ہے۔ اسی لیے ہم نے یہ سوال اٹھایا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**فقہ اسلامی کی غلطیاں:** قرآن کی جامعیت اور اکملیت کا یہ نقشہ بتانے کے بعد پرویز صاحب کی نگاہ کرم فقہاء پر پڑتی ہے تو فرماتے ہیں کہ اس مروجہ قانون کی رو سے باہمدگر متضاد شقیں موجود ہیں بلکہ ان میں قرآنی اصول کی صریح مخالفت بھی ہے۔ جنہیں قرآن وارث قرار دیتا ہے یہ قانون اسے وراثت سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن ان کے لیے کچھ حصہ مقرر کرتا ہے۔ یہ قانون اس کے خلاف کچھ اور ہی دیتا ہے۔

① کہیں ایک ہی درجہ کے دو رشتہ داروں میں سے ایک کو وارث قرار دیتا ہے اور دوسرا محروم رہ جاتا ہے۔

③ اور سب سے بڑی افسوس ناک صورت یہ کہ اس قانون کی رو سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا چوتھی جماعت کے بچوں جتنا بھی حساب نہیں جانتا۔ اس اصول کو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ جب کسی چیز کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے تو تمام حصوں کی حاصل جمع ایک آنا چاہیئے۔ اگر حاصل جمع ایک نہیں آتی تو ریاضی کے ابتدائی قاعدے کی رو سے یہ تقسیم غلط ہے۔ مثلاً ۱/۲ + ۱/۴ + ۱/۴ = ۱) یہ تقسیم درست ہے لیکن (۱/۲ + ۱/۲ + ۱/۲ = ۳/۲) یہ تقسیم غلط ہے کیونکہ ان حصوں کا مجموعہ ایک نہیں بلکہ ڈیڑھ آتا ہے۔

یہ ہے بہرحال وہ قانون وراثت جسے ہم بڑے فخر سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس سے ہم ایک ایک طرف اللہ تعالیٰ کے متعلق کیا تصور پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف کس طرح عملی دنیا میں اپنے آپ کو اضحوکہ بناتے ہیں۔" (قرآنی فیصلے ص۱۱۵)

**اللہ تعالیٰ کی حساب دانی:** ہمیں افسوس ہے کہ فقہاء کی زیادتیوں کی وجہ سے پرویز صاحب کو علمی دنیا میں اضحوکہ بننا پڑا۔ ان زیادتیوں میں سے پہلی دو باتوں کا آپ نے مجملاً ذکر فرما دیا۔ کوئی مثال پیش فرماتے تو اس کا جائزہ بھی لیا جا سکتا تھا۔ البتہ تیسری زیادتی کی زد چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی پڑتی ہے۔ للذا ہم اس کے دفعیہ کے لیے ادارہ طلوعِ اسلام سے ہی گزارش کرتے ہیں کہ وہ احکامِ میراث کی جامعیت اور اکملیت پر نگہ بصیرت ڈال کر اور وجد میں آکر مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات مرحمت فرمائیں۔

① مرنے والے کی بیوی اور ۳ بیٹیاں ہیں اور ماں باپ بھی زندہ ہیں اس کا ترکہ کیسے [1] تقسیم ہوگا؟

② مرنے والے کی بیوی فوت ہو چکی ہے اور باپ بھی لیکن ماں زندہ ہے اور ۳ بیٹیاں زندہ ہیں۔ اس کے ترکہ کے تقسیم کی کیا صورت ہوگی؟

---

[1] قرآن کی رو سے بیوی کا حصہ ۱/۸ بیٹیوں کا حصہ ۲/۳ ماں کا حصہ ۱/۶ اور باپ کا ۱/۶

$$\frac{۳+۴+۱۶+۳}{۲۴} = \frac{۲۷}{۲۴} = ۱\frac{۳}{۲۴}$$

یہ حاصل جمع ایک سے بڑھ جاتی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



③ مرنے والی عورت ہے۔ جس کی ابھی اولاد نہیں ہوئی۔ اس کا خاوند اور دو بہنیں زندہ ہیں۔ اس کا ترکہ تقسیم فرمایئے۔ [1]

④ مرنے والی کا خاوند' چار لڑکیاں اور باپ زندہ ہے۔ تو ترکہ کیسے تقسیم کیا جائے گا۔ [2]

ہم نے یہ چند مثالیں پیش کر دی ہیں۔ ان کے حصے قرآن میں موجود ہیں۔ اور فقہاء کا ان میں کچھ عمل دخل بھی نہیں۔ پھر بھی ان کی حاصل جمع ایک نہیں آتی۔ اب ان کے جوابات ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ قرآن سے ماخوذ ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ بھی حساب نافہمی کی زد سے بچ جائیں۔ نیز آپ دنیا کے سامنے اضحوکہ بھی نہ بن سکیں۔

**فقہاء کی خدمات کا اعتراف:** اس تمہید کے بعد پرویز صاحب جب اصل مسئلہ کی طرف رجوع فرماتے ہیں۔ تو آپ کی زبان میں فقہاء کے لیے وہ حدت وشدت باقی نہیں رہتی وہ کچھ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ یا پھر یہ ٹیڑھا سا مسئلہ انہیں ڈھیلا بنا دیتا ہے اور فرماتے ہیں کہ:

"اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمارے فقہاء رحمہم اللہ نے دانستہ ایسا کیا۔ ہر انسان سے تفقہ میں غلطی کا امکان ہے۔ اس لیے قصور ان کا بھی نہیں اصل قصور ہے۔ اس ذہنیت کا جس کی رو سے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ اسلاف نے جو کچھ کہہ دیا ہے وہ منزل من اللہ کی طرح تنقید سے بالاتر ہے۔" (ایضاً ص ۱۲۱)

اس اقتباس سے دو باتیں واضح ہیں:

1. یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ احکامِ میراث کی جامعیت واکملیت کے باوجود قرآن سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ فقہ کا مسئلہ ہے۔
2. اب پرویز صاحب کے نزلہ گرنے کا رخ فقہاء کے بجائے اتباع اسلاف کی طرف مڑ رہا ہے۔ فقہاء اب ان کی نگاہ میں بے قصور نظر آنے لگے ہیں۔

**یتیم پوتے سے ہمدردی:** یتیم پوتے کی وراثت کو ایک شاذ قسم کی مثال سے پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی کسی مرنے والے (مثلاً زید) کے صرف دو ہی بیٹے تھے۔ (مثلاً بکر اور عمر) اب زید کی موت کے وقت بکر تو پہلے ہی مر چکا ہوتا ہے۔ اور اس کا ایک بیٹا ہوتا ہے۔ خالد۔ یہ خالد ابھی بالغ بھی نہیں ہوتا۔ جب کہ زید مرتا ہے۔

---

[1] قرآن کی رو سے ماں کا حصہ ۱/۶ اور بیٹیوں کا حصہ۔ ۲/۳ = ۴+۱/۶ = ۵/۶ یہ حاصل جمع ایک سے کم رہ جاتی ہے۔

[2] قرآن کی رو سے خاوند کا حصہ = ۱/۲' بہنوں کا حصہ = ۲/۳ = ۴+۳/۶ = ۷/۶ = ۱+۱/۶ یہ حاصل جمع بھی ایک سے بڑھ جاتی ہے۔

[3] قرآن کی رو سے لڑکیوں کا حصہ ۲/۳' باپ کا ۱/۶ اور خاوند کا ۱/۴ = ۳+۲+۸/۱۲ = ۳+۱/۱۲ یہ حاصل جمع بھی ایک سے زیادہ ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



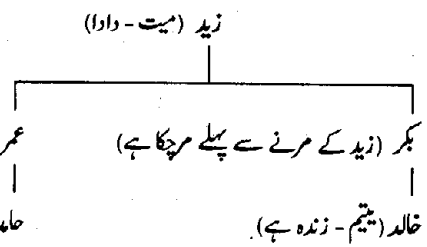


(کیونکہ بلوغت کے بعد یتامت ختم ہو جاتی ہے) البتہ زید کا دوسرا بیٹا عمر اس کی وفات کے وقت موجود ہوتا ہے۔ یہ ہے مثال جس پر اس بحث کی بنیاد اٹھائی جاتی ہے۔ گویا اسے ایک جذباتی مسئلہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ زید کے دو کے بجائے تین چار پانچ بیٹے اور اسی طرح بیٹیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے پھر ان بیٹوں کے پوتے بھی کثیر تعداد میں ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس طرح ہمدردی کے جذبات کو مشتعل نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ یتیم ایک ہی ہو۔ چنانچہ پرویز صاحب اس کیفیت کو درج ذیل انداز میں پیش فرماتے ہیں۔

"ہمارا فقہی قانون وراثت کہتا ہے کہ اس جائیداد میں خالد (جو یتیم ہے) کچھ حصہ نہیں پائے گا۔ جائیداد عمر کو ملے گی (اور اس کی وساطت سے اس کے بیٹے حامد کو) [1] اگر محض عقل عامہ کی رو سے بھی دیکھا جائے۔ تو یہ فیصلہ سراسر ناانصافی پر مبنی دکھائی دے گا۔ خالد یتیم ہے اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں۔ لیکن یہی اس کا جرم قرار دیا جاتا ہے۔" (ایضاً ص ۱۱۵)

یتیم سے ہمدردی کی شکلیں: (۱) اگر دادا کو اپنے اکیلے یتیم پوتے سے وہی ہمدردی ہے۔ جو آپ کو ہے۔ تو وہ اس کے حق میں تیسرا حصہ ترکہ کی وصیت کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ وارث نہیں ہے۔

(۲) اگر دادا نے تو ایسی وصیت نہیں کی۔ مگر چچا عمر جو زندہ ہے۔ وہ اس سے ہمدردی رکھتا ہے۔ تو وہ اس کو اپنی رضامندی سے ترکہ میں شریک بنا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اسے سارا ترکہ بھی دے سکتا ہے۔

(۳) اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو دوسرے رشتہ دار بھی اس کی ہمدردی کر سکتے ہیں۔ جو موقعہ پر موجود ہوں۔ ارشاد باری ہے۔

---

[1] یہ بریکٹوں کی درمیانی عبارت محض جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے پرویز صاحب نے درج فرمائی ہے۔ حامد کو اپنے باپ کے مرنے پر اس کے باپ عمر کے ترکہ سے ملے گا اس سے پہلے اسے دادا کی وراثت سے کچھ نہیں ملے گا۔ جیسے خالد محروم الارث ہے ویسے ہی حامد محروم الارث ہے کیونکہ عمر جو خالد کا چچا اور حامد کا باپ ہے موجود ہے۔ بلکہ یتیم پوتا اس لحاظ سے فائدہ میں ہے کہ وہ اپنے باپ کا ترکہ وصول پا چکا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



﴿ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ﴾ (النساء ٤/ ٨)

"اور جب میراث کی تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور محتاج آجائیں تو ان کو بھی اس سے کچھ دے دیا کرو۔"

اس آیت میں قرابت دار یتیم' اور مساکین کو کچھ نہ کچھ حصہ دینے کو کہا گیا ہے۔ اور یہ یتیم پوتا' یتیم بھی (اگر) ہے اور قرابت دار بھی۔ گویا یتیم پوتا اس حصہ کا دوہرا حق دار ہوا۔

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ جو مثال جذباتی انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ اس کی رو سے تیسرا حصہ بذریعہ وصیت یتیم کو ملے گا۔ باقی کا (اگر دادا کے اس ایک زندہ بیٹے کے سوا باقی سب رشتہ دار مرگئے ہیں) وارث چچا ہوگا۔ اور یتیم سے دوگنا حصہ پائے گا۔ لیکن اگر اس شاذ مثال کی بجائے عام حالات پر محمول کیا جائے۔ تو یتیم پوتا بذریعہ وصیت حصہ پانے سے بسا اوقات فائدہ میں رہتا ہے۔ مثلاً اگر چچا دو یا دو سے زیادہ ہوں۔ یا پھوپھیاں بھی ہوں۔ یا اس کی دادی بھی زندہ موجود ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایسی صورتوں میں یہ یتیم پوتا "حق" کے بجائے بذریعہ وصیت زیادہ حصہ پائے گا۔ اور فائدہ میں رہے گا۔

اور اگر یتیم پوتے کے ساتھ نہ دادا کو ہمدردی تھی۔ نہ چچا کو ہے اور نہ ہی دوسرے رشتہ داروں کو ہو تو پھر محض آپ کی زبانی ہمدردی اس کا کیا سنوار سکتی ہے؟

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ موجودہ قانون وراثت میں یتیم پوتے سے ہمدردی کے وافر اسباب موجود ہیں۔ اور ان حضرات نے خواہ مخواہ آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔

## قائمقامی کا اصول؟

مگر یہ حضرات یتیم سے محض ہمدردی کے قائل نہیں۔ یہ تو موجودہ قانون کو غلط ثابت کرنے کے درپے اور اس کی غلطیوں کی نشان دہی کر کے بطور حق یتیم کا حصہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

اصول قانون وراثت: وراثت کی تقسیم میں اصل الاصول الاقرب فالاقرب کا اصول ہے کہ مرنے والے سے قریب کا رشتہ دار موجود ہو تو وہ دور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے۔ اقرب رشتہ دار وہ ہوتے ہیں جن کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہو مثلاً مثال بالا میں عمر اپنے مرنے والے باپ کا اقرب ہے۔ کیونکہ درمیان میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ لیکن (خالد) اس مرنے والے دادا زید کا پوتا عمر کی موجودگی میں اقرب نہیں ہے۔ کیونکہ درمیان میں اس خالد کا باپ بکر واسطہ ہے۔ جو فوت ہو چکا ہے اسی اصول کے تحت اگر دادا کی وفات کے وقت اس کے دونوں بیٹے بکر اور عمر فوت ہو چکے ہوتے۔ تو خالد اور حامد دونوں پوتے ایک جیسے اقرب بن جاتے اور اقرب بن کر حصہ پاتے۔

اب اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر خالد مرتا ہے تو اس کا باپ بکر بھی مرچکا ہے۔ مگر اس کا دادا زید

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



زندہ ہے۔ تو زید خالد کا اقرب بن جائے گا۔ اور پوتے خالد کی میراث سے حصہ پائے گا۔

**قانون وراثت پر پرویز صاحب کا اعتراض:** پرویز صاحب فرماتے ہیں:

"اب آیئے اس طرف کہ ہمارے فقہاء اس کیلئے (یعنی یتیم پوتے کو محروم الارث بنانے کیلئے) کیا دلائل پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں دو دلیلیں اہم ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ کہتے ہیں [1] کہ "جو شخص مرنے والے کیساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطہ سے رشتہ رکھتا ہے۔ (یعنی اقرب نہیں) وہ شخص اس (اقرب) کی موجودگی میں حصہ نہیں پا سکتا" یعنی خالد (یتیم پوتے) کا رشتہ اپنے دادا زید کیساتھ اپنے والد بکر کے واسطہ سے ہے۔ براہ راست نہیں (یعنی خالد زید کا اقرب نہیں رہا۔ ٹھیک ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ بکر تو مرچکا ہے۔ اسلئے اب خالد اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام ہے۔ اور اسکے دادا (زید) کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسکا چچا (عمر) درمیان میں واسطہ نہیں بن سکتا۔ اسلئے کہ خالد کا اپنے دادا سے رشتہ اپنے چچا عمر کے واسطے سے نہیں ہے۔ اپنے باپ کے واسطہ سے تھا اور یہ واسطہ اب درمیان سے نکل چکا ہے۔" (ایضاً)

**قائم مقامی کا نظریہ:** دیکھا آپ نے پرویز صاحب نے فقہاء کے اقرب والے اصول کو جو نص قرآنی پر مبنی ہے' کس طرح قائم مقامی کی طرف موڑ دیا ہے۔ جس کا قرآن سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اور اس نظریہ کے غلط ہونے کی مزید وجوہ درج ذیل ہیں۔

(۱) میت کے ترکہ کے وارث صرف وہ رشتہ دار ہو سکتے ہیں جو میت کی وفات کے وقت زندہ ہوں۔ درج بالا مثال میں میت (زید) کے دو بیٹوں بکر اور عمر میں سے بکر مرچکا ہے۔ لہٰذا اس کا حق وراثت ختم ہو چکا ہے۔ پھر جب حق وراثت ہی ختم ہو چکا ہے تو قائم مقامی کس بات کی؟

۲۔ بایں ہمہ اگر اس مرنے والے بیٹے بکر کو قانونی طور پر زندہ تسلیم کر کے اور اس کے بیٹے خالد کو اس کا قائم مقام تصور کر کے اسے ترکہ سے حق دے دیا جائے تو اس حق قائم مقامی کو تسلیم کرنے سے اور بھی بہت سے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی اس حالت میں مرتا ہے کہ اس کی بیوی پہلے ہی فوت ہو چکی ہے۔ اب اس نظریہ قائم مقامی کی رو سے اس فوت شدہ بیوی کے اقربین قائم مقام ہونے کی وجہ سے جائز طور پر ترکہ سے حصہ طلب کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ پھر اس کے برعکس بھی یہی صورت پیش آسکتی ہے۔ یعنی ایک ایسی عورت مرتی ہے۔ جس کا خاوند پہلے ہی مرچکا ہے۔ تو اب اس پہلے سے فوت شدہ خاوند کے اقربین عورت کے ترکہ سے قائم مقامی کے نظریہ کی رو سے حصہ طلب کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ پھر یہی صورت بہن بھائیوں کے معاملہ میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر اس نظریہ قائم مقامی کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر آخر اس کو صرف یتیم پوتے ہی تک محدود رکھنے کی وجہ جواز کیا ہے؟

---

[1] فقہاء اپنے اجتہاد کی رو سے نہیں بلکہ قرآنی آیات کی رو سے کہتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿ للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون ○ ﴾

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**غلطی فقہاء کی یا طلوع اسلام کی؟:** پھر اس کے بعد پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ۔

"اب اس مقام پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے فقہاء خود اپنے وضع کردہ اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ وہ خالد کو اپنے دادا (زید) کی وراثت سے تو محروم کرتے ہیں۔ لیکن اگر زید کی زندگی میں خالد مرجائے تو اس کی جائیداد زید کو دیتے ہیں۔ یعنی دادا تو یتیم پوتے کا براہ راست رشتہ دار ہوتا ہے لیکن وہی پوتا اپنے دادا کا براہ راست رشتہ دار نہیں ہوتا۔"

اب دیکھئے طلوع اسلام کے فہم کی یہی وہ بنیادی غلطی یا فقہ اسلامی سے عدم واقفیت ہے۔ جس نے اس کا رخ قائم مقامی کے نظریہ کی طرف موڑا ہے۔ اس نظریہ قائم مقامی کے موجد جناب حافظ اسلم صاحب ہیں۔ پوتے کا وارث دادا (جب باپ مرچکا ہو) اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ وہ فوت شدہ باپ کا قائم مقام ہے۔ بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اب دادا ہی اقرب رہ گیا ہے۔ اس کے بغیر دوسرا کوئی بن ہی نہیں سکتا۔ لیکن دادے کا وارث یتیم پوتا اس لیے نہیں ہو سکتا۔ کہ دادے کا اقرب اس کا دوسرا بیٹا عمر موجود ہے۔ اور اقرب کی موجودگی میں غیر اقرب یا بعید کا رشتہ دار (جیسے یتیم پوتا وخالد جس میں ایک واسطہ بھی آجاتا ہے) محروم ہو جائے گا۔ ہاں اگر عمر کی بھی وفات ہو چکی ہوتی۔ تو دادا کی میراث سے خالد اور حامد دونوں ایک جیسا حصہ پاتے۔ اس لیے کہ اب قرابت کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔

**فقہاء کی مزید غلطیاں:** حافظ اسلم صاحب کے بعد ان کے تتبع میں جناب پرویز صاحب نظریہ قائم مقامی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"وراثت کے قانون میں ایک چیز کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اور وہ ہے قائم مقامی۔ باپ کی وفات سے اس کا بیٹا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ بکر کی وفات سے خالد نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر ہے۔ درمیانی واسطہ اٹھ جانے سے بعید کا رشتہ دار درمیانی واسطہ کا قائم مقام اور اس طرح میت سے اقرب ہو جاتا ہے۔ اور قرآن کے حکم کے مطابق مرنے والا (مورث) جن لوگوں کا اقرب ہوگا وہ لوگ وراثت پائیں گے فقہاء نے اقرب کا استعمال ورثا (زندہ رشتہ داروں) کے لیے کیا۔ جس سے بہت سی غلطیوں میں پڑ گئے۔ قرآن کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق ہم کو صرف یہ متعین کرنا تھا۔ کہ میت کس کس کا اقرب ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی قاعدے کے بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فقہ نے لفظ اقرب کی نسبت بھی غلطی کی اور پھر جو قواعد اس پر متفرع کیے ان پر عمل کرنا ناممکن ہوگیا۔ جس کی وجہ سے کہیں خود اپنے بنائے ہوئے اصولوں کے بھی خلاف چل نکلے اور کہیں قرآن کے بھی خلاف" (قرآنی فیصلے ص۱۲۱)

اب دیکھئے کہ اقتباس بالا میں پرویز صاحب:

① اسلامی وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر قرار دے رہے ہیں۔ اس نظریہ کی کوئی دلیل قرآن

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



سے پیش نہیں فرماتے اور اس نظریہ کے باطل ہونے کی کچھ وجوہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ باقی مزید وجوہ ابھی بیان کریں گے۔

② آپ فرماتے ہیں کہ فقہاء نے اقرب کا مطلب کچھ اور (یعنی غلط) سمجھا ہے جب کہ قرآن کی رو سے اقرب کا مطلب کچھ اور ہے۔ فقہاء یہ دیکھتے ہیں کہ مرنے والے کا اقرب کون کون ہے" جب کہ قرآن کہتا ہے کہ دیکھنا یہ چاہیئے "مرنے والا کس کس کا اقرب تھا؟" اب آپ خود ہی ملاحظہ فرما لیجیے کہ ان دونوں جملوں میں الفاظ کے فرق کے علاوہ کوئی معنی یا مفہوم کا فرق بھی نکل سکتا ہے؟

③ ایک مقام پر آپ فرماتے ہیں کہ "یہ فرق بڑا نازک ہے" (م۔ ح ص۱۱۹) پھر اس نازک فرق کو آپ نے ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں اقرب کی جگہ قائم مقامی کا تصور پیش کر کے یتیم پوتے کا حصہ ثابت کر دکھایا ہے۔ یعنی جو بات محل نزاع تھی۔ اسی کو دلیل کے طور پر پیش فرما دیا اور وہ مثال یہ ہے۔

سعید..... کریم کا دادا زندہ ہے۔ کریم..... اس کی وفات ہوتی ہے

رحیم..... کریم کا والد فوت ہو چکا ہے رشید..... کریم کا بیٹا زندہ ہے

اب آپ فرما یہ رہے ہیں کہ:

(i) جب کریم کا اقرب رشید زندہ ہے تو آپ سعید کو جو اس کا رشید سے بعید کا رشتہ دار ہے اسے کیوں وارث بتاتے ہیں۔ اور اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو پھر۔

(ii) پہلی مثال میں عمر کی موجودگی میں جو قریب کا رشتہ دار ہے۔ خالد (یتیم پوتے کو) جو عمر کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار اسے کیوں وراثت سے محروم کرتے ہیں؟

بالفاظ دیگر ان دونوں سوالوں کو مختصر کیا جائے تو یہ دراصل ایک ہی سوال رہ جاتا ہے کہ اگر دادا باپ کی وفات کی وجہ سے پوتے سے حصہ پا سکتا ہے تو پوتا باپ کی وفات کی وجہ سے دادے کا حصہ کیوں نہیں پا سکتا؟ یہ ہے وہ وجہ یا دلیل جس کی بناء پر آپ یتیم کو حصہ دلوانے پر مُصِر ہیں۔ اور اس غرض کے لیے آپ کو نظریہ قائم مقامی وضع کرنا پڑا۔ پھر اس من گھڑت نظریہ قائم مقامی کو اسلامی قانون وراثت کا اصل الاصول قرار دے دیا۔

**باپ کی جگہ دادا کے حصہ پانے کی وجہ:** اب آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ دادا باپ کے فوت ہونے کے باوجود پوتے کی میراث سے اس لیے حصہ پاتا ہے کہ:

(الف) اگرچہ والدین بیٹے کے اقرب ہوتے ہیں پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کا بالخصوص ذکر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اور اسی طرح دوسرے جاندار سب کا طبعی تقاضا یا فطرت ہی یہ ہے کہ اس کی سب ہمدردیاں اپنی نسل یعنی اولاد اور اولاد کی اولاد کی طرف منتقل ہوتی ہیں۔ والدین بھی اگرچہ اقربون میں شامل ہیں تاہم قرآن نے ان کا ذکر بالخصوص کر دیا ہے لہٰذا دادا کا حصہ باپ کی وفات کے باوجود بھی برقرار

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



رہے گا۔

(ب) آبائی جانب کی طرف یہ اقرب ہمیشہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ باپ بھی ایک وہ مرگیا ہے۔ تو دادا بھی ایک وہ بھی مرگیا ہے تو پڑدادا بھی ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور درمیانی واسطہ کے غیر موجودگی کے باوجود بھی وہ اقرب ہی رہے گا (اور اگر بعید سمجھا جائے تو بھی اس کا حصہ روکا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ خدا نے بالخصوص اس کا ذکر کر دیا ہے) جب کہ ابنائی جانب کی طرف اقربون کی تعداد بہت زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ پھر ان اقربون کے درجات بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔

**نظریہ قائم مقامی کے مزید مفاسد:** اب اگر طلوع اسلام کے نظریہ قائم مقامی کو درست سمجھا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا تعلق صرف نسبی رشتہ داروں سے ہونا چاہیئے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا تعلق صرف ابنائی جانب میں ہونا چاہیئے (یعنی حق زوجیت اور حق اخوت میں نہ ہونا چاہیئے) جیسا کہ یتیم پوتے کو حصہ دلانے کی خاطر یہ حضرات ہمیں منوانا چاہتے ہیں۔ تو پھر اس میں اور کئی قسم کی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً زید' بکر' عمر وغیرہ والی مثال میں یہ فرض کر لیجیے کہ زید (دادا) میت ہے۔ جس کا ترکہ تقسیم ہوگا۔ اس کے دونوں بیٹے بکر اور عمر زید کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ اب بکر کا تو ایک ہی بیٹا خالد (زید کا پوتا) زندہ ہے۔ مگر عمر کے پانچ بیٹے (زید کے پوتے) زندہ ہیں۔ اب اگر قائم مقامی کے اصول کو درست سمجھا جائے تو ترکہ کی یوں تقسیم ہوگی کہ خالد اپنے باپ بکر کا قائم مقام ایک ہے اور عمر کے پانچوں بیٹے مل کر عمر کے قائم مقام ہوئے۔ لہٰذا آدھا ترکہ تو اکیلے خالد (بکر کے بیٹے) کو مل جائے گا۔ لیکن عمر کے پانچوں بیٹے مل کر آدھا ترکہ پائیں گے۔ جو پھر پانچ حصوں میں تقسیم ہو گا۔ یعنی بکر کا بیٹا خالد تو ایک روپے میں سے پچاس پیسے ترکہ پائے گا اور عمر کے پانچوں بیٹوں میں سے ہر ایک کو صرف دس دس پیسے ملیں گے"

اب دیکھئے قرآن کی رو سے زید کے چھٹوں پوتے اس کے ایک جیسے اقرب ہیں یا بالفاظ پرویز صاحب' میت زید ان چھٹوں کی ایک ہی جیسی اقرب ہے۔ لہٰذا قائم مقامی کے نظریہ کے مطابق تقسیم قرآن کریم کے بیان کردہ اقربون کی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے۔

پھر اس قائم مقامی کے نظریہ میں ایک اور بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس میں مرے ہوئے رشتہ داروں کو زندہ تصور کر کے قائم مقامی کا حق قائم کیا جاتا ہے۔ اور یہ بات سرے سے قرآن کی تعلیم کے برعکس ہے۔ غور فرمایئے اس اصول کے مطابق تو کسی میت کے ایسے تمام فوت شدہ بیٹوں کا بھی یہ حق قائم کرنا ضروری ہے۔ جو لا ولد اور بغیر شادی کے ہی مرگئے ہوں۔ ان کے قائم مقام جو حضرات بھی ہوں وہ ترکہ میں بحیثیت قائم مقام ہونے ان کے حصہ کے حق کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

**قصور وار کون؟:** اب قائم مقامی کے یہ تمام مفاسد بھی پیش نظر رکھیے اور پرویز صاحب کا یہ جملہ بھی کہ "فقہاء نے اقرب کا استعمال ورثا (زندہ رشتہ داروں) کے لیے کیا جس سے وہ بہت سی غلطیوں میں پڑ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



گئے" اب خود ہی ملاحظہ فرما لیجیے کہ غلطیوں میں کون پڑ گیا ہے؟ یا کس کی بات قرآن کے خلاف ہے؟ فقہاء کی یا جناب پرویز صاحب کی؟

آخری بات جو پرویز صاحب نے فرمائی وہ یہ ہے کہ "اقرب کا اصول استعمال کرنے سے فقہی قانون وراثت پر عمل کرنا ناممکن ہو گیا ہے" یہ ناممکن العمل کیسے ہو گیا (جس پر آج تک اسلامی ممالک میں عمل درآمد ہوتا چلا آرہا ہے۔ اور اس سے کسی نے اختلاف بھی نہیں کیا ناممکن العمل تو وہ قائم مقامی کا اصول ہے۔ جو یتیم پوتے کو حصہ بخشنے کے بعد اپنے ساتھ اس قدر زیادہ مفاسد لاتا ہے۔ جن پر عمل کرنا کسی صورت ممکن نہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ⑨ تلاوتِ قرآن پاک

**تلاوتِ قرآن پر طلوع اسلام کے اعتراضات:** پرویز صاحب محض تلاوت قرآن پاک کو ایک بے ہودہ عمل تصور کرتے ہیں۔ قرآنی فیصلے ص ۱۰۳ پر فرماتے ہیں:

"قرآن ایک کتاب ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ اس کے بتائے طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ کیسے اس کے الفاظ دہرا دینے سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا؟ نیز قرآن اپنے مضامین پر بار بار غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کیا قرآن کا یہ مقصود بلا سوچے سمجھے پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے؟ آپ کسی مصنف سے یہ کہیے کہ میں تمہاری کتاب کے ایک لفظ کو بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کے باوجود ہر روز اسے پڑھتا ہوں حتیٰ کہ وہ زبان بھی مجھے نہیں آتی جس میں تم نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کے باوجود اس کے الفاظ کو دہراتا رہتا ہوں۔ آپ خود ہی سوچئے کہ وہ مصنف آپ کو کیا جواب دے گا؟ یہ عقیدہ درحقیقت مسلمانوں کو قرآن سے الگ رکھنے کے لیے تراشا گیا تھا جو عجمی سازش کا نتیجہ ہے اور یہ عقیدہ یکسر غیر قرآنی ہے۔ جو درحقیقت عہدِ سحر کی یادگار ہے۔ جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ الفاظ (معانی نہیں) اپنے اندر تاثیر رکھتے ہیں۔ یہ قرآنی اعمال تعویذ' نقوش' وظائف' اوراد' سب اسی عقیدہ کی مستعار شکلیں ہیں۔"

پھر یہی خیالات مقامِ حدیث کے ص ۲۲۱ پر دہرائے گئے ہیں اور اس کے بعد قرآنی سورتوں یا آیات کی تلاوت کی فضیلت کے متعلق چند احادیث درج کر کے ایسی احادیث کے موضوع ہونے کا تاثر دیا گیا ہے۔ نیز یہی افکار اسباب زوالِ امت کے صفحہ ۵۹ پر بھی دہرائے گئے ہیں۔ اور دلیل میں یہ آیت بھی پیش کی گئی ہے۔

﴿ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ﴾ (آل عمران ۳/ ۱۶۷)

"وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا۔" (اسباب زوالِ امت ص ۵۹)

**اعتراضات کے جوابات:** اب دیکھئے کہ:

① جو آیت پرویز صاحب نے اپنے دعوی کی دلیل میں پیش فرمائی وہ منافقین سے متعلق ہے اور وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس آیت کے مندرجہ بالا ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ منافقوں کی زبان پر کوئی اور بات ہوتی ہے جب کہ دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ یعنی جس بات کا وہ زبان سے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اقرار کرتے ہیں ان کے دل اس سے منکر ہوتے ہیں۔ لیکن بلا سوچے سمجھے تلاوت کرنے کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے کہ ایسے شخص کے دل میں کچھ ہوتا ہی نہیں یا اگر کچھ ہوتا ہے تو یہ کہ قرآن کی تلاوت ایک اچھا عمل ہے۔" اسے تلاوت پر کوئی مجبور تو نہیں کرتا۔

② تلاوت کا معنی محض "پڑھنا" نہیں بلکہ یہ لفظ سوچ سمجھ کر پڑھنے اور پھر اس کی اتباع کے لیے آتا ہے۔ (مفردات) لہٰذا تلاوت قرآن یا تلاوت قرآن کے فضائل سے متعلقہ روایات پر اعتراض ہی بے کار ہے۔ قرآن میں تلاوت قرآن پر بہت زور دیا گیا ہے۔ رسول اللہ کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ تھی کہ "آپ امت پر اللہ کی آیات تلاوت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی حکم تھا کہ:

﴿ اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ ﴾ آپ پر جو کتاب اتاری گئی ہے اسے پڑھا کرو۔

(العنکبوت۲۹/ ٤٥)

③ پھر مسلمان مردوں اور عورتوں کو یہ بھی حکم تھا کہ وہ ان تلاوت شدہ آیات کو زبانی یاد کر لیا کریں۔ اللہ تعالیٰ ازواج مطہرات سے فرماتے ہیں:

﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ﴾ "اور تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیات اور حکمت پڑھی جاتی ہیں۔ ان کو یاد رکھو۔"

(الأحزاب۳۳/ ٣٤)

اور یہ تو ظاہر ہے کہ آیات کو یاد رکھنے اور حفظ کرنے کے لیے ان آیات کو بار بار پڑھنا اور دور کرنا پڑتا ہے۔ اور ہر ہر بار تلاوت کرنے کا مقصد غور و تدبر ہی نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کو قرآنی آیات سکھلاتے بھی تھے۔ پڑھاتے بھی تھے یاد بھی کرواتے تھے۔ پھر ان سے سنتے بھی تھے' انہیں سناتے بھی تھے۔ تب جا کر صحابہ کو قرآن حفظ اور ضبط ہوتا تھا۔ حفظ کرتے وقت جو تکرار اعادہ یا دور کیا جاتا ہے۔ اس وقت مقصود غور و تدبر نہیں ہوتا بلکہ حفظ کرنا ہی ہوتا ہے۔ اب حفظ کرنے کے لیے آیات کی جو بار بار تلاوت کی جاتی ہے۔ جو اگرچہ بلا سوچے سمجھے ہوتی ہے۔ تاہم یہ ایک بہت بڑی دینی ضرورت پورا کرتی ہے۔ یعنی قرآن سینوں میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک مستحسن فعل ہوا۔ خواہ یہ حفظ کرتے وقت طوطے کی طرح رٹنا ہی پڑے۔

④ نبوت کے ابتدائی ایام میں ہی سورہ مزمل نازل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴾ (المزمل۷۳/ ٤) "اور قرآن کو خوب حسن ترتیب سے پڑھا کرو۔"

المزمل کے معنی کسی چیز کا حسن تناسب کے ساتھ مرتب اور منظم ہونا ہے (مفردات) پھر اس میں کسی عبارت کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا۔ حسن ادائیگی الفاظ اور خوش آوازی یا خوش الحانی سب شامل ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو محض ایک قانون اور ضابطہ حیات کی کتاب ہی تصور کریں تو پھر قانون کی کتاب پڑھنے کے لیے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



ایسی ہدایات کی کیا ضرورت ہے؟ قانون کی کتاب میں غور وتدبر کرنے کے لیے الفاظ کو بلند آواز سے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ چہ جائیکہ اسے ترتیل سے پڑھا جائے۔

⑤ قرآن میں کچھ آیتیں محکمات ہیں۔ جن کا مطلب بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اور کچھ متشابہات ہیں۔ جن کی تاویل یا تو اللہ ہی جانتا ہے۔ یا پھر راسخون فی العلم۔ عام لوگ جن کی اکثریت ہوتی ہے۔ وہ اس کے مفہوم ومعانی اور صحیح تاویل و تعبیر تک پہنچ ہی نہیں سکتے اور ایسی آیات کے مفہوم ومعانی کے پیچھے پڑھنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے فتنہ پرور قرار دیا ہے۔ پھر قرآن میں حروف مقطعات سب کے سب اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب اگر قرآن پاک کی تلاوت کا مقصد صرف اس کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہی ہو تو ایسی تمام متشابہ آیات کی تلاوت بقول پرویز صاحب بے کار ہے۔ بلکہ ایسی آیات کی قرآن میں ضرورت بھی کیا تھی۔ جس کا سمجھنا اور ان پر عمل کرنا عوام الناس کے بس کی بات ہی نہیں۔ یہ تمام باتیں اس چیز کی واضح دلیل ہیں۔ کہ قرآن پاک کی سمجھنے اور عمل کرنے کے علاوہ صرف تلاوت بھی انتہائی ضرورت ہے۔

**قرآن کے الفاظ کی اعجازی حیثیت اور تاثیر:** اب رہی قرآن کے الفاظ کی اعجازی حیثیت یعنی کیا قرآن کے الفاظ میں کوئی تاثیر ہے یا نہیں؟ تو اس بات کا جواب یہ ہے کہ ہم قرآن کے الفاظ کی تاثیر کے بھی قائل ہیں۔ (جسے پرویز صاحب عہد سحر سے منسلک فرمارہے ہیں) اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

(۱) قرآن کسی انسان کا کلام نہیں۔ بلکہ اس کے الفاظ بندش اور فصاحت وبلاغت کا یہ عالم ہے۔ کہ قرآن کے بار بار چیلنج کے باوجود بھی کفار ومشرکین مکہ اس جیسی ایک سورت یا چند آیات بھی بنا کر پیش نہ کر سکے۔ لہٰذا اسے عام انسانی تصانیف کے مثل قرار دینا بڑی جسارت ہے۔ جیسا کہ پرویز صاحب نے کسی مصنف کی کتاب کو بلا سوچے سمجھے پڑھنے کی مثال دی ہے۔

(۲) کفار ومشرکین مکہ میں سے اکثر فصحائے عرب تھے اور شاعر بھی موجود تھے۔ جو قرآن کی آیات کو سنتے اور سمجھتے تھے ان کی زبان بھی عربی تھی۔ وہ دل سے قرآن کے مخالف بھی تھے۔ پھر بھی قرآن کے الفاظ کی اعجازی حیثیت ان کو مسحور کر دیتی تھی۔ آخر یہ کیا بات تھی کہ وہ رات کو پہروں چوری چھپے قرآن سنا کرتے تھے؟ کیا یہ الفاظ کی ہی تاثیر نہ تھی؟

(۳) الفاظ کی اس اعجازی حیثیت کا پرویز صاحب خود بھی ایک دوسرے مقام پر زیر عنوان "مشاعرے" بدیں الفاظ اقرار کرتے ہیں۔

"آپ کسی شاعر سے کہئے کہ جو کچھ آپ نے نظم میں لکھا ہے۔ اسے نثر میں پڑھ کر سنایئے اور اس کے بعد دیکھئے کہ اس کے جذبات کا کیا عالم ہوتا ہے۔ غور کیجیے کتنا بڑا ہے یہ سحر جس کی رو سے محض الفاظ کے ادھر ادھر رکھ دینے سے آپ کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔" (قرآنی فیصلے ص ۳۰۵)

پھر اگر کسی عام شاعر کے الفاظ کی بندش میں یہ تاثیر ہو سکتی ہے تو کیا قرآن کے الفاظ کی بندش میں اتنی بھی تاثیر نہیں؟ یہ الگ بات ہے کہ قرآن شاعرانہ بیہودگیوں سے یکسر پاک ہے۔ تاہم اس کی اس اعجازی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



حیثیت سے انکار کیوں کر ممکن ہے؟ پھر اس لفظی تاثیر کا تعلق صرف شعر سے بھی نہیں بلکہ نثر میں بھی ایسی تاثیر ممکن ہے۔ جسے ہم ادب یا ادبی زبان یا ادبی پارے بھی کہہ سکتے ہیں۔ اردوئے معلیٰ ایسی اردو کو کہا جاتا ہے جس کا ادبی لحاظ سے پایہ بلند ہو۔

(۴) رجز (جنگی گیت) کا اثر اونٹ وغیرہ پر ہونا مشاہدہ سے ثابت ہے۔ حالانکہ اونٹ نہ وہ زبان جانتا ہے نہ اس کا مطلب سمجھتا ہے تاہم اثر پذیر ضرور ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ چاہئے کہ اونٹ میں بھی کوئی عجمی سازش تو کام نہیں کر رہی۔

ایک لطیفہ یاد آگیا۔ کوئی صاحب قرآن کے الفاظ کی تاثیر کے قائل نہ تھے اور اسی موضوع پر اپنے ایک دوست سے بحث فرما رہے تھے۔ اس دوست نے جواب میں صرف اتنا ہی کہہ دیا کہ تم تو نرے گدھے ہو اس بات پر وہ صاحب سیخ پا ہو گئے اور غصہ کی وجہ سے چہرہ تمتما اٹھا اور اپنے دوست کو بدتمیزی کے القابات سے نوازنے لگے۔ دوست نے بڑے آرام سے کہا۔ دیکھو بھئی اگر الفاظ میں کچھ تاثیر نہیں ہوتی تو آپ اس قدر برہم کیوں ہو گئے ہو۔ آخر آپ فی الواقع گدھے بن تو نہیں گئے۔ یہ جواب سن کر وہ صاحب کچھ کھسیانے ہو گئے؟ اور غصہ بھی فرو ہو گیا۔

**بلا سوچے سمجھے تلاوت:** بلا سوچے سمجھے تلاوت [1] کرنا اگرچہ کوئی بامقصد عمل نہیں کہلا سکتا۔ تاہم اس سے بھی تین فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ تلاوت کرنے والا جب تک تلاوت میں مشغول رہے گا۔ دوسری خرافات سے محفوظ رہے گا۔

۲۔ جو شخص اس "بلاسوچے سمجھے تلاوت" کو اپنا معمول بنائے گا۔ کسی نہ کسی دن ضرور وہ اس کا مفہوم سمجھنے کی بھی کوشش کرے گا۔

۳۔ کلام الٰہی کی تلاوت اگر ترتیل سے کی جائے تو کائنات کی دوسری اشیاء بھی اس سے اثر قبول کرتی اور ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ داؤد علیہ السلام جب زبور کی آیات تلاوت فرماتے تو پہاڑ اور پرندے بھی آپکی ان تسبیحات میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے تین مقامات پر بیان فرمایا ہے۔

﴿ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ﴾ (الأنبياء ۲۱/ ۷۹)

"داؤد علیہ السلام کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا جو تسبیح کرتے تھے۔"

﴿ إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ ﴿١٨﴾ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَّهُ أَوَّابٌ ﴿١٩﴾ ﴾ (ص ۳۸/ ۱۸-۱۹)

ہم نے اس (داؤد) کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا کہ صبح و شام تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی (مسخر کر دیا تھا) جو اکٹھے ہو جاتے تھے۔ یہ سب داؤد کی طرف رجوع کرتے تھے۔

---

[1] مزید تفصیل آگے "حصول جنت" کے عنوان کے تحت دیکھیے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



﴿ وَلَقَدْ ءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ يَـٰجِبَالُ أَوِّبِى مَعَهُۥ وَٱلطَّيْرَ ﴾ (سبا ۳۴/ ۱۰)

اور ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے برتری بخشی تھی (اور ہم نے حکم دیا) کہ اے پہاڑو اور پرندو! [1] (جب داؤد زبور کی تلاوت کریں تو تم بھی ان کے ساتھ) ہم آہنگی کرو۔

ان آیات میں جبال جمادات سے اور طیر حیوانات سے تعلق رکھتے ہیں۔ گویا یہ سب چیزیں آیات الٰہی کی تلاوت سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ ان کے معنی کو نہ سمجھ سکتی ہیں نہ غور وتدبر کر سکتی ہیں۔

ان تمام تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ قرآن کریم کی تلاوت کا اصل مقصد اس کو سمجھنا پھر اس پر عمل کرنا ہے (اور ہم نے خاص اسی موضوع پر ایک پمفلٹ قرآن نافہمی کے اسباب اور اس کا حل بھی شائع کیا ہے) تاہم ہم اس بات کے بھی قائل ہیں کہ قرآن کے الفاظ میں بھی اعجاز ہے' جو اپنے اندر تاثیر بھی رکھتا ہے۔

باقی رہا مسئلہ قرآنی عملیات' نقوش' تعویذات اور اوراد و وظائف وغیرہ کا تو ان باتوں کا ثبوت قرآن وحدیث کہیں سے بھی نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ افعال بدعیہ اور شرکیہ ہیں اور ایسی باتوں کا اگر پرویز صاحب عہد سحر سے تعلق قائم فرمانا چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔

---

[1] پرویزی تاویلات۔ آپ نے مفہوم القرآن میں یٰجِبَالُ کا مفہوم بیان فرمایا ہے ''اے سرکش سردارو! گویا اللہ میاں کو سرکش سرداروں کے لیے جبال کے علاوہ کوئی لفظ نہیں ملتا تھا۔ اور سورہ ص (۱۹-۳۸) میں جبال کا مفہوم پہاڑی قبائل بیان فرمایا ہے اور الطیر کا مفہوم بیان فرمایا ہے قبیلہ طیر۔ اسی طرح اگر قبیلہ جبال بھی کہہ دیتے تو کیا حرج تھا پھر اَوِّبِی کا مفہوم بیان فرمایا کہ داؤد کے ساتھ تم بھی نہایت سرگرمی سے قانون خداوندی کی اطاعت کرو'' (لغات القرآن ج۱ ص۲۸۳) حالانکہ خود پرویز صاحب اسی لغات میں ادب کا معنی بالارادہ رجوع کرنا لکھ چکے ہیں یعنی اے پہاڑو اور پرندو! داؤد کی طرف بالارادہ رجوع کرو۔ اب داؤد کے بجائے قانون خداوندی اور رجوع کرو کے بجائے نہایت سرگرمی سے اطاعت کا مفہوم بیان کرنا اس مفکر قرآن ہی کا کارنامہ ہو سکتا ہے ؎

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر     تاویل سے قرآن کو بنا دیتے ہیں پازند

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ⑩ نکاحِ نابالغاں

نکاح کی عمر: پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ:

"قرآن نے نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے۔ جو فریقین کی مرضی سے طے پاتا ہے۔ دنیا کے ہر قانون میں معاہدہ کے لیے بالغ ہونا شرط ہے اور قرآن نے بلوغت کو سن نکاح سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ جب کوئی بچے یتیم رہ جائیں تو تم ان کے اموال وجائیداد کی حفاظت کرتے رہو۔ ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ﴾ (۶-۴) یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ اس وقت ان کے اموال وجائیداد ان کے سپرد کردو۔ (بشرطیکہ وہ فاتر العقل نہ ہوں) یہاں یہ حقیقت بلاشک وشبہ سامنے آگئی کہ قرآن کی رو سے نکاح کی عمر بلوغت کی عمر ہے۔ بلوغت سے پہلے نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ (قرآنی فیصلے ص ۱۳۴)

اقتباس بالا میں پرویز صاحب نے معاہدہ نکاح کے لیے دو شرائط بتائی ہیں (۱) بلوغت (۲) فریقین کی مرضی۔ اس اقتباس میں آپ نے صرف پہلی شق کی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

اب دیکھئے کسی معاہدہ کے لیے جیسی شرط بالغ ہونا ہے ویسی ہی شرط عاقل ہونا بھی ہے۔ آپ نے پہلی شرط کو تو خوب واضح فرمایا اور دوسری شرط کا ضمناً بریکٹوں میں ذکر کر دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی نابالغ یا نادان کے معاہدہ کی صورت پیش آجائے تو کیا اس کا بھی کوئی حل قرآن نے پیش فرمایا ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ سورہ بقرہ میں جہاں لین دین کے معاہدات کی کتابت کا حکم دیا گیا وہاں ایسی اضطراری صورت کا یہ حل بھی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ﴾ (البقرۃ ۲/ ۲۸۲)

"پھر اگر قرض لینے والا بے عقل ہو یا کمزور ہو یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کروا دے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین صورتوں میں ولی کو معاہدہ کے فریق کا مختار بنا دیا ہے (۱) نادان ہو (۲) کمزور ہو (۳) املا کروانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ اور یہ تینوں باتیں نابالغ میں پائی جاتی ہیں۔ چہ جائیکہ صرف ایک بات پر بھی ولی کو حق اختیار مل جاتا ہے۔ اب اگر نابالغ بچہ کی طرف سے لین دین کے معاملات میں اس کا ولی مختار ہو سکتا ہے۔ تو معاہدہ نکاح میں کیوں نہیں ہو سکتا؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح:** اس سلسلہ میں حضرت عائشہ کا نکاح بھی زیر بحث آگیا۔ تو اس کا جواب دیتے ہوئے پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح بعمر چھ سال مکہ میں ہوا تھا۔ اور سورہ نساء کے یہ احکام مدینہ میں نازل ہوئے۔ لہٰذا اگر بعمر ۶ سال حضرت عائشہ کا نکاح تسلیم کر بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اس باب میں قرآن کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ ان احکام کے نزول کے بعد کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہی سمجھی جائے گی۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تین صاحبزادیوں' حضرت زینب' حضرت ام کلثوم اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہن کی شادیاں اپنے خاندان کے جن لڑکوں سے کی تھیں وہ سب مشرک تھے اور قرآن میں ہے کہ مومن عورت کی شادی مشرک مرد سے جائز نہیں۔ لیکن یہ شادیاں اس زمانہ میں ہوئیں تھیں جب قرآن کا یہ حکم نازل نہیں ہوا تھا کہ مشرک سے شادی جائز نہیں۔" (قرآنی فیصلے ص ۱۳۵)

اقتباس بالا میں پرویز صاحب نے جو مثال پیش فرمائی ہے وہ درست نہیں۔ وجہ یہ ہے مشرک سے نکاح کے حرام ہونے کا حکم نص قطعی سے ثابت ہے۔ ارشاد باری ہے: (البقرۃ ۲/ ۲۲۱)

﴿ وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ ﴾

"اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ اور (مومن عورتوں کو) مشرکوں کے نکاح میں نہ دینا جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔"

یہ آیت اس لیے اپنے مضمون و مفہوم میں صاف ہے کہ یہاں ذکر ہی نکاح کا ہو رہا ہے لیکن جو آیت پرویز صاحب پیش فرما رہے ہیں۔ وہاں اصل ذکر تو یتیموں کے اموال کی حفاظت کا ہے۔ نہ کہ نکاح کا۔ البتہ ضمناً اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ بچے جب بالغ ہو جائیں تو ان کا نکاح کر دینا چاہیئے۔ یا جب وہ نکاح کی ضرورت محسوس کریں تو اس وقت وہ بالغ ہوتے ہیں۔

اب ہم قرآن سے ایسی واضح آیت پیش کرتے ہیں جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ بلوغت سے پہلے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

﴿ وَاللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِن نِّسَائِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَاللَّائِي لَمْ يَحِضْنَ ۚ ﴾ (الطلاق ۶۵/ ۴)

"اور تمہاری (مطلقہ) عورتیں جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تم کو (ان کی عدت کے بارے میں) شبہ ہے۔ تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جن کو ابھی حیض آنا شروع ہی نہیں ہوا۔"

اب دیکھئے سورہ طلاق کی اس آیت میں دو قسم کی مطلقہ عوروں کی عدت تین ماہ بتائی گئی ہے۔ ایک ایسی بوڑھی عورتیں جنہیں حیض آنا بند ہو چکا ہو۔ اور دوسری ایسی نابالغ بچیاں جنہیں ابھی حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ طلاق کا مرحلہ نکاح کے بعد ہی آسکتا ہے پھر جب بلوغت سے پہلے طلاق ہو سکتی ہے تو نکاح کیوں نہیں ہو سکتا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**فریقین کی رضامندی:** ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کی رو سے نکاح کے لیے عورت کی رضامندی بھی انتہائی ضروری ہے۔ لیکن عورت کی رضامندی حاصل کرنے کا واضح حکم احادیث میں موجود ہے۔ قرآن میں نہیں۔ اب قبلہ پرویز صاحب کو احادیث سے جس قسم کی چڑ ہے وہ سب جانتے ہیں۔ لہٰذا درمیان میں حدیث کا واسطہ وہ کیسے گوارا کر سکتے تھے (لہٰذا قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے یہ مفہوم کشید کرنا چاہا ہے فرماتے ہیں)۔

﴿ لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ﴾ (النساء ٤/ ١٩) یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ" (قرآنی فیصلے ص ۱۳۴)۔

اب دیکھئے اس آیت میں پرویز صاحب نے تَرِثُوْا کا ترجمہ مالک بننا کر لیا ہے۔ جو غلط ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث نہ بن بیٹھو۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد اس کے خاندان والے اس کی بیوہ کو میت کی میراث نہ سمجھ بیٹھیں اور زبردستی اس کے والی وارث بن جائیں۔ جس عورت کا شوہر مر گیا۔ اب وہ آزاد ہے۔ عدت گزارنے کے بعد جہاں چاہے جا سکتی ہے اور جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ اس آیت سے جو بات مستنبط ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بیوہ یا مطلقہ عورت اب نئے شوہر کے انتخاب میں آزاد ہے۔ رہا کنواری لڑکیوں کا حق انتخاب تو وہ اس آیت سے قطعاً ثابت نہیں ہوتا۔ اِلّا یہ کہ تَرِثُوا کا ترجمہ ہی "مالک بننا" کر لیا جائے۔

**سارداہل:** آپ فرماتے ہیں:

"جب ہندوستان میں سارداہل پیش ہوا جس کی رو سے نکاح نابالغاں ناجائز قرار دیئے جانے کی تجویز تھی تو اس بل کی مخالفت میں سناتنی ہندوؤں کی ہمنوائی میں مسلمان بھی نہایت شدومد سے شریک تھے۔ اور اس انداز سے شریک کہ گویا یہ بل ان کے دین کے کسی بنیادی رکن کو منہدم کر رہا تھا۔ ہمارے اربابِ شریعت کبھی کسی مسئلہ پر متفق نہیں ہوئے۔ مختلف فرقے مختلف مسائل میں اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں۔ اور آپس میں مصروف جدل وپیکار لیکن یہ ہماری سوختہ بختی کی انتہا تھی۔ کہ سارداہل کی مخالفت میں مسلمانوں کے تمام فرقے متحد اللسان تھے اور اس باب میں جو وفد عظیم وائسرائے کے پاس پہنچا تھا۔ اس میں قریب قریب ہر فرقے کے نمائندے موجود تھے۔ یہ تمام اربابِ شریعت ایک عیسائی حکمران کے حضور یہ کہنے جا رہے تھے کہ اس ہندو کے بل کو پاس نہ کیا جائے۔ جو نابالغوں کا نکاح ناجائز قرار دے رہا ہے۔ ان کا وفد یہ کہنے جا رہا تھا اور آسمان ان کی حرکت پر رو رہا تھا۔ اور دنیا ہنستی تھی۔" (قرآنی فیصلے ص ۱۳۶)

آپ کے اقتباس سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

① مسلمانوں کے مختلف الخیال فرقے اگرچہ اختلافی مسائل میں جدل وپیکار میں مصروف رہتے ہیں۔ تاہم بعض ایسے مسائل بھی سامنے آجاتے ہیں۔ جو اتنے اہم اور اصولی قسم کے ہوتے ہیں۔ کہ ان میں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



سب متحد الخیال ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ نکاح نابالغاں کے جواز کا مسئلہ بھی اسی اہمیت کا حامل ہے۔

② یہ سب فرقے بھی وہی قرآن پڑھتے ہیں۔ جو پرویز صاحب پڑھتے ہیں اختلاف اگر ہے تو صرف یہ کہ وہ پرویز صاحب کی "قرآنی بصیرت کو" غلط سمجھتے ہیں۔

③ پرویز صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ کسی مسئلہ پر متفق نہیں ہوئے وہ بے شمار مسائل میں متفق ہیں۔ مثلاً یہ کہ دن میں نمازیں پانچ ہیں۔ ان کی رکعات کی تعداد' ترتیب نماز' یا روزہ کے احکام' بیع و شریٰ کے احکام' معاملات' غرضیکہ لاتعداد ایسے مسائل ہیں جن میں یہ سب فرقے یک زبان ہو جاتے ہیں۔ حالیہ ادوار میں یہ سب فرقے نکاح نابالغاں کے جواز پر' پاکستان بننے پر ختم نبوت کے مسئلہ پر قرارداد مقاصد پر تحریک نظام مصطفیٰ پر متفق و متحد ہوئے تھے۔ اور یہ سب مسئلے مسلمانوں کے اجتماعی متفق علیہ مسائل تھے۔ پھر یہ سب فرقے مرزا غلام احمد قادیانی سرسید احمد خاں اور جناب محترم پرویز پر کفر کے فتویٰ پر بھی متفق ہو گئے تھے۔ ان میں سے آخری فتوؤں کو تو پرویز صاحب درست نہیں سمجھ سکتے اور نہ ہی نکاح نابالغاں کو باقی تو غالباً آپ کے خیال کے مطابق بھی ان کے فیصلے درست ہی تھے۔

④ آسمان کبھی کسی واقعہ پر رویا نہیں کرتا نہ ہی زمین روتی ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْأَرْضُ﴾ "تو ان پر نہ آسمان رویا نہ زمین۔"

(الدخان ٤٤/ ٢٩)

یہ محض آپ کا شاعرانہ تخیل ہے۔ رو تو آپ خود رہے تھے اور یہ سمجھ لیا کہ آسمان رو رہا ہے۔ رہا دنیا کے ہنسنے کا سوال تو جب مسلمان متحد الخیال ہو گئے تھے تو باقی سوائے پرویز صاحب اور کون باقی رہ گیا تھا۔ جو ازراہ تمسخران کی ہنسی اڑاتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا سے پرویز صاحب اہل مغرب مراد لیتے ہوں۔ یا پھر وہ تعلیم یافتہ طبقہ جو مغرب زدہ ہے۔ اور ہمیں یہی خیال درست معلوم ہوتا ہے۔

**اصل مسئلہ:** اب اصل مسئلہ جہاں سے یہ بحث شروع ہوئی یہ تھا کہ کسی عورت کا بچپن میں صرف ایک سال کی عمر میں اسکے والد نے اپنی برادری کے کسی بچہ سے جس کی عمر دو سال کی تھی نکاح کر دیا۔ عورت جب جوان ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس رشتہ میں موافقت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور عورت اپنے شوہر کے ہاں جانے کو قطعاً تیار نہیں۔ اس نے ادھر ادھر سے فتوے طلب کیے کسی نے کہا تمہارا نکاح مستحکم ہے اور اب فسخ نہیں ہو سکتا اور کسی نے کہا تمہارا نکاح ہی نہیں ہوا۔ اس عورت نے یہی استفسار پرویز صاحب کو بھی لکھ دیا۔ جس کے جواب میں آپ کو اپنی "قرآنی بصیرت" کا اظہار فرمانا پڑا۔ جو ہم پیش کر چکے ہیں۔

اب اگر پرویز صاحب کو سنت رسول ﷺ سے چڑ نہ ہوتی اور ہر بات کو قرآن سے ثابت کر دکھانے کا سودا نہ سمایا ہوتا۔ تو اس مسئلہ کا حل بہت آسان تھا۔ دور نبوی ﷺ میں حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کا نکاح ان کے والد حزام نے ان کی مرضی کے بغیر کر دیا۔ جب اس نے آپ کے سامنے شکایت کی تو آپ نے ایسا نکاح باطل قرار دے کر اسے فسخ کر دیا۔ (بخاری کتاب النکاح باب لایجوز نکاح المکرہ)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



حضرت جعفر کے خاندان کی ایک عورت کو خدشہ تھا کہ اس کا والد اس کے نکاح میں جبر کرے گا۔ اس نے دو انصاریوں عبدالرحمٰن جاریہ اور مجمع بن جاریہ کے پاس یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے کسی کو بھیجا انہوں نے بواپسی جواب دیا۔ "تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خنساء بنت حزام کا نکاح فسخ قرار دیا تھا۔ (بخاری کتاب الحیل۔ باب فی النکاح)

ان واقعات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس عورت کا بچپن کا نکاح جسے وہ پسند نہیں کرتی باطل ہے اور وہ اپنا نکاح کرنے میں آزاد ہے۔

## استفتاء

مضمون ہذا سپرد قلم کرنے کے بعد ماہنامہ "محدث" لاہور کی معرفت اس موضوع سے متعلق ایک استفتاء میرے پاس آیا۔ مستفسر جناب ایس ایم رضا شاہ ایڈووکیٹ (۲۴ رضا بلاک۔ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور) ہیں۔ اس استفتاء کا جو جواب میں نے لکھا وہ محدث فروری ۸۷ء میں شائع ہوا۔ چونکہ اس جواب میں مزید کئی پہلو زیر بحث آگئے ہیں۔ لہٰذا افادیت کی خاطر اس استفتاء اور جواب کو بھی اسی مضمون میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مستفسر موصوف کا خط درج ذیل ہے:

"السلام علیکم---- آپ کے مؤقر ماہنامہ محدث (ستمبر اکتوبر ۸۶ء) میں "نکاح وطلاق وغیرہ کے چند مسائل" کے عنوان کے تحت مولانا سعید مجتبیٰ السعیدی نے ایک سوال کہ "بلوغت سے قبل جو نکاح کیا جائے' کیا یہ نکاح شرعی طور پر جائز ہو گا یا نہیں؟" کے جواب میں فرمایا ہے کہ "صغر سنی میں بلوغت سے قبل جو نکاح کیا جائے' شرعاً واقع ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ لڑکی بلوغت کے بعد اس نکاح پر رضامندی کا اظہار کر دے۔"

نیز مولانا عبدالرحمان کیلانی نے "بچپن کی شادی" کے عنوان کے تحت (شمارہ اگست ۸۶ء) میں فرمایا ہے کہ: "(قرآن ہی سے بچپن کی شادی کا جواز یوں ثابت ہوتا ہے)--- ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَٱلَّٰٓـِٔي يَئِسْنَ مِنَ ٱلْمَحِيضِ مِن نِّسَآئِكُمْ إِنِ ٱرْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَٰثَةُ أَشْهُرٍ وَٱلَّٰٓـِٔي لَمْ يَحِضْنَ ۚ وَأُو۟لَٰتُ ٱلْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ ﴾ (الطلاق ٦٥/ ٤)

"اور تمہاری مطلقہ عورتیں' جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تمہیں (ان کی عدت کے بارے میں) شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں ابھی حیض شروع ہی نہیں ہوا اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔"

"اب دیکھئے آیت بالا میں بوڑھی' جوان اور بچی سب طرح کی عورتوں کا ذکر ہے۔ بوڑھی اور بچی کی عدت تین ماہ ہے اور جوان (یعنی بالغ جو قابل اولاد ہو) کی عدت' اگر اسے حمل ہے' تو وضع حمل تک ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ عدت کا سوال طلاق کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اور طلاق کا نکاح کے بعد گویا نابالغ کا

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



نکاح بھی ازروئے قرآن جائز ہے۔" (محدث اگست ۸۶ ص ۵۳)

قبل ازیں ایک مشہور عالم بھی (ترجمان القرآن ماہ اکتوبر ۶۹ء) میں اس موقف کا اظہار کر چکے ہیں کہ ایسی لڑکی جسے ابھی حیض آنا شروع نہ ہوا ہو' اس سے نہ صرف نکاح کر دینا جائز ہے۔ بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔

تو اس ضمن میں گزارش یہ ہے کہ چونکہ محدث بھی بالا مندرجات سے متفق نظر آتا ہے' لہٰذا آپ اس پر روشنی ڈالیں کہ قرآن سے یہ استدلال اس کی معنوی تحریف میں نہیں آتا؟ اولاً تو یہ دیکھئے کہ آیت میں لفظ "نساء" کا معنی "بچی" کیا جا سکتا ہے؟ قرآن کریم میں متعدد بار اس لفظ کا استعمال آیا ہے کیا خود اللہ رب العزت نے اسے "بچی" کے معنوں میں استعمال کیا ہے؟ مولانا کیلانی صاحب نے ترجمہ کیا ہے: "اور ان کی بھی جنہیں ابھی حیض شروع ہی نہیں ہوا۔"

سوال یہ ہے کہ ﴿ لَمْ يَحِضْنَ ﴾ کا یہ ترجمہ کس قاعدے کی رو سے کیا گیا ہے؟ آپ لفظ "ابھی" سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے مراد نابالغ ہے۔ حالانکہ "نساء" کے لفظ سے یہ ثابت ہے کہ یہ وہ بالغ عورتیں ہیں جن کی عمر تو ایسی ہو کہ انہیں بالعموم حیض آیا کرتا ہے' لیکن کسی عارضہ کے باعث انہیں حیض نہیں آیا۔ تو اس صورت میں عدت کا شمار مہینوں سے ہوگا۔ بہرحال اردو میں قرآن کریم کے متعدد ترجموں میں آیت کا ترجمہ کم وبیش انہی الفاظ میں آیا ہے کہ جن عورتوں کو کسی عارضہ کے سبب حیض نہ آیا ہو۔

جناب کیلانی صاحب نے اپنے مخالف کے اس حوالہ پر کہ "دین کا فیصلہ یہ ہے کہ نکاح کی عمر ہی بلوغت کی عمر ہے" (سورہ النساء آیت ۶) اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ حالانکہ بات تو بالکل صاف ہے کہ یتیموں کے جو مال سرپرستوں کے پاس امانت رکھے جاتے ہیں۔ ان کی واپسی کے سلسلے میں تم یتیموں کو اس وقت تک آزماتے رہو' جب تک کہ وہ نکاح کی عمر کو نہ پہنچ جائیں۔ ﴿ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ﴾ یہاں سے بالکل واضح ہے کہ قرآن کی رو سے نکاح کا وقت وہ ہے جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچیں۔ یعنی لڑکے اور لڑکیوں کی یہ عمر نکاح کی عمر نہیں بلکہ عمر کا ایک حصہ ہے' جس سے گزرتے ہوئے وہ نکاح کی عمر کو پہنچتے ہیں سورہ نساء کی یہ آیت قابل توجہ ہے۔ جب قرآن کی رو سے مردوں اور عورتوں کے نکاح کی شرط ان کا بالغ ہونا ہے' تو ثابت ہوتا ہے کہ نابالغ بچیوں کا نکاح قرآن کی منشاء کے خلاف ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ فریقین میں اگر کوئی فریق نابالغ ہے اور وہ نکاح باندھ جائے تو وہ بندھتا ہی نہیں ہے۔ نکاح کو ﴿ مِيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴾ (النساء:۲۱) یعنی "پختہ معاہدہ" قرار دیا گیا ہے۔ اور معاہدہ کے لیے ضروری ہے کہ فریقین بالغ ہوں۔ ایل۔ایل۔بی کی تیاری میں ہم نے (Law Contract) کے تحت پڑھا تھا کہ معاہدہ ہوتا ہی بالغ افراد کے درمیان ہے۔ نکاح کی تشریح لفظ "عقدہ النکاح" میں موجود ہے "عقد" کا معنی "گرہ" بھی ہے۔ اور "وعدہ" بھی۔ "عقود" اس کی جمع ہے۔ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ کہ "ایمان والو' وعدے وفا کیا کرو" ظاہر ہے کہ یہ حکم بالغ مرد وعورت کو دیا جا رہا ہے' نابالغ بچی کو نہیں جو نہ عہد نکاح کو سمجھے نہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



وفائے عہد سے واقف ہو۔ عقد نکاح وہ وعدہ ہے' جس سے ازدواجی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اور فریقین اپنی اپنی ذمہ داریوں کے لیے پابند کیے جاتے ہیں۔ عورتوں کو ﴿ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ﴾ کی رو سے گھریلو ذمہ داریوں کو نبھانا ہے' جب کہ مرد بروئے آیت ﴿ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ عورتوں کی ضروریات زندگی کے کفیل ہیں "عقد" ایک وعدہ ہے جو عرف عام میں ایجاب وقبول کے مصداق ہے۔ عورت اپنی تمام نسوانی خدمات پیش کرتی ہے اور مرد قبول کرتا ہے۔ اب بتایئے کہ اگر فریقین کی یہ حالت ہے کہ لڑکا نابالغ ہے' نہ اولاد پیدا کرنے کے قابل' نہ روزی کمانے کے لائق' تو کس سے وعدہ لیا جائے گا کہ بیوی کی ضروریات زندگی پوری کرے گا؟ اسی طرح اگر لڑکی نابالغ ہے' نہ گھر کا کام کرنے کے قابل ہے نہ اولاد پیدا کرنے کے قابل' تو کس سے عقد ہوگا؟ کس سے وعدہ لیا جائے گا کہ گھر کا کام کاج اور اولاد پیدا کر کے اس کی صحیح تربیت اور پرورش کے فرائض سرانجام دے گی؟ عقد نکاح حقیقت پر مبنی ہوتا ہے یہ کوئی ڈرامہ نہیں ہے نہ ہی گڑیوں کا کھیل۔ اگر کسی پانچویں جماعت کے لڑکے کو گورنمنٹ ہاؤس لے جا کر جج کے عہدے کا حلف اس سے اٹھوایا جائے کہ وہ اس فرض کو نہایت دیانتداری سے ادا کرے گا تو جس طرح وہ لڑکا جج نہیں ہوتا' اسی طرح اگر کسی نابالغ لڑکے یا لڑکی سے نکاح کا عہد کرایا گیا تو نہ لڑکا شوہر ہوتا ہے نہ لڑکی بیوی۔ قرآن کی رو سے جب وہ نکاح کو پہنچے ہی نہیں تو نابالغی کا نکاح' نکاح ہی نہیں۔

پھر ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ نابالغ لڑکی' بالغ ہونے پر اگر نکاح کو رد کر دے تو فسخ ہو جاتا ہے۔ تو پھر وہ نکاح کیسا تھا؟ اس کی کیا حیثیت تھی؟ قرآن کریم نے مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے ﴿ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ﴾ کہ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں" کھیتی چونکہ پیداوار کے لیے ہوتی ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ لڑکی جب تک بالغ نہ ہو' کھیتی نہیں کہلا سکتی۔ بالغ ہو کر پیداوار کے قابل ہو جائے تو کھیتی ہوگی اور تب اس کے نکاح کا سوال پیدا ہوگا۔ پھر ایک اور بات بھی قابل غور ہے' کہ وہ ایسے مرد کے سپرد کی جائے گی جو اولاد پیدا کرنے کے قابل ہو یعنی بالغ ہو۔ کھیتی کا لفظ عورت کے لیے لایا گیا ہے جو بالغ اور اولاد پیدا کرنے کے قابل ہوتی ہے' نابالغ بچی کے لیے نہیں آیا۔ جو پھل ابھی پکا ہی نہیں' اسے آپ توڑ کر کھانے کے لیے کیسے موزوں سمجھیں گے؟

پھر طبی نقطہ نظر سے بھی نابالغ بچی قابل مجامعت نہیں۔ اس سے خلوت ضرر انگیز ہے اور کئی جسمانی عوارض کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ آپ کسی ماہر گائناکالوجسٹ سے استفسار کیجیے' امید ہے آپ محدث کے "ٹائٹل بیک" پر تحریر کردہ اعلانات کی روشنی میں "علوم جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار' انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں" اپنے اعلیٰ خیالات سے مستفید فرمائیں گے۔ بہتر ہوگا اگر میرا عریضہ بھی ساتھ ہی شائع کر دیں تاکہ قارئین دونوں نقطہ نظر سے آگاہ ہو سکیں۔ والسلام!

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



## جواب

ا۔ نکاح کی عمر؟: احکام واصول شرعیہ میں یہ حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ عام حالات میں ان اصول واحکام کا اطلاق عام مسلمانوں پر ہو سکے۔ تاہم انسانوں کی مختلف استعداد اور مختلف صورت احوال کا لحاظ رکھتے ہوئے شریعت مطہرہ نے مستثنیات کا حل بھی پیش فرما دیا ہے۔ ایسے مستثنیات محض جواز یا رخصت کے درجہ پر ہوتے ہیں' اصولی احکام کے درجہ پر نہیں--- یہ مستثنیات کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:

(الف) بعض دفعہ یہ مستثنیات حالات سے مشروط ہوتے ہیں۔ جیسے نماز کے لیے اصولی طور پر تو پانی سے وضو کرنے کا حکم ہے۔ لیکن اگر پانی نہ مل سکے یا پانی تو دستیاب ہو' مگر کسی بیماری کی وجہ سے اس کا استعمال نقصان دہ ہو یا کوئی دیگر ایسا قوی مانع موجود ہو جس کی وجہ سے نمازی پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو تو مٹی سے تیمم کر سکتا ہے۔ ایسے حالات میں تیمم کرنا رخصت یا جواز ہے۔

(ب) اصل حکم یہ ہے کہ ہر بالغ مسلمان رمضان کے روزے رکھے۔ اب پیر فرتوت یا ایسا مریض جس کا مرض لاعلاج شکل اختیار کر چکا ہو' کفارہ دے سکتا ہے۔ کفارہ کی ادائیگی رخصت ہے اور جواز کے درجہ پر ہے کوئی اصل یا حکم نہیں۔

(ج) حالت اضطرار میں محرمات تک بھی حلال ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں مردار کھا لینا رخصت یا اجازت ہی رہے گی۔ اصولی حکم نہیں بن سکتا۔

غرض اس طرح کی بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہر معاملہ میں ہمیں یہ تمیز کر لینی چاہیئے کہ اصولی حکم کیا ہے اور رخصت کیا؟ اور ان دونوں کو آپس میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہیئے۔

اب مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ اصولی طور پر نکاح کی عمر کیا ہے؟ تو اس کے متعلق ہم واشگاف لفظوں میں یہ کہیں گے کہ نکاح کی اصل عمر بلوغت ہی ہے جو اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس اصول میں کچھ مستثنیات بھی ہیں یا نہیں؟ بالفاظ دیگر یہ سوال یوں گا کہ آیا بلوغت سے قبل بچپن میں بھی نکاح جائز ہے یا نہیں؟

مستثنیات کی تلاش و تحقیق کے لیے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ نکاح کے مقاصد کیا ہیں؟ شاہ صاحب موصوف کے نزدیک نکاح کا مقصد صرف حصول اولاد ہے۔ لہٰذا ان کے سارے دلائل کا محور یہی ہونا چاہیئے کہ نکاح کی عمر حقیقتاً بلوغت ہی ہے۔ اس سے پہلے چونکہ یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا قبل از بلوغت نکاح بھی جائز نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارے نزدیک نکاح کے مقاصد اور بھی ہیں' صرف حصول اولاد نہیں۔ نکاح کا اصل مقصد--- جس کے لیے اسلام نے نکاح کا حکم دیا ہے--- فحاشی' بے حیائی اور زنا سے اجتناب' مرد و عورت دونوں کی عفیف زندگی اور اس طرح پاک وصاف اور ستھرے معاشرہ کا قیام ہے۔ اسی لیے کتاب وسنت میں والدین

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



کو بلوغت کے فوراً بعد نکاح کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ رہی حصول اولاد کی بات' تو یہ اصل مقصد نہیں بلکہ ایک اہم مقصد کا ثمرہ ہے۔ اور جو انسان کے اپنے بس کی بات ہے ہی نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک بالغ جوڑے کی شادی کر دی جائے اور تازیست ان کے ہاں اولاد نہ ہو۔ تو اس پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نکاح بلا مقصد ہے--- اگرچہ ایسے واقعات کی تعداد ۵ فیصد سے زیادہ نہیں تاہم اس سے انکار بھی ممکن نہیں۔

نکاح کا دوسرا مقصد' قریبی رشتہ داروں میں قرابت کے تعلق کو برقرار رکھنا اور مودت کو بڑھانا ہے۔ تیسرا مقصد دینی اخوت کا قیام اور اس میں اضافہ ہے۔ غرضیکہ نکاح ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کئی طرح کے دینی' سیاسی' معاشی اور معاشرتی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسے مقاصد حصول اولاد سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ آپ ذرا حضرت رسول اکرم ﷺ کی زندگی پر نظر ڈالئے کہ آپ ﷺ نے کتنے نکاح کئے؟ کس عمر میں کیے؟ کس عمر کی عورتوں سے کیے اور کس کس مقصد کے تحت کیے؟ تو یہ حقیقت از خود منکشف ہو جائے گی کہ نکاح کا مقصد محض جنسی خواہشات کی تکمیل یا حصول اولاد ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے بلند تر مقاصد بھی ہو سکتے ہیں۔

اب جب کہ نکاح کے مقاصد ہی میں تنوع پیدا ہو گیا تو ضروری ہے کہ نکاح کی عمر' بلوغت' میں بھی استثناء موجود ہو۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ اصولی طور پر نکاح کی عمر بلوغت ہے تاہم یہ ہر عمر میں جائز ہے اور جائز ہونا بھی چاہیئے۔ اس لحاظ سے اگر ایک طرف نابالغ بچی کا نکاح نابالغ لڑکے' جوان اور بوڑھے سے جائز ہے تو دوسری طرف ایک لڑکے کا نکاح اپنے سے بہت بڑی عمر کی عورت' مطلقہ بلکہ دو تین بار کی مطلقہ عورت سے بھی جائز ہے۔

۲۔ معنوی تحریف: شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب "بچی" کے لیے قرآن میں "نساء" کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں ہوا تو پھر جس آیت زیر بحث (النساء:۶۵) میں "نساء" کے لفظ سے خطاب ہے' اس میں بچیوں کو کیوں شامل کر کے نابالغ لڑکی کے نکاح کا جواز ثابت کیا جاتا ہے؟ [1] اور اگر کوئی شخص "نساء" میں خواہ مخواہ بچیوں کو شامل کر کے بچی کے نکاح کو درست سمجھتا ہے تو اسے قرآن کی معنوی تحریف کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

---

[1] سورہ نساء کی پہلی آیت میں ہے کہ اللہ نے سب انسانوں کو ایک جان سے پیدا کیا (آدم علیہ السلام) پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا پھر اس جوڑے سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائے ﴿ وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيرًا وَّنِسَآءً ﴾ " رِجَالاً " اور " نِسَآءً " کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔ اگر شاہ صاحب کے نزدیک "نساء" میں "بچی" کو شامل کرنا جائز نہیں تو کیا نابالغ بچے بچیاں " رِجَالاً " اور " نِسَآءً " میں شامل نہ ہو کر اولاد آدم وحوا نہیں؟ واضح رہے یہ آیت نکاح کے موقع پر پڑھی جاتی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس ضمن میں ہم صرف اسی قدر عرض کریں گے کہ جس طرح عورتوں اور مردوں کے مشترکہ مجمع یا گروہ کے لیے خطاب کے وقت جمع مذکر کے صیغے اور ضمائر ہی استعمال کیے جاتے ہیں' اور یہ خصوصیت صرف عربی زبان کی ہی نہیں' بلکہ ہر ملک میں اور ہر زبان میں یہی دستور ہے' بالکل اسی طرح اگر کسی ایسے اجتماع یا گروہ کو خطاب کیا جائے جس میں بچیاں' جوان اور بوڑھی ہر طرح کی عورتیں موجود ہوں تو ان کے لیے "نساء" کا لفظ ہی استعمال ہوگا۔ آیت زیر بحث میں چونکہ ہر طرح کی عورتوں کی عدت کا ذکر ہے' لہٰذا یہاں لفظ "نساء" آیا اور یہی آنا چاہیئے تھا۔ ہم شاہ صاحب سے پوچھتے ہیں کہ اگر انہیں ایسے مجمع کو خطاب کرنا پڑے جس میں بچیاں' جوان اور بوڑھیاں سب اس نسبت سے ہی موجود ہوں جس نسبت سے معاشرہ میں موجود ہیں' تو وہ ایسے مجمع سے خطاب کے لیے کونسا لفظ استعمال کریں گے؟

معنوی تحریف کے سلسلہ میں شاہ صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ﴿ لَمْ يَحِضْنَ ﴾ کا ترجمہ "جنہیں ابھی حیض شروع ہی نہیں ہوا" گرائمر کے کس قاعدہ کی رو سے ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب مضارع پر ﴿ لَمْ ﴾ داخل ہو تو دو طرح کے معنوی تغیر کا سبب بنتا ہے۔ ایک تو مضارع کو ماضی میں بدل دیتا ہے دوسرے منفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے جو ترجمہ ہم نے پیش کیا تھا وہ درست ہے۔ اور ہم اپنی تائید میں درج ذیل شواہد بھی پیش کرتے ہیں۔

ترجمہ نمبر۱: شاہ رفیع الدین صاحب۔ "اور وہ جو نہیں حائض ہوئیں۔"

ترجمہ نمبر۲: فتح الحمید۔ "اور جن کو ابھی حیض نہیں آنے لگا۔"

ترجمہ نمبر۳: تفہیم القرآن۔ "اور یہی حکم ان کا ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو۔"

ترجمہ نمبر۴: کنز الایمان۔ (احمد رضا خاں صاحب) "اور ان کی جنہیں ابھی حیض نہ آیا"

ہمارے خیال میں ہمارے ترجمہ کی تائید میں اتنے شواہد کافی ہیں۔ تاہم عند الطلب ان میں کافی حد تک اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب جناب شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

"اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کی عمر تو ایسی ہو کہ انہیں بالعموم حیض آیا کرتا ہے۔ لیکن کسی عارضہ کے باعث انہیں حیض نہیں آتا' تو اس صورت میں عدت کا شمار مہینوں سے ہوگا۔ بہرحال اردو میں قرآن مجید کے متواتر ترجموں میں اس آیت کا ترجمہ کم و بیش انہی الفاظ میں آیا ہے کہ جن عورتوں کو کسی عارضہ کے سبب حیض نہ آیا ہو۔"

شاہ صاحب کے اس ترجمہ پر ہمیں دو اعتراض ہیں۔ پہلا یہ کہ ان کے موقف کے مطابق نکاح کی عمر بلوغت ہے۔ اور بلوغت کی عمر کی علامت لڑکے کے لیے احتلام اور لڑکی کے لیے حیض کا آنا ہے۔ اب اگر کسی لڑکی کو تادیر حیض ہی نہیں آتا۔ خواہ یہ کسی عارضہ کے باعث ہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ وہ بالغہ کہلا سکتی ہے اور نہ ہی اس کا نکاح ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کی طلاق یا عدت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی عورتوں کی بھی عدت کا ذکر کر دیا ہے (چلئے شاہ صاحب ہی کے بقول کہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



"انہیں کسی عارضہ کے باعث حیض نہیں آیا" تو کیا ان کا نکاح ناجائز ہو گا؟ حالانکہ قرآن مجید نے اگر ان کی عدت کا ذکر کیا ہے تو یہ عدت طلاق کے بعد' اور طلاق نکاح کے بعد ہی واقع ہوتی ہے) لہٰذا معلوم ہوا کہ حیض آئے بغیر یا حیض آنے سے پہلے بھی عورت کا نکاح ہو سکتا ہے۔

اور ہمارا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ ان کے متعین کردہ معانی متعدد اردو تراجم میں موجود ہیں۔ لیکن ان "متعدد اردو تراجم" میں سے حوالہ کسی ایک کا بھی نہیں دیا' لہٰذا یہ بے دلیل بات ہوئی۔ شاہ صاحب کے اس بیان میں حقیقت صرف اس قدر ہے کہ حیض نہ آنے کی چار مختلف صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے اور وہ چاروں صورتیں یہ ہیں۔

(۱) کمسنی کی وجہ سے حیض نہ آنا۔

(۲) کسی عارضہ کی وجہ سے کافی عمر تک حیض نہ آنا۔

(۳) ساری عمر ہی حیض نہ آنا۔

(۴) بڑھاپے کی وجہ سے حیض کا بند ہو جانا۔

ان چار صورتوں میں آخری صورت کا تو قرآن نے الگ سے ذکر کر دیا ہے۔ باقی تینوں صورتیں لَمْ یَحِضْنَ کے حکم میں شامل ہیں۔ یعنی ان تینوں قسم کی عورتوں کا نکاح بھی ہو سکتا ہے۔ اور طلاق بھی اور ان کی عدت تین ماہ ہی ہو گی۔ اس تفسیری عموم کے باوجود چونکہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ وہی ہے جو ہم نے پیش کیا ہے۔ لہٰذا ان تین صورتوں میں سے بھی ترجیحی صورت وہی پہلی متصور ہو گی جس کی رو سے نابالغ بچیوں کا نکاح جائز قرار پاتا ہے۔

۳۔ عقدِ نکاح اور بلوغت: آپ فرماتے ہیں کہ عقد نکاح میں ایجاب وقبول شرط لازم ہے' اور یہ ایجاب قبول اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ فریقین میں سے ہر ایک بالغ ہو۔ نیز فرمایا کہ:

"عقد نکاح حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ کوئی ڈرامہ یا گڑیوں کا کھیل تو نہیں ہو گا۔ اگر کسی پانچویں جماعت کے لڑکے کو گورنمنٹ ہاؤس لے جا کر جج کے عہدے کا حلف اٹھوایا جائے کہ وہ اس فرض کو نہایت دیانتداری سے ادا کرے گا تو جس طرح وہ لڑکا جج نہیں ہوتا' اسی طرح اگر کسی نابالغ لڑکے یا لڑکی سے نکاح کا عہد کرایا گیا تو نہ لڑکا شوہر ہوتا ہے نہ لڑکی بیوی۔ قرآن کی رو سے جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچے ہی نہیں تو نابالغی کا نکاح نکاح ہی نہیں؟"

اس اقتباس کے آخری جملے کا جواب تو ہم دے چکے ہیں۔ اب آپ کی پیش کردہ مثال کی طرف آیئے' تو یہ مثال قیاس مع الفارق ہے اور کئی وجوہ کی بناء پر غلط۔ مثلاً:

① مشاہدہ یہ ہے کہ پانچویں جماعت میں پڑھنے والے بچوں میں سے ایک فیصد بھی ایسے نہیں ہوتے جو جج کے عہدہ پر فائز ہوں۔ لیکن بچپن کی شادیاں اکثر کامیاب ہی ثابت ہوتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں سے ایک فیصد ہی شادیاں ہوتی ہیں جو کامیاب نہیں رہتیں' تو بے جا نہ ہو گا۔ دورِ نبوی پر نظر ڈالیے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



ان دنوں بچپن کی شادی کا رواج عام تھا۔ لیکن سارے دور نبوی میں عدالت نبوی ﷺ میں صرف ایک مقدمہ ایسا آیا جس پر لڑکی نے بلوغت کے بعد اپنے ولی کے نکاح پر ناراضامندی کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے اس عورت کو (نکاح کے باقی رکھنے یا فسخ کرنے کا) اختیار دے دیا۔ اس پر اس نے یہ کہا کہ "میں اپنے باپ کے کئے ہوئے نکاح کو باقی رکھتی ہوں۔ اس سوال سے میرا مقصود صرف یہ تھا کہ عورتوں کو علم ہو جائے' نکاح کے معاملہ میں (ان کی مرضی کے بغیر ان کے) آباء کو کوئی حق نہیں۔" (سنن ابن ماجہ مع مفتاح الحاجۃ ص ۱۳۶)

② عملی لحاظ سے یہ مثال اس لیے غلط ہے کہ بچپن کی شادی کی صورت میں ایجاب یا قبول' لڑکی یا لڑکا خود نہیں کرتے' نہ ہی ان سے کروایا جاتا ہے۔ بلکہ ان کے والدین یا ولی کیا کرتے ہیں۔ حلف وفاداری کا عمل صرف اصالتاً ہی وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ جب کہ ایجاب وقبول کی ذمہ داریاں ولایتاً بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نابالغ بچی کا نکاح ہو رہا ہو' تو اسی سے نکاح پر رضامندی کے لیے صاد کرایا جائے (ایجاب) یا نابالغ بچے سے حق مہر اور نان ونفقہ کی ذمہ داریوں کا اقرار بھی اسی نابالغ سے کروایا جائے (قبول) بلکہ لڑکے کا والد' جو ایسی ذمہ داری قبول کرتا ہے' تو وہ اس کو پوری ذمہ داری کے ساتھ نباہتا بھی ہے۔ تاآنکہ لڑکا بالغ اور برسر روزگار ہو کر اپنی ذمہ داری خود سنبھالنے کے قابل ہو جاتا' اور پھر اسے سنبھال بھی لیتا ہے۔ یہی صورت حال لڑکی کے والد یا ولی کی بھی ہوتی ہے۔

اب دیکھنے کی بات صرف یہ رہ جاتی ہے کہ عقود ومعاہدات میں ولایت کو قرآن کریم نے تسلیم کیا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب ہمیں قرآن مجید سے اثبات میں ملتا ہے۔ شاہ صاحب تو معاہدہ کے لیے صرف بلوغت کو شرط قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ معاہدہ کے لیے بالغ ہونے کے علاوہ عاقل ہونا بھی لازمی شرط ہے۔ اب یا تو ایسے نابالغ اور نادان افراد کو ایسے تمام حقوق سے محروم کر دیجیے' جن کی حفاظت معاہدات وعقود کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ یا پھر معاہدات میں ولایت کو تسلیم کر لیجیے۔ لین دین کے معاہدات میں جہاں کتابت کا حکم دیا گیا ہے۔ وہاں ایسی صورتوں کا حل بھی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِن كَانَ ٱلَّذِى عَلَيْهِ ٱلْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُۥ بِٱلْعَدْلِ﴾ (البقرۃ ۲/ ۲۸۲)

"پھر اگر قرض لینے والا بے عقل ہو یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کروا دے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین صورتوں میں ولی کو معاہدہ کے فریق کا مختار بنا دیا ہے۔

1. نادان ہو۔
2. ضعیف ہو (یاد رہے کہ قرآن میں "ضعیف" کا لفظ "چھوٹے بچے" کیلئے بھی آیا ہے' جیسے فرمایا: ﴿وَلَهُۥ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ﴾ یعنی "اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔" اور:
3. املا کروانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اور نابالغ میں یہ تینوں باتیں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ چہ جائیکہ بروئے قرآن صرف ایک پر بھی ولی کو حق ولایت تفویض کیا جا سکتا ہے۔ اب اگر نابالغ کی طرف سے لین دین کے معاملات میں اس کا ولی مختار ہو سکتا ہے۔ تو معاہدہ نکاح میں کیوں نہیں ہو سکتا۔ نادان' نابالغ اور املاء نہ کرا سکنے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ معاہدات وعقود اور دیگر ایسے اہم معاملات میں ولی مقرر کرے' اور ولی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے مفادات کی پوری پوری حفاظت کرے۔ گویا ان تین صورتوں میں سے صرف ایک صورت موجود ہونے کی بنا پر بھی ولی مقرر کرنے کا حق قرآن مجید نے دیا ہے' تو نابالغ' جس میں یہ تینوں صورتیں بیک وقت پائی جاتی ہیں' یعنی ناپختہ عقل' کم سنی اور املاء نہ کرا سکنا' تو اسے معاہدہ نکاح میں ولی مقرر کرنے کا یہ حق کیوں حاصل نہیں ہو سکتا؟ چنانچہ ولی اس کے ہمہ پہلو مفادات کا نگران ہوتا ہے۔ پھر نابالغ ہونے کی بنا پر نکاح ناجائز کیوں ہوا؟

معاہدات وعقود کے سلسلے میں شاہ صاحب نے ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ:

"اگر لڑکی نابالغ ہے نہ گھر کا کام کاج کرنے کے قابل ہے نہ اولاد پیدا کرنے کے قابل تو کس سے عقد ہو گا؟"

تو یہ دلیل اس لیے انتہائی کمزور ہے کہ اگر ایک بالغ عورت گھر کا کام کاج کرنے یا اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو تو کیا اس کا نکاح بھی ناجائز وباطل ہو جائے گا؟"

## ۴۔ بچپن کے نکاح کی حیثیت:

شاہ صاحب نے بچپن کے نکاح کے ابطال پر یہ دلیل پیش فرمائی ہے کہ:

"ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ نابالغ لڑکی بالغ ہونے پر اگر نکاح کو رد کر دے تو وہ فسخ ہو جاتا ہے۔ [1] تو پھر وہ نکاح کیسا تھا؟ اس کی حیثیت کیا تھی؟"

اس اعتراض کا جواب دراصل شاہ صاحب کی اپنی عبارت ہی میں موجود ہے۔ اگر بچپن کا نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا تو لڑکی رد کس چیز کو کرتی ہے؟ پھر اگر نکاح ہوا ہی نہیں تو فسخ کیا چیز ہوتی ہے؟ رد اور فسخ دونوں الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ فقہاء یہ کہتے ہیں کہ بچپن کا نکاح بالکل درست طور پر اور ٹھیک ٹھاک منعقد ہو جاتا ہے۔ پھر یہ رد کرنا بھی ایسا نہیں ہے کہ لڑکی جوان ہوئی تو اس نے زبان سے کہہ دیا کہ "مجھے یہ نکاح پسند نہیں یا میں اس نکاح کو رد کرتی ہوں" تو فوراً آپ سے آپ نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کے لیے عورت کو باقاعدہ عدالتی چارہ جوئی کرنا پڑتی ہے۔ اور عدالت ہی اس بات کی مجاز ہوتی ہے کہ وہ ایسا نکاح فسخ قرار دے۔

---

[1] یہ بات تو دراصل رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی معلوم نہیں کہ شاہ صاحب نے رسول اللہ ﷺ یا سنت رسول ﷺ کے حوالہ سے بات کرنے سے پرہیز میں کیا مصلحت سمجھی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



بچپن کے نکاح کے ابطال پر شاہ صاحب موصوف نے ایک دلیل یہ بھی پیش فرمائی ہے کہ قرآن میں ہے ﴿ نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ﴾ اس سے بھی آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جب تک لڑکی بالغ نہ ہو وہ کھیتی بن ہی نہیں سکتی۔ جو پھل ابھی پکا ہی نہیں اسے آپ توڑ کر کھانے کیلئے کیسے موزوں سمجھیں گے؟

یہاں بھی شاہ صاحب نے ایک دفعہ پھر اپنا موقف دہرایا ہے' جس کے تحت وہ سمجھتے ہیں کہ نکاح کا مقصد حصولِ اولاد کے سوا اور کچھ نہیں۔ جب کہ ہم بدلائل یہ ثابت کر چکے ہیں کہ نکاح کے مقاصد حصولِ اولاد کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا مقاصد کے تنوع کی بنا پر شریعت نے اس اصول میں لچک اور وسعت رکھی ہے۔

## ۵۔ کمسنی کے نکاح کے جواز پر قرآن مجید سے دوسری دلیل:

اگرچہ دور نبوی میں بچپن کے نکاح کا رواج عام تھا' تاہم رخصتی اسی وقت ہوتی تھی جب عورت بالغ ہو جاتی تھی۔ پھر بعض دفعہ یوں بھی ہوتا کہ رخصتی یا بالفاظ دیگر مجامعت سے قبل ہی طلاق کی بھی نوبت آجاتی۔ ایسی ہی صورت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ ﴾ (البقرۃ۲/ ۲۳۷)

"اور اگر تم اپنی ایسی بیبیوں کو طلاق دو' جن سے تم نے صحبت نہ کی ہو اور حق مہر مقرر کر چکے ہو تو مقررہ رقم کا نصف دینا ہوگا۔"

اب سوچئے کہ اگر جوان مرد اور جوان عورت کا نکاح اور ساتھ ہی ساتھ رخصتی بھی کر دی جائے تو کیا ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ شب زفاف کی مجامعت سے پہلے ہی طلاق واقع ہو جائے؟ لیکن اس کے باوجود مجامعت سے پیشتر طلاق کا وقوع پذیر ہونا ایک ایسی حقیقت ہے' جسے قرآن نے بطور حقیقت تسلیم کر کے ایسی صورت میں حق مہر کی ادائیگی کے متعلق فیصلہ بھی دے دیا ہے ایسی طلاق کی صورت ہمارے خیال میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ نکاح تو بچپن میں ہو چکا ہو لیکن رخصتی کو بلوغت تک کے لیے روک دیا گیا ہو۔ اس وقفہ کے دوران خاندانی رقابتوں یا دوسرے تنازعات کی بناء پر لڑکے کو طلاق دینے کے لیے مجبور کیا جائے یا وہ از خود اسی وجہ سے یا ناپسندیدگی کی بناء پر طلاق دے دے۔ گویا ہمارے نزدیک قرآن کا مجامعت سے پہلے طلاق کی حقیقت کو تسلیم کر لینا ہی بچپن کے نکاح کے جواز کی دوسری دلیل ہے۔ اور اگر شاہ صاحب کہیں کہ بالغ مرد و عورت کے نکاح میں بھی ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ مجامعت سے قبل طلاق واقع ہو جائے تو یہی صورت نابالغ بچی کے نکاح میں بالاولیٰ داخل ہے۔ اور قرآنی حکم کا عموم اس صورت کو مانع نہیں!

**۶۔ مجامعت قبل از بلوغت:** ہم ایک دفعہ پھر شاہ صاحب کے یہ الفاظ سامنے لاتے ہیں کہ "جو پھل ابھی پکا ہی نہیں' اسے آپ توڑ کر کھانے کے لیے کیسے موزوں سمجھیں گے؟" اس کے جواب میں ہم یہ

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



وضاحت کر چکے ہیں کہ رواج یہ تھا کہ بچپن میں نکاح تو کر دیا جاتا تھا۔ لیکن رخصتی عموماً بلوغت کے بعد ہی ہوا کرتی تھی۔ ہمارے ہاں عربوں کے ایسے نکاح کا مقام منگنی نے لے لیا اور رخصتی کا مقام شادی (نکاح + رخصتی) نے گویا جس طرح ہمارے ہاں بعض دفعہ منگنیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ ان کے ہاں طلاق کے ذریعہ ایسے قصے ختم کئے جاتے تھے۔ اندریں صورت حال نابالغ بچی سے مجامعت کا سوال کم ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس بات کی وضاحت بھی لاحاصل ہے کہ نابالغ بچی سے مجامعت اس کی صحت پر بری طرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمیں کسی گائناکالوجسٹ سے پوچھنے کی ضرورت تو تب ہی ہو سکتی ہے جب کسی کو اس کے نقصانات سے انکار یا اختلاف ہو۔ ان سب باتوں کے باوجود اگر کبھی ایسا اتفاق ہو جائے کہ کوئی شوہر اپنی کمسن زوجہ سے مجامعت کر بیٹھے تو اس کے اس فعل کو زیادہ سے زیادہ ناپسندیدہ ہی کہا جا سکتا ہے' اسے گنہگار نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس کی بیوی کا نقصان اس کا اپنا ہی نقصان ہے۔ بیوی کی صحت خراب ہوگی تو اس کے علاج معالجہ کے اخراجات بھی اسے ہی برداشت کرنا پڑیں گے اور تیمارداری کی ڈیوٹی بھی سرانجام دینا ہوگی۔ گویا نقصان دونوں کا ہوگا اگرچہ اس کی نوعیت الگ الگ ہوگی۔

پھر بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ عورت ہوتی تو بالغ یا جوان ہے مگر صحت کی خرابی یا کمزوری کی وجہ سے اس سے مجامعت کرنا اس کی بیماری میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ اب اگر یہ بیمار بیوی' سوکن کو برداشت کرنے سے یہی بہتر سمجھے کہ شوہر اس سے مجامعت کرے یا مرد' عورت سے وفاداری' یا معاشی تنگی کی بناء پر دوسری عورت گھر میں لانے پر آمادہ نہ ہو تو ایسی صورت میں آپ کیا علاج تجویز فرمائیں گے؟ یہ مسئلہ دراصل ایسا لاینحل بن جاتا ہے کہ میاں بیوی باہمی رضامندی یا مشاورت سے ہی اس کا کوئی حل سوچ سکتے ہیں اور وہی حل سب سے بہتر ہوتا ہے۔ اگر بیمار بیوی' اور اسی طرح کمسن بیوی' اپنے شوہر کو مجامعت کی اجازت دیتی یا اس پر رضامند ہو جاتی ہے تو اس پر دوسروں کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ پھر یہ بھی مشاہدہ کی بات ہے کہ ایسے خاوند اپنی بیویوں کی پوری ہمدردی سے علاج کرانے کے علاوہ ان پر اپنی جان بھی چھڑکتے ہیں۔ گویا اگر عورت شوہر کی محبت کی خاطر اپنی صحت کی قربانی دیتی ہے تو مرد بھی ایسی وفا شعار بیوی کے ممکن حد تک قدر دان ہوتے ہیں۔ لہٰذا میاں بیوی کے معاملات--- جیسے بھی ہوں۔ کو وہ خود ہی باہمی رضامندی اور مشاورت سے بہتر طور پر حل کر سکتے ہیں۔ اور ایسا ہی حل بہتر ہوتا ہے' اگرچہ وہ دوسرے لوگوں کو کسی ایک فریق کے حق میں ضرر انگیز معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال جس طرح مجامعت قبل از بلوغت نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے' اسی طرح بعد از بلوغت بھی اس کا ضرر رساں ہونا ممکنات میں سے نہیں۔ لہٰذا یہ بات بھی نابالغی کے نکاح کے ناجائز ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔

۷۔ کمسنی کے نکاح کی مخالفت کی اصل وجہ: ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ نکاح کے حکم اور ترغیب کا سب سے اہم مقصد فحاشی و بے حیائی سے پاک ایک پاکیزہ معاشرہ کا قیام ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے تمام بے شوہر عورتوں خواہ وہ کنواری ہوں یا مطلقہ ہوں یا بیوہ ہوں' کے نکاح کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح ہر بے زن

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



مرد کے لیے بھی نکاح کرنے اور معاشرہ کو ایسے نکاح کا اہتمام کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم کمسنی کے نکاح پر غور کریں تو یہ حصول مقصد کے سلسلہ میں ضرر رساں ہونے کی بہ نسبت مفید ہی نظر آتا ہے۔ اسی لیے شرعی نقطہ نظر سے کمسنی کا نکاح جائز قرار پاتا ہے۔

ہمارے جو دوست نکاح کی عمر بلوغت' پر زور دیتے اور اس سے پہلے کمسنی کے نکاح کو ناجائز قرار دیتے ہیں ان کا مقصد معاشرہ کا عفاف ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ وہ دراصل یورپی تہذیب سے متاثر ہو کر ایسا پرچار کرتے ہیں۔ انگلستان کے مشہور معیشت دان "مالتھس" نے ملک کی خوشحالی کے لیے آبادی کی روک تھام کو لازمی قرار دیا تھا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی تھی کہ مردوں اور عورتوں کی شادیاں دیر سے کی جائیں' تاکہ بچے کم پیدا ہوں۔ اسی نظریہ سے متاثر ہو کر ہمارے پڑھے لکھے گھرانوں میں پچیس پچیس' تیس تیس سال تک شادی نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس سے معاشرہ میں کافی خرابیاں پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ بایں ہمہ یہ لوگ بلوغت کی عمر کے بعد بھی دس بارہ سال شادی نہ ہونے پر اس لیے خاموش رہتے ہیں کہ یہ تاخیر ان کے نظریہ "چھوٹا کنبہ خوشحال گھرانہ" کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔ اور اسی لیے یہ بچپن کی شادی کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ اور سہارا قرآن کا لیتے ہیں۔ ورنہ اگر یہ لوگ قرآن مجید سے مخلص ہوتے تو پھر جو لوگ بلوغت کے بعد بھی تادیر شادی نہیں کرتے' ان کے خلاف بھی ضرور آواز اٹھاتے' کہ قرآن مجید صاف ستھرے اور پاکیزہ معاشرے کے قیام کا حکم تو دیتا ہے' "چھوٹا کنبہ خوشحال گھرانہ" کا پرچار نہیں کرتا۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ⑪ تعدّد ازدواج

اس مسئلہ کو پرویز صاحب نے قرآنی فیصلے ص۱۴۷ اور طاہرہ کے نام خطوط ص۳۱۳ پر چھیڑا ہے۔ ہم "طاہرہ کے نام خطوط" والی عبارت کو اس بحث کی بنیاد بناتے ہیں کیونکہ اس میں نسبتاً الجھاؤ کم ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

**عام حالات میں ایک بیوی کی اجازت:** "قرآن عام حالات میں صرف ایک بیوی کی اجازت دیتا ہے' اگر بیوی سے نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو مرد طلاق کے بعد دوسری شادی کر سکتا ہے۔ اس کی موجودگی میں نہیں۔ سورہ نساء میں ہے:

﴿وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَءَاتَيْتُمْ إِحْدَىٰهُنَّ﴾ (النساء٤/ ٢٠) "اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو تو پہلی بیوی کا مہر پورا پورا ادا کر دو اور پھر اس کی جگہ دوسری لاؤ۔"

"اس سے بالکل واضح ہے کہ ایک بیوی کی جگہ ہی دوسری بیوی آسکتی ہے۔ اس کی موجودگی میں نہیں۔" (طاہرہ کے نام خطوط ص۳۱۸)

اب دیکھئے اس مندرجہ آیت میں جناب پرویز صاحب اِحْدٰهُنَّ کا ترجمہ گول کر گئے ہیں۔ هُنَّ [1] ضمیر جمع مونث ہے۔ جو تین یا تین سے زیادہ عورتوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اور مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ یوں بنتا ہے کہ جو تمہارے پاس تین یا تین سے زائد بیویاں زائد ہیں ان میں سے اگر تم کسی ایک کو بدلنا چاہو تو اس کو اس کا حق مہر ادا کر چکے ہو۔ اگرچہ وہ ایک خزانہ ہو۔ اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔" گویا جس آیت سے پرویز صاحب صرف ایک بیوی کے جواز کا استدلال فرما رہے ہیں۔ وہی آیت تین یا تین سے زائد بیویوں کے جواز پر نص قطعی ہے۔ اور زائد کی حد قرآن نے دوسرے مقام پر چار تک مقرر کر دی ہے۔

اس بات کا خدشہ جناب پرویز صاحب کو بھی لاحق ہوا چنانچہ قرآنی فیصلے ص۱۴۷ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:

---

[1] واضح رہے کہ پرویز صاحب قرآنی فیصلے میں بھی یہ آیت درج کرنے کے بعد اِحْدٰهُنَّ میں هُنَّ کا ترجمہ چھوڑ گئے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



"اس آیت کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس میں صرف ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنے کا ذکر ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کی چار بیویاں ہوں اور وہ ان کی جگہ بدل بدل کر نئی عورتوں سے شادی کرنا چاہے تو اسکے متعلق حکم ہے کہ ایک کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری عورت لے آؤ۔ لیکن جب اس آیت کو فَوَاحِدَةً والی آیت کی روشنی میں پڑھا جائے تو اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ عام حالات میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت نہیں۔ (قرآنی فیصلے ص ۱۴۸)

اب دیکھئے فَوَاحِدَةً والی آیت کو آپ نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اور مقدم و موخر کر کے ص ۱۴۷ پر درج فرمایا ہے۔ ہم اس پوری آیت کو درج کر دیتے ہیں تاکہ کم از کم فواحدۃً والی رمز کا فیصلہ ہو جائے۔ آیت اس طرح ہے:

﴿ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ﴿٣﴾ ﴾ (النساء ۴/ ۳)

"اور اگر تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں سے جنہیں تم پسند کرو۔ دو دو' تین تین' چار چار تک عورتوں سے نکاح کر لو۔ اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ ان میں انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی کافی ہے یا لونڈیاں' اس طرح توقع ہے کہ تم بے انصافی (یا عیالداری) سے بچ جاؤ گے۔"

اب دیکھئے اس آیت میں دو' دو' تین تین' چار چار کی اجازت تو عام ہے اور ایک کی اجازت مشروط ہے بے انصافی سے۔ اب اگر اِحدٰھُنَّ کو اس آیت کے ساتھ ملا کر ہی پڑھنا ہے تو فَوَاحِدَةً کے بجائے ثلثَ وربع کے ساتھ ملا کر کیوں نہ پڑھا جائے؟ کیونکہ ھُنَّ کو ثلث اور ربع سے ہی ملانا مناسب ہے۔

جناب پرویز صاحب نے بھی مندرجہ پوری آیت طاہرہ کے نام خطوط ص ۳۱۵ پر درج فرمائی لیکن ترجمہ کے بجائے اس کی تشریح یا مفہوم بتایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"اس آیت کے چار ٹکڑے ہیں۔ پہلا ٹکڑا ﴿ وَاِنْ خِفتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی ﴾ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں۔ جن میں تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچوں اور بے شوہر کی عورتوں کا منصفانہ حل نہیں کر سکو گے۔ مطلب صاف ہے کہ اگر کسی ہنگامی حالت۔ مثلاً جنگ کے بعد جب جوان مرد بڑی تعداد میں ضائع ہو چکے ہوں۔ ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور لاوارث جوان عورتیں غیر شوہروں کے رہ جائیں۔ اس کا کیا علاج کیا جائے؟ اس ہنگامی صورت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس کی اجازت دی جاتی ہے کہ تعدد ازدواج یعنی ایک بیوی کے قانون میں عارضی طور پر لچک پیدا کر لی جائے۔" (طاہرہ کے نام خطوط ص ۳۱۵)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**ہنگامی حالات کی قید کہاں سے آئی؟ :** اب دیکھئے اس چھوٹے سے قرآنی فقرے کی اتنی لمبی چوڑی تشریح جو آپ نے فرمائی ہے۔ اس میں تمام خط کشیدہ عبارت آپ کے ذہن کی پیداوار ہے۔ یہ ہنگامی حالات کی شرط کہاں سے ٹپک پڑی۔ پھر ہنگامی حالات کا صاف مطلب جنگ کے بعد کا زمانہ ہے۔ اب دیکھئے اس ہنگامی حالات اور جنگ سے مراد زیادہ سے زیادہ جنگ احد ہی لی جا سکتی ہے۔ جس میں صرف ۷۰ مسلمان شہید ہوئے تھے۔ اس جنگ میں۔

(الف) سات سو مسلمان شریک جنگ تھے۔

(ب) تین سو منافقین کو عبداللہ بن ابی واپس لے آیا تھا۔ تاہم ان کا شمار مسلمانوں میں ہوتا تھا۔ اور ان سے نکاح پر پابندی نہ تھی۔

(ج) یہ ایک ہزار کی تعداد وہ ہے جو جنگ کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ ورنہ مسلمان نوجوانوں کی تعداد بہرحال اس سے زیادہ تھی۔

اب اگر اس دور میں مسلمانوں کی جملہ تعداد ڈیڑھ ہزار بھی فرض کر لی جائے پھر ان میں سے ستر صحابہ شہید ہو جائیں تو اس سے اتنے زبردست ہنگامی حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ مسلمانوں کو چار چار بیویوں تک سے نکاح کرنے کی ضرورت پیش آجائے اور بارگاہ خداوندی سے اس کی اجازت بھی دی جائے؟

**عام قانون :** پرویز صاحب بار بار یہ فقرہ دہراتے چلے جاتے ہیں کہ "عام قانون یہی ہے کہ صرف ایک بیوی کی اجازت ہے" حالانکہ قرآن اسے مشروط قانون بتاتا ہے۔ کہ اگر تم کو ان میں بے انصافی کا اندیشہ ہو تو پھر ایک کافی ہے۔ ورنہ عام قانون دو دو' تین تین' چار چار کا ہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قبل از اسلام عربوں میں دستور یہ تھا کہ وہ دس دس تک بیویوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ ہمیں احادیث اور تاریخ میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ جب ایسے لوگ اسلام لاتے تو رسول اللہ ﷺ ان کو چار بیویاں رکھ لینے کی اجازت فرماتے۔ اور باقی کو طلاق دینے کا حکم فرماتے۔ اور اس وقت کسی قسم کے ہنگامی حالات بھی نہ ہوتے تھے۔ قابل غور بات تو یہ ہے کہ تعدد ازدواج معاشرہ کا ایسا بنیادی مسئلہ ہے کہ اگر "اسلام کا عام قانون ایک بیوی سے نکاح کا" ہی ہوتا۔ تو اس تعدد ازدواج کے عام رواج کو ختم کرنے کے لیے غیر مشروط نص قطعی کی ضرورت تھی۔ لیکن قرآن میں ہمیں کوئی ایسی آیت نہیں ملتی۔ اس کے بجائے رسول اللہ کی بیویوں کا ذکر کئی مقامات پر ملتا ہے۔ اگر یہ "ایک بیوی والا عام قانون" اتنا ہی اہم تھا۔ تو قرآنی آیت نہ سہی۔ رسول اللہ کو تو کم از کم ایک بیوی رکھ کر باقی سب کو فارغ کر دینا چاہیئے تھا۔ کیونکہ منشاء الٰہی کو سب سے زیادہ سمجھنے والے اور جاننے والے تھے۔ پھر آپ تمام امت کے لیے اسوہ حسنہ بھی تھے۔

(ii) پھر پرویز صاحب اس آیت کے دوسرے ٹکڑے ﴿ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ﴾ کے معنی بیان فرماتے ہیں کہ "ان میں سے ان عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کر لو۔ اس طرح انہیں (اور بیواؤں کی صورت میں ان کے ساتھ ان کے بچوں کو بھی) خاندان کے اندر جذب کر لو

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



یہی ان سے منصفانہ سلوک ہے۔ یہ مسئلہ اگر دو دو بیویاں کرنے سے حل ہو جائے تو دو دو کرلو۔ تین تین سے ہو تو تین تین اور چار چار سے ہو تو چار چار'..... یہ تو رہا اجتماعی فیصلہ۔" (طاہرہ کے نام خطوط ص۳۱۶)

اب پرویز صاحب کا خیال ہے۔ کہ قرآن کی رو سے عام قاعدہ صرف ایک بیوی سے نکاح کا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ستر مسلمانوں کے شہید ہونے سے ستر عورتیں بیوہ ہو گئی ہوں گی اب ان میں ان کی یتیم اولاد یعنی جوان عورتیں ملا کر اس تعداد کو چار گنا کر دیجیے۔ یعنی تقریباً ۳۰۰ عورتوں کا مسئلہ تھا۔ اور چونکہ یہ فیصلہ اجتماعی تھا۔ لہٰذا مسلمانوں میں سے صرف ۳۰۰ آدمیوں کو مزید ایک بیوی کر لینے پر مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ اور یہ کام ہو بھی حکومتی سطح پر رہا تھا۔ پھر تین تین اور چار چار عورتوں کے کیا معنی؟

اور یہ اجتماعی فیصلہ والی بات اس لحاظ سے بھی قابل غور ہے کہ آیت کے الفاظ میں مَا طَابَ لَكُمْ یعنی مسلمان انفرادی طور پر جس جس عورت کو پسند کریں۔ اس سے نکاح کرلیں اور آپ اسے اجتماعی فیصلہ قرار دے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کا یہ مطلب ہو کہ پسند تو مسلمان انفرادی طور پر کرلیں مگر نکاح کے لیے پرویز صاحب کی "قرآنی بصیرت" کی طرف رجوع فرمانا ضروری ہو۔

**کیا یتیموں کی کثرت شرط لازم ہے؟:** پرویز صاحب دوسری' تیسری' یا چوتھی بیوی کے لیے یتیموں کی کثرت کو شرط لازم قرار دیتے ہیں۔ پھر یتیموں کی کثرت کی وجہ ہنگامی حالات اور ہنگامی حالات کی وجہ جنگ قرار دیتے ہیں۔ یہ وجوہ تو خیر ان کی اپنی خود ساختہ ہیں۔ قرآن نے یتیموں کی کثرت کی شرط بھی عائد نہیں کی۔ بلکہ ان میں انصاف نہ کرنے کے خوف کی شرط عائد کی ہے۔ اور ہمارے خیال میں یہ شرط بھی لازم نہیں۔ بلکہ شرط غیر لازم ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے قرآن میں ہے۔

﴿ وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ (النور ۲۴/ ۳۳) "اگر تمہاری لونڈیاں پاکدامن رہنا چاہیں تو تم انہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو۔"

اب دیکھئے اس آیت قرآنی میں بھی پاک دامن رہنے کی شرط عائد کی گئی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ پاکدامن نہ رہنا چاہیں تو تم کو انہیں بدکاری پر مجبور کرنے کی اجازت ہے۔ تو جس طرح اس آیت میں تَحَصُّنًا کی شرط غیر لازم ہے اسی طرح یتیموں اور انصاف کی شرط کی فضیلت ضرور ہے۔ مگر بطور شرط یہ شرط غیر لازم ہے۔ اسی طرح کی انصاف کی شرط اللہ تعالیٰ نے دو' تین' چار عورتوں کے بارے میں بھی لگائی پھر اس میں خود تخفیف بھی فرما دی اور فرمایا کہ "اگر تم چاہو بھی کہ ان بیویوں کے درمیان انصاف کرو تو نہ کر سکو گے۔ البتہ اتنا ضرور کرو کہ کسی ایک کی طرف ہی پوری طرح نہ جھک جاؤ۔ اور دوسری کو لٹکا ہوا چھوڑ دو۔" (۱۲۹:۴) پس اللہ کا یتیموں کے بارے میں یا بیویوں کے بارے میں انصاف کا جس قدر مطالبہ ہے وہ اس نے خود واضح فرما دیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی انسان کی نیت میں کھوٹ نہ ہو اور وہ اللہ سے ڈرتا بھی ہو تو اس کو ایک سے زیادہ نکاح کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



سوالنامہ : پرویز صاحب کی یہی قرآنی بصیرت جب طلوع اسلام اگست سن ۴۹ء میں شائع ہوئی تو ایک صاحب نے بڑے ٹیڑھے میڑھے چند سوال پرویز صاحب کو لکھ کر بھیج دیئے۔ یہ سوال بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ لہٰذا وہ سوال نامہ ہم بعینہ یہاں درج کر رہے ہیں۔

① قرآن کریم میں یہ اصول کہ "مرد کو صرف ایک بیوی کی اجازت ہے" کہیں بھی مذکور نہیں۔ اسلام سے پہلے عرب میں تعدد ازدواج کا عام رواج تھا۔ مگر اس کے برخلاف حکم نہیں دیا گیا تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اسلام اس رواج کو توڑنا نہیں چاہتا تھا؟ تعدد ازدواج معاشرت کا بنیادی مسئلہ ہے اور یہ بات حیران کن ہے کہ کتاب مقدس اس بنیادی مسئلہ کے متعلق خاموشی اختیار کرے۔ یا کم از کم کوئی قطعی حکم نہ دے۔ جب کہ معاشرت کے معمولی مسائل پر ناطق احکام موجود ہیں۔

② رسول اکرم ﷺ کی ازدواج ایک تاریخی امر ہے۔ کیا عائشہ رضی اللہ عنہا کے بعد تمام ازدواج مطہرات کے نکاح اس وقتی ضرورت (یعنی جنگ کی وجہ سے یتیموں کی کثرت کا حل) کو مدنظر رکھ کر کیے گئے تھے؟ جس کا ذکر سورہ نساء آیت نمبر ۳ میں ہے۔ اگر نہیں تو اسوہ رسول کی پیروی امتِ مسلمہ کیوں نہ کرے؟

③ کیا تمام صحابہ کے تعدد ازدواج میں یہی شرط مضمر تھی؟ اور کیا یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے؟

④ رسول اکرم ﷺ کے نواسہ امام حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک دفعہ پڑھا تھا کہ ان کی بیویوں کی تعداد سینکڑوں [1] تک جا پہنچی بلکہ ان کی کنیت "بہت طلاق دینے والا" مشہور تھی۔ اگر یہ درست ہے تو ان کے طرز عمل کی بنیاد کس پر تھی؟

⑤ اگر واقعی رسول اکرم ﷺ صحابہ اور رسول کے نزدیک ترین قرابت داروں کا طرزِ عمل تعدد ازدواج کے حق میں ہے تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ سورہ نساء کی آیت صرف یتیم لڑکیوں کے حق میں نہیں ہے؟ اور اسلام میں تعدد ازدواج جائز ہے اور ایسی تعداد کی کوئی حد [2] (Limit) بھی مقرر نہیں۔

⑥ ہنگامی حالات مثلاً جنگ وغیرہ جن میں یتیم لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ ان میں بیواؤں' باپ والی لڑکیوں اور غیر شادی شدہ عورتوں کی تعداد بھی ایزادی ہوگی۔ اس استثناء کو صرف یتیموں تک ہی محدود کیوں رکھا گیا اور باقی اقسام کے متعلق کیا حکم ہوگا۔ وغیرہ' (قرآنی فیصلے ص۱۴۵-۱۴۶)

---

[1] یہ "سینکڑوں تک" والی بات بھی مبالغہ ہے۔ بعض تاریخوں میں ۹۰ تک کی تعداد مذکور ہے اور اس میں خود حضرت حسن کا اتنا دخل نہیں جتنا عورتوں کا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ آپ کی شکل بہت حد تک رسول اللہ سے ملتی جلتی تھی۔ پھر آپ نواسے بھی تھے۔ تو عورتیں انہی وجوہات کی بناء پر اپنا نفس آپ پر خود پیش کرتی تھیں۔ ادھر چونکہ استبدال زوج پر سوائے طلاق کے جسے اس معاشرہ میں اتنا معیوب بھی نہ سمجھا جاتا تھا۔ کوئی پابندی نہ تھی۔ لہٰذا ممکن ہے یہ درست ہو اور یہ معاملہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اعلان کرنا پڑا کہ لوگو! حسن پر کوئی عورت اپنے نفس کو ہبہ نہ کرے۔

[2] حد تو چار تک اللہ نے مقرر کر دی ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**جواب میں روایات پر برہمی:** اب ان سوالات کے جواب میں پہلے تو پرویز صاحب نے اپنی اسی "قرآنی بصیرت" کو دہرایا ہے جس کا جواب ہم عرض کر چکے ہیں۔ باقی تمام تر سوالات جن کا تعلق رسول اللہ کی سیرت اور صحابہ کے کردار سے متعلق تھا۔ ان کے لیے آپ کے پاس ایک گھڑا گھڑایا جواب پہلے ہی موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تاریخ (یعنی ذخیرہ حدیث) ظنی ہے جس طرح مسلمانوں کا ایک فرقہ جب دلائل کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ تو مخاطب کو "وہابی" کہہ کر گلو خلاصی کرا لیتا ہے۔ یہی حال محترم پرویز صاحب کا ہے جب یہ دیکھتے ہیں۔ احادیث' تفاسیر' تاریخ' تعامل امت سب کچھ ہی آپ کی قرآنی بصیرت کے خلاف ہے۔ تو جھٹ "تاریخ ظنی ہے اور ظن دین نہیں بن سکتا" کا نعرہ لگا دیتے ہیں۔ پھر کچھ چند غیر متعلق سے واقعات احادیث سے درج کر کے دل کی بھڑاس نکالتے اور قاری کے ذہن کو الجھا کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بس اب سائل کی سب باتوں کا جواب آگیا۔ یہ انہیں بھولے سے بھی خیال نہیں آتا۔ اگر تاریخ' حدیث' تفاسیر' تعامل امت سب کچھ ہی ظنی ہے تو آپ کی "قرآنی بصیرت" کا ظنی ہونا کیسے ناممکن ہے؟

آپ کے ۱۴ صفحات پر مشتمل جواب کے جس حصہ میں کچھ سنجیدگی سے جواب دیا گیا ہے وہ یہ ہے۔

"نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبار کی ایک سے زائد بیویاں یا تو اس حکم سے پہلے موجود ہوں گی اور یا پھر لامحالہ اسی شرط سے مشروط' سورہ نساء کی آیت زیر بحث کے متعلق عام طور پر یہی کہا جاتا ہے۔ کہ اس کا زمانہ نزول یا فتح مکہ کے قریب کا ہے یا سن ۵ ھ چونکہ اس حکم میں تعدد ازدواج کی حد بندی کی گئی ہے اور حضور ﷺ کا آخری نکاح حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ فتح خیبر کے وقت سن ۷ ھ میں ہوا تھا۔ اس لیے اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس حکم کا زمانہ نزول فتح مکہ کے بعد کا ہے۔ اگر تاریخ کی روایات اس کے خلاف ہیں تو ان روایات کو قرآن سے تطبیق دینا ہوگی اور اگر ان میں تطبیق کی صورت نہ ہوگی تو انہیں غلط تصور کرنا ہوگا۔ قرآن کے ایسے کھلے حکم کی موجودگی میں تاریخ کی ان روایات سے (کہ رسول اللہ یا صحابہ کبار کی متعدد بیویاں تھیں) یہ دلیل لانا کہ تعدد ازدواج غیر مشروط جائز ہے۔ قرآن کو تاریخ کے تابع کرنا ہے۔ حالانکہ اصولاً تاریخ (ظن) کو قرآن (یقین) کے تابع رہنا چاہیئے۔" (قرآنی فیصلے ص ۱۵۵)

اب دیکھئے کہ:

① تعدد ازدواج کے سلسلہ میں پرویز صاحب کی بیان کردہ حدود وقیود اور شرائط صرف اور صرف جنگ احد کے فوراً بعد ہی پائی جاتی ہیں۔ اور کسی جنگ میں مسلمانوں کا نہ اتنا جانی نقصان ہوا نہ ہی یتیموں کی تعداد میں کثرت واقع ہوئی۔

② جنگ احد سن ۳ ھ میں ہوئی تھی لہٰذا اس زیر بحث آیت کا زمانہ نزول سن ۳ ھ ہے۔

③ تنزیل کے لحاظ سے اس سورہ کا نمبر ۹۲ ہے۔ یعنی مدنی صورتوں میں سے چھٹی سورت اس لحاظ سے بھی آیت مذکورہ کا زمانہ نزول سن ۳ ھ میں ہی بنتا ہے۔

④ پرویز صاحب کا یہ بیان کہ "عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس کا زمانہ نزول فتح مکہ کے قریب کا ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



"قطعاً غلط اور سفید جھوٹ ہے۔ کسی نے بھی ایسا نہیں کہا۔ اور جو کچھ کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سورہ کا کچھ حصہ سن ۳ ھ میں کچھ سن ۴ ھ میں اور کچھ ۵ ھ میں نازل ہوا تھا۔ تاہم آیت زیر بحث یقینی طور پر سن ۳ ھ میں نازل ہوئی۔ یعنی جنگ احد کے فوراً بعد۔ اس کا زمانہ نزول اگرچہ یہی ہے۔ تاہم اس کا حکم عام ہے۔ وہ جنگ یا ہنگامی حالت یا یتیموں کی کثرت سے وابستہ نہیں۔

⑤ رسول اکرم ﷺ کا آخری نکاح حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نہیں بلکہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح جمادی الاخر سن ۷ ھ میں ہوا۔ اور حضرت میمونہ سے ذیقعدہ سن ۷ ھ میں۔ اس آخری نکاح کے وقت حضرت میمونہ سمیت رسول اللہ ﷺ کے گھر میں بیک وقت نو بیویاں موجود تھیں۔ اور یہ چار بیویوں سے زائد کی اجازت آپ کے لیے (بموجب سورہ احزاب آیت نمبر ۵۰) خاص تھی۔ اور یہ سورہ احزاب اواخر سن ۶ ھ میں نازل ہوئی۔

اب دیکھئے یہ تمام تصریحات "عام قانون ایک بیوی" کے بجائے تعدد ازدواج کا جواز مہیا کرتی ہیں۔ اب پرویز صاحب سے یہ تو ہو نہ سکا کہ مستشرقین کے اعتراضات کا کوئی مسکت جواب دے سکیں الٹا روایات پر برس پڑے اور فرمایا تاریخ اور روایات کو قرآن کے تابع کرنا چاہیئے۔ حالانکہ یہ سب کچھ قرآن کے تابع تو ہے' البتہ آپ کی "قرآنی بصیرت" کے تابع نہیں ہے۔ آپ قرآن اور تاریخ وروایات کی جیسی تطبیق چاہتے ہیں۔ وہ یونہی ہو سکتی ہے کہ ہم یہ تسلیم کر لیں کہ جنگ احد سن ۳ ھ کے بجائے سن ۸ ھ میں ہوئی تھی۔

پرویز صاحب کی یہ "قرآنی بصیرت" دراصل اس مغربی تخیل کی پیداوار ہے جس میں ایک سے زائد بیویوں سے نکاح کو مذموم فعل سمجھا جاتا ہے۔ بات بالکل صاف تھی کہ اسلام نے حکم تو ایک بیوی سے نکاح کا دیا ہے۔ البتہ اجازت چار بیویوں تک ہے۔ تعدد ازدواج کی اجازت ہے حکم نہیں۔ کہ ہر کوئی تعدد ازدواج پر عمل کرنا شروع کر دے۔ قرآن ہر ایک کے لیے اور ہر زمان ومکان کے لیے تا قیامت دستور حیات ہے۔ لہٰذا کسی بھی ملک اور دور کے لوگ اپنے اپنے رسم ورواج یا ضرورت کے مطابق اس رخصت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ملک پاکستان میں آج کل عورت کی الگ ملکیت کا تصور نہیں۔ مرد اگر گھر والا ہے تو عورت گھر والی ہے۔ اس ملک میں اگر کوئی دو بیویاں بھی کرے تو بے شمار پریشان کن مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہاں کی ۹۵ فیصد آبادی ایسی ہے جو صرف ایک بیوی کو درست سمجھتی ہے اور ایک ہی نکاح پر قناعت کرتی ہے یہ الزام کوئی شخص نہیں دے سکتا کہ ۹۵ فی صد مسلمانوں نے تعدد ازدواج کی اجازت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔ اور باقی ۵ فی صد ایسے ہیں جن کے ہاں دو دو یا تین تین بیویاں ہیں جو انہوں نے اپنی اپنی ضروریات یا حالات کے تحت کی ہیں۔ تو ان کو بھی مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

اس کے برعکس عرب میں آج بھی عورت کی الگ ملکیت کا تصور موجود ہے۔ لہٰذا وہاں دو' تین بلکہ چار

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



بیویاں کرنے پر بھی بیویوں کی باہمی رقابت کے مسائل بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہاں کی آدھی آبادی اس اجازت سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں تعدد ازدواج معاشرہ کی نگاہوں میں بھی مذموم نہیں ہے۔ لہٰذا اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو یہ شرعی نقطہ نگاہ سے بالکل درست ہے۔

ایک سے زیادہ بیویوں کو مذموم فعل سمجھنے کے اس مغربی تخیل کی بنیادیں دو ہیں:

① فحاشی' بدکاری اور داشتائیں رکھنے کی عام اجازت اور جنسی آوارگی' جسے مذموم کی بجائے مستحسن فعل سمجھا جاتا ہے۔

② مادیت پرستی' معیار زندگی کی بلندی اور اولاد کی تعلیم وتربیت اور بڑھتے ہوئے اخراجات کی ذمہ داریاں پورا کرنے سے فرار۔ لہٰذا ایسا معاشرہ تو ایک بیوی بھی بمشکل ہی برداشت کرتا ہے۔ بلکہ بہتر یہی سمجھتا ہے کہ بیوی ایک بھی نہ ہو.....

اور سفاح ہی سے کام چلتا رہے۔ لیکن اسلام سب سے زیادہ زور ہی مرد وعورت کی عفت پر دیتا ہے۔ اور ہر طرح کی فحاشی کو مذموم فعل قرار دیتا ہے۔ اسی لیے اس نے اقتضآت وحالات زمانہ کے مطابق چار بیویوں تک کی اجازت دی ہے۔ اب بتایئے کہ اس مغربی تخیل اور اسلامی تخیل میں مطابقت کی کوئی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔ جس کے پیچھے جناب محترم پرویز صاحب پڑے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے مغرب سے مستعار لیے ہوئے ذہن کو قرآنی بصیرت کی آڑ میں مسلمانوں پر مسلط کر دیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ⑫ غلام اور لونڈیاں

لونڈیوں کا مسئلہ بھی دراصل تعدد ازدواج کا تتمہ ہے۔ چنانچہ وہی سورہ نساء کی آیت نمبر ۳ جو تعدد ازدواج کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ لونڈیوں کی اباحت پر بھی دلالت کرتی ہے۔ اس آیت کا آخری حصہ یوں ہے۔

﴿ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ﴾ (النساء ٤/ ٣)

"اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان بیویوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی کافی ہے یا جو تمہاری لونڈیاں ہیں۔"

یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے کہ اسلام سے پیشتر عرب کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی غلام اور لونڈیوں کی عام تجارت ہوتی تھی اور اسلام نے اسے بتدریج کم کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں۔ اور احادیث میں آزاد آدمی کو غلام بنانے اور اس کی خرید وفروخت پر سخت وعید بیان کی گئی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ "جو شخص کسی آزاد آدمی کو غلام بنائے اس کے [1] خلاف قیامت کو میں خود استغاثہ کروں گا" مگر جہاں تک جنگی قیدیوں کے غلام یا لونڈی بنانے کا تعلق ہے۔ اس کے جرم یا حرام ہونے کے متعلق ہمیں کوئی نص قطعی نہیں مل سکی۔ بلکہ اس کی تائید میں کئی آیات مل جاتی ہیں۔ اب جناب پرویز صاحب جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے سے متعلق سورہ محمد ﷺ کی درج ذیل آیت پیش فرمایا کرتے ہیں:

﴿ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً ﴾ (محمد ٤٧/ ٤)

"ان پر غلبہ حاصل ہونے کے بعد) انہیں یا تو بطور احسان چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔" (قرآنی فیصلے ص ۸۴)

منًّا اور فداءً کی مختلف صورتیں: اب دیکھئے منًّا کے معنی احسان کرنا ہے نہ کہ "بطور احسان چھوڑ دینا" اگرچہ احسان کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ بطور احسان چھوڑ دیا جائے۔ لیکن قرآن کے لفظ منًا کو اسی معنی میں محدود کر دینا آخر کیوں کر درست سمجھا جا سکتا ہے؟

---

[1] بخاری بحوالہ مشکوۃ کتاب البیوع۔ باب الاجارۃ، فصل اول۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اب ہم بتائیں گے کہ منًا اور فداءً کی کیا کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔ جن پر رسول اللہ نے عمل کر کے دکھایا۔

## مَنّ کی تین صورتیں:

① قید کی حالت میں ان سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ﴿٨﴾ ﴾ (الإنسان ٧٦/ ٨)

اور باوجودیکہ خود انہیں کھانے کی خواہش اور حاجت ہوتی ہے۔ وہ مسکینوں یتیموں اور جنگی قیدیوں [1] کو کھانا کھلاتے ہیں۔

قید کی بھی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ حکومت کا قیدی ہو۔ دوسرے یہ کہ حکومت نے ان قیدیوں کو افراد میں تقسیم کر دیا ہو۔ دونوں صورتوں میں ان سے بہتر اور فیاضانہ سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ حکومت کی قید کی مثال یہ ہے کہ یمامہ کے سردار اثامہ بن اثال گرفتار ہو کر آئے۔ تو آپ نے اسے مسجد نبوی میں نظر بند رکھا۔ آپ کے حکم سے اسے عمدہ کھانا اور دودھ مہیا کیا جاتا رہا۔ تین دن کے بعد آپ نے اسے رہا کر دیا۔ تو وہ آپ کے حسن سلوک ہی کی بنا پر ایمان لے آیا۔ اور انفرادی قید کی مثال یہ ہے کہ جنگ بدر کے قیدیوں کو رسول اللہ ﷺ نے مختلف صحابہ کے گھروں میں بانٹ دیا اور ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ اسْتَوْصوا بِالْأُسَارٰی خیرًا یعنی ان قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ انہی قیدیوں میں سے ایک قیدی ابو عزیز کا بیان ہے کہ مجھے جس انصاری کے گھر میں رکھا گیا تھا وہ خود تو کھجوریں کھاتے تھے لیکن مجھے صبح شام روٹی کھلاتے تھے۔

اسلام نے جو حسن سلوک کی تاکید کی تھی اسی کا یہ اثر تھا کہ نام کے علاوہ غلام اور آزاد میں کچھ فرق نہ رہ گیا۔ غلاموں کا فقیہ اور محدث ہونا تاریخ سے ثابت ہے۔ زید بن حارثہ کو آپ نے متبنیٰ بنایا پھر اپنی پھوپھی زاد بہن سے ان کا نکاح کر دیا۔ زید بن حارثہ اور ان کے بیٹے اسامہ بن زید دونوں کو سپہ سالار لشکر بنایا جن کے تحت صحابہ کبار جنگ میں شریک ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت بلال رضی اللہ عنہ، کو جو حبشی غلام تھے۔ سیدنا بلال کہہ کر پکارتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلیفہ نامزد کر دیتا اور رسول اللہ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "اگر تم پر نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے تو جب تک وہ تمہیں اللہ کے احکام کے مطابق چلاتا ہے۔ اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔" (مسلم کتاب الامارۃ)

---

[1] اسیر (جمع - اساریٰ) کا لفظ جنگی قیدی کے لیے آتا ہے۔ دوسرے قیدیوں کو جنہیں عدالت کسی جرم کی پاداش میں قید کی سزا دیتی ہے۔ جب تک حوالات میں ہوں تو محبوس اور اگر جیل خانہ میں ہوں تو مسجون کہتے ہیں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



چنانچہ تاریخ میں ایسے بے شمار مسلمان بادشاہ گزرے ہیں جو غلام تھے۔ محمود غزنوی مشہور فاتح بھی آزاد کردہ غلام تھا۔ ہندوستان اور مصر میں غلاموں کے خاندان نے صدیوں تک حکومت کی۔ اب کونسا وہ اعزاز باقی رہ جاتا ہے۔ جو آزاد کے ساتھ مخصوص ہو اور غلام اس سے بے بہرہ ہو۔

② جزیہ کی شرط پر انہیں ذِمی بنالیا جائے: فتح خیبر سن ۷ھ) کے بعد اہل خیبر کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔ دور فاروقی میں سواد عراق کے معاملہ میں اکثر اسی صورت پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اس طریقہ پر بالعموم ایسی صورت میں عمل کیا گیا ہے۔ جب کہ قیدی اسی علاقہ کے باشندے ہوں جو مفتوح ہو کر سلطنت اسلامی میں شامل ہو چکا ہو۔

③ انہیں بلا معاوضہ محض ازراہِ احسان رہا کر دیا جائے یہ صورت رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد اختیار فرمائی۔ بلکہ آپ نے اپنے کسی جانی دشمن کو بھی قیدی بنانے کا حکم نہیں دیا اور پہلے ہی اعلان فرما دیا:

«إِذْهَبُوْا أَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ» "جاؤ تم سب آزاد ہو۔" (تاریخ طبری ج ا باب فتح مکہ)

اور جن قیدیوں کو قید کرنے کے بعد ازراہ احسان چھوڑا گیا ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

| | | |
|---|---|---|
| 1 سریہ نخلہ | رجب ۲ھ | 2 قیدی |
| 2 غزوہ بنو مصطلق | شعبان ۵ھ | 19 قیدی |
| 3 سریہ جموم | ربیع الاخر ۶ھ | 10 قیدی |
| 4 سریہ عیص | صفر ۷ھ | 9 قیدی |
| 5 سریہ حسمی | جمادی الاول ۴ھ | 100 قیدی |
| 6 غزوہ حنین | شوال ۸ھ | 6,000 قیدی |
| 7 سریہ عینیہ | محرم ۹ھ | 63 قیدی |
| 8 سریہ بنو طے | ۹ھ دخترِ حاتم سفانہ اور اسکی پوری قوم | (تعداد معلوم نہیں) |
| | کل میزان | 6203 قیدی |

آزاد کرنے کے علاوہ قیدیوں کو کپڑے بھی عطا فرمائے۔ آپ نے دخترِ حاتم کو باکرام رخصت فرمایا اور اس کی وجہ سے ساری قوم کو چھوڑ دیا۔

## فدیہ کی تین صورتیں:

① مالی معاوضہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے: یہ صورت جنگِ بدر رمضان سن ۲ ھ کے بعد اختیار کی گئی۔ ہر قیدی کے عوض اس کی حیثیت کے مطابق ایک ہزار درہم سے چار ہزار درہم تک رقم معاوضہ مقرر کی گئی۔ چونکہ اس طرح مالی فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



عتاب نازل ہوا تھا۔ (کیونکہ اللہ تعالیٰ کی منشا یہ تھی کہ انہیں تہ تیغ کر دیا جائے) لہٰذا مسلمانوں نے اس طریقہ کو اچھا نہیں سمجھا۔ اگرچہ اس کا بھی جواز موجود ہے۔

② کوئی خاص خدمت لے کر چھوڑا جائے: اس صورت کا اطلاق بھی جنگ بدر کے بعد ہوا جو قیدی رقم ادا نہ کر سکتے تھے اور پڑھے لکھے بھی تھے۔ ان کے ذمہ یہ خدمت لگائی گئی کہ ان میں سے ہر ایک دس دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے تو وہ آزاد ہو جائیں گے۔

③ جنگی قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جائے: دور نبوی میں قیدیوں کا تبادلہ کسی بڑی تعداد میں نہیں ہوا۔ تاہم اس کی بھی مثالیں موجود ہیں۔ مسلم' ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے کہ رسول اکرم نے دو مسلمانوں کے بدلہ میں ایک دفعہ مشرکین کے ایک آدمی کو رہا کر دیا۔ ایک اور موقع پر آپ نے ایک گرفتار شدہ لڑکی اہل مکہ کو دے کر دو مسلمان رہا کرائے۔

**مجاہدین میں قیدیوں کی تقسیم:** غزوہ بنو قریظہ ذی الحجہ ۵ ہجری میں یہودی قیدیوں میں سے بعض کو قتل اور بعض کو قیدی بنایا گیا۔ اور ان کو مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان اسیران جنگ یہودیوں کے لیے قتل کی سزا۔ یہ سزا دراصل محض اسیران جنگ کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ان کے جرائم اور بھی تھے۔ مثلاً مسلسل عہد شکنی' غداری اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں بھی کرتے رہتے تھے۔ یہود نے جنگی قیدیوں کے فیصلہ کے لیے قبیلہ اوس (جو یہود کے حلیف تھے) کے سردار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو بطور ثالث منتخب کر لیا۔ جو رسول اکرم ﷺ نے بھی تسلیم کر لیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ:

(i) جو لوگ لڑنے کے قابل ہیں۔ قتل کر دیئے جائیں۔

(ii) عورتیں بچے اور معذور قید کر لیے جائیں۔

(iii) مال واسباب کو اموالِ غنیمت قرار دیا جائے۔

یہ فیصلہ چونکہ تورات کے بھی مطابق تھا۔ لہٰذا یہود نے بھی اس فیصلہ کو بخوشی تسلیم کر لیا۔ چنانچہ اس فیصلہ کے مطابق ۴۰۰ آدمیوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ اور ۳۰۰ اسیران جنگ' جن میں عورتیں بھی شامل تھیں' کو لونڈی غلام بنایا گیا اور مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا۔

**پرویز صاحب کا اصل اعتراض:** یہ تو تھیں منًا اور فداءً کی مختلف صورتیں۔ جن پر آپ ﷺ نے خود بھی عمل کر کے دکھایا اور بعد میں مسلمان حکومتوں میں بھی ان پر عمل ہوتا رہا۔ اب پرویز صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ ملکِ یمین کی جو آیات قرآن میں مذکور ہیں۔ یہ سب مندرجہ بالا آیت کے نزول سے پہلے کے واقعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آیت مندرجہ کا زمانہ نزول معلوم کیا جائے اور وہ پوری آیت یوں ہے۔

﴿ فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا ... پھر جب تم کافروں کے مقابلہ پر آؤ تو ان کی گردنیں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۚ ذَٰلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُم بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ ﴿٤﴾ (محمد ٤٧/ ٤)

اڑا دو حتیٰ کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو تو جو زندہ پکڑے جائیں ان کو مضبوطی سے قید کر لو۔ پھر اس کے بعد ان سے یا تو احسان کرو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو اللہ اگر چاہتا تو وہ خود ہی کافروں سے بدلہ لے سکتا تھا۔ لیکن وہ تو تمہارے آپس کے مقابلہ سے تمہاری آزمائش چاہتا ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔

اب دیکھئے اسلام کے ضابطہ جنگ کے متعلق ایسی روایات ابتدائی ہی ہو سکتی ہیں۔ مولانا مودودی کا یہ خیال ہے کہ یہ سورہ اس وقت نازل ہوئی جب کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت تو مل چکی تھی۔ لیکن ابھی جنگ بدر بھی وقوع پذیر نہیں ہوئی تھی۔ اور نیز یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اساریٰ بدر کے فدیہ کا فیصلہ سورہ محمد کی اسی آیت کے تحت کیا تھا مگر ہمارے خیال میں یہ رائے درست نہیں اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں۔

① اگر بدر کے قیدیوں کے متعلق فیصلہ اسی آیت کے تحت ہوا اور یہ آیت نازل ہو چکی تھی۔ تو پھر مشورہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ نیز یہ کہ اگر اس آیت کے مطابق ہی آپ نے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب کیوں نازل ہوا؟

② جنگ بدر کے قیدیوں کا ذکر سورہ انفال میں ہوا ہے۔ جس کا ترتیب نزول کے لحاظ سے نمبر ۸۸ ہے۔ جب کہ سورہ محمد کا ترتیب نزول کے لحاظ سے نمبر ۹۵ ہے۔ لہٰذا آیت مندرجہ کا نزول اساریٰ بدر سے بہت بعد کا ہے۔ اس کا زمانہ نزول سن ۴ ھ یا سن ۵ ھ ہی ہو سکتا ہے۔

**اعتراض کا جائزہ:** اب جب اس آیت کے زمانہ نزول کی تعیین ہو گئی تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا قرآن میں ایسی آیات بھی ملتی ہیں۔ جن کا تعلق اساریٰ جنگ سے تعلق رکھنے والے ملک یمین سے ہوا اس سوال کا جواب اثبات میں ہے اور چند ایسی آیات درج ذیل ہیں۔

﴿ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ﴿٨﴾ ﴾ (الإنسان ٧٦/ ٨)

"اور وہ خود کھانے کی رغبت رکھنے کے باوجود مسکینوں یتیموں اور جنگی قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔"

یہ سورہ مدنی اور ترتیب نزول کے لحاظ سے اس کا نمبر ۹۸ ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ مومنین کی صفات بیان فرما رہے ہیں جن میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ جنگی قیدیوں کو اپنی رغبت طعام پر ترجیح دے کر کھانا کھلاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اساریٰ بدر کے سلسلہ میں ایک انصاری کا واقعہ بیان کر آئے ہیں۔ اساریٰ بدر تو چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اب یہ اسیر نئے ہی ہو سکتے ہیں۔ اور یہ نئے اسیر جنگ خیبر کے بعد ہی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے۔ یعنی سن ۷ ھ میں۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ إِنَّآ أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَٰجَكَ ٱلَّـٰتِىٓ ءَاتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّآ أَفَآءَ ٱللَّهُ عَلَيْكَ ﴾ (الأحزاب ۳۳/ ۵۰)

اے نبی! ہم نے تمہارے لیے تمہاری وہ بیویاں بھی حلال کر دی ہیں جن کے حق مہر آپ دے چکے ہیں۔ اور تمہاری وہ لونڈیاں بھی جو اللہ نے تمہیں کفار سے مالِ غنیمت کے طور پر دلوائی ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگی قیدیوں میں سے حاصل ہونے والی لونڈیاں جو حکومت کی وساطت سے ملتی ہیں۔ ان کا حق مہر کچھ نہیں ہوتا۔ اور وہ حلال بھی ہوتی ہیں۔ اب اگر یہ لونڈیوں کا جواز اسلام کے چہرہ پر اتنا ہی بدنما داغ تھا تو اللہ نے اپنے نبی کو اس کی اجازت کیوں دی جو ساری امت کے لیے اسوہ ہیں؟ آپ نے سن ۷ ھ میں حضرت صفیہ کو آزاد کر کے اس سے نکاح کیا۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِيَسْتَـْٔذِنكُمُ ٱلَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَـٰنُكُمْ ﴾ (النور ۲۴/ ۵۸)

اے ایمان والو! تمہارے غلام اور لونڈیوں کو بھی چاہیئے کہ (گھر میں داخلہ کے وقت) تم سے اذن حاصل کریں۔

یہ آیت کا ٹکڑا سورہ نور سے ہے جس کا زمانہ نزول اواخر سن ۶ ھ ہے (یعنی غزوہ بنی مصطلق واقعہ اِفک کے بعد) اور ترتیب نزول کے لحاظ سے اس کا نمبر ۱۰۲ ہے۔

اب اگر پرویز صاحب یہ کہیں کہ ملک یمین کا تعلق جنگی قیدیوں سے نہیں بلکہ وہ لونڈیاں غلام ہیں جو پہلے سے ہی چلے آرہے تھے تو یہ بات بھی درست نہیں کیونکہ ایک طرف تو ہمیں قرآن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ابتداء سے لونڈی غلام رکھنے کی حوصلہ شکنی کی ہے اور کئی طرح کے اقدامات سے اس سلسلہ کو ختم کرنا چاہا ہے۔ اب ہجرت سے پہلے کے ۱۳ سال اور ہجرت کے بعد کے ۶ سال یعنی ۱۹ سال میں بھی یہ سلسلہ ختم نہ ہو تو حیرت کی بات ہے۔ اس کی یہی صورت نظر آتی ہے کہ جب جنگی قیدی بھی شامل ہوتے رہے ہوں۔

**رخصت کی حکمت:** اب سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کی نگاہ میں لونڈی غلاموں کا وجود ایک مذموم فعل ہے تو اسے حکماً بند کیوں نہ کر دیا گیا۔ تو میرے خیال میں اس کی درج ذیل وجوہ ہو سکتی ہیں۔

① رخصت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدقہ اور رحمت ہوتی ہے۔ رسول اللہ رحمۃ اللعالمین تھے اور وہ اس طرح لونڈی غلام بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود جنگ خیبر میں ایسا موقع بن ہی گیا۔ تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ تا قیامت مسلمانوں کو کوئی اب واقعہ پیش آ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس رخصت کو مطعون کرنے کی بجائے اس کا انعام ہی سمجھنا چاہیئے۔

اب اگر اس رخصت سے مسلمان ناجائز فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یا کوئی اسلام دشمن اس رخصت کو غلط جامہ پہنا کر لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنا چاہتا ہے تو اس میں اسلام کا کیا قصور ہے۔

② غلام اور لونڈیوں سے فائدہ حاصل کرنا بھی ایک رخصت ہے۔ حکم نہیں اب اگر آج کے دور میں

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تو اس رخصت سے زندگی بھر فائدہ نہ اٹھانے سے دین میں کونسی کمی آجائے گی۔

③ ان دنوں محکمہ جیل یا جیل کے لیے بڑے احاطے اور اس کا انتظام تو تھا نہیں۔ لہٰذا مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے بغیر کوئی دوسرا چارہ بھی نہ تھا۔ اور جب مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا تو پھر فحاشی کا ایک نیا باب کھلنے کا امکان تھا۔ اس امکان سے روکنے کی خاطر ان سے تمتع کی بھی اجازت دی گئی۔ پھر اس تمتع پر بھی طرح طرح کی پابندیاں [1] عائد کر دی گئیں۔

مگر آج کے دور میں اس طرح کی تقسیم کی ضرورت نہیں رہی۔ آج حکومتوں کے پاس ایسے کیمپوں کے انتظامات موجود ہیں جن میں ہزاروں قیدیوں کی رہائش کا انتظام موجود ہوتا ہے۔ ایسے کیمپوں میں اگر مرد وزن کو آزادانہ اختلاط کی روک تھام کا بندوبست کر دیا جائے تو پھر مسلمانوں میں تقسیم کی ضرورت ہی پیش نہیں آسکتی۔ اور ایسے قیدیوں کو اس وقت تک ان کیمپوں میں رکھا جائے گا جب تک باہمی تبادلہ کی شکل یا کوئی اور باعزت حل نہ نکل آئے۔

جہاد قیامت تک کے لیے فرض ہے اور جنگ میں ہر طرح کے حالات متوقع ہوتے ہیں۔ اور صاف بات تو یہ ہے کہ اسلام فحاشی کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرتا۔ اس فحاشی کے سدباب کے لیے لونڈیوں سے تمتع کی رخصت دی گئی ہے۔ اور اس پر کلیتاً پابندی عائد کرنا اللہ تعالیٰ کو منظور ہی نہ تھا۔

---

[1] اسلام فاتح فوجیوں کو قیدی عورتوں کی عصمت دری کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ جیسا کہ عام دنیا کا دستور ہے کہ فاتح فوجیوں کو مقبوضہ علاقوں کی عورتوں یا قیدی عورتوں سے تمتع کی کھلی چھٹی دی جاتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے فاتح فوج کا ایسا فعل بھی بلاشبہ زنا میں داخل ہے۔ ہاں اگر اسلامی حکومت کی وساطت سے قیدی عورتیں فاتح فوج میں تقسیم کی جائیں تو اسی کا نام ملکِ یمین ہے اور یہی نکاح کی دوسری شکل بن جاتی ہے۔ اس میں حق مہر بھی نہیں ہوتا۔ اور مالک اپنی اپنی ملکِ یمین سے تمتع بھی کر سکتا ہے۔ ہاں اگر حاملہ ہو تو جب تک حمل وضع نہ ہو اس سے صحبت نہیں کر سکتا۔ پھر اگر وہ لونڈی مالک سے صاحب اولاد ہو جائے تو مالک کی وفات کے بعد از خود آزاد ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی اسے فوراً آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے تو یہ باعث اجر و ثواب ہے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



# ⑬ رجم اور حدِّ رجم

زنا کی سزا کے متعلق سب سے پہلے درج ذیل حکم نازل ہوا تھا:

﴿ وَٱلَّٰتِى يَأْتِينَ ٱلْفَٰحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ فَٱسْتَشْهِدُوا۟ عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ ۖ فَإِن شَهِدُوا۟ فَأَمْسِكُوهُنَّ فِى ٱلْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّىٰهُنَّ ٱلْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ ٱللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ﴿١٥﴾ وَٱلَّذَانِ يَأْتِيَٰنِهَا مِنكُمْ فَـَٔاذُوهُمَا ۖ ﴾ (النساء ٤/ ١٥-١٦)

"تم میں سے جو عورتیں بدکاری کریں ان پر چار مردوں کی گواہی لاؤ۔ پھر اگر وہ چاروں گواہی دے دیں تو تم ایسی عورتوں کو گھروں میں اس وقت تک قید رکھو کہ وہ مر جائیں۔ یا پھر خدا ان کے لیے کوئی دوسری راہ مقرر کر دے اور دو مرد جو تم میں سے اس جرم کا ارتکاب کریں تو ان دونوں کو ایذا دو۔"

یہ آیات سورہ نساء کی ہیں اور یہ سورہ جنگ احد کے بعد سے لے کر سن ۴ ھ کے اواخر تک مختلف اوقات میں نازل ہوتی رہی ہے۔ ترتیب نزول کے لحاظ سے اس کا نمبر ۹۲ ہے۔ مندرجہ بالا آیت سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

① مرد و عورت دونوں کے لیے ابتدائی سزا ان کو ایذا پہنچانا تھا۔ جس میں لعنت ملامت اور مار پیٹ سب کچھ شامل ہے۔ البتہ عورتوں کے لیے یہ اضافی سزا تھی کہ تازیست انہیں اپنے گھر میں نظر بند رکھا جائے۔ (جیسا کہ پردہ کے احکام کا بھی بیشتر حصہ عورتوں پر لاگو ہوتا ہے)

② ایسی سزا کا حکم عارضی اور تاحکم ثانی ہے۔ جس کی دلیل آیت کے الفاظ ﴿ أَوْ يَجْعَلَ ٱللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ﴾ ہیں۔

③ یہ سزا حکومت سے نہیں بلکہ معاشرہ سے تعلق رکھتی تھی۔

④ سن ۶ ھ میں واقعہ اِفک پیش آیا جس کے نتیجہ میں سن ۶ ھ کے اواخر میں سورہ نور نازل ہوئی اس میں زنا کی سزا مقرر کر دی گئی۔ ارشاد باری ہے:

﴿ ٱلزَّانِيَةُ وَٱلزَّانِى فَٱجْلِدُوا۟ كُلَّ وَٰحِدٍ مِّنْهُمَا مِا۟ئَةَ جَلْدَةٍ ۖ ﴾ (النور ٢٤/ ٢)

"زانی مرد ہو یا عورت ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔"

مگر اس آیت میں جو زنا کی سزا مقرر کی گئی ہے وہ صرف کنوارے زانی' مرد ہو یا عورت کے لیے ہے۔ اور اس کی دلیل اس سے اگلی آیت ہے۔ جو یوں ہے:

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



﴿ اَلزَّانِي لَا يَنكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَآ إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذَٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣﴾ ﴾ (النور ٢٤/ ٣)

"زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ یا مشرکہ عورت کے ساتھ اور زانیہ نہ نکاح کرے مگر زانی یا مشرک مرد کے ساتھ اور مومنوں پر یہ چیز (یعنی زانی یا مشرک سے نکاح) حرام کر دیا گیا ہے۔"

سورہ نور میں مذکورہ سزا صرف کنواروں کے لیے ہے: اب دیکھئے اس آیت میں۔

① جن زانیوں کی سزا کا ذکر ہے۔ ان کے ساتھ نکاح کی بھی ممانعت ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ مرد اور عورت غیر شادی شدہ ہوں۔

② زانی مرد سے نکاح کا حق صرف زانیہ عورت کو دیا گیا ہے۔ اب اگر وہ پہلے ہی شادی شدہ ہو تو زنا کے بعد اس کا مستحق کوئی زانی ہی ہو سکتا ہے نہ کہ اس کا پہلا خاوند جس کا کوئی قصور بھی نہیں۔ اس طرح یہ سزا زانی کے حق میں تو مفید رہے گی مگر پرہیز گار خاوند کے حق میں خانہ بربادی کا باعث بنے گی اور یہ بات مشیت الٰہی کے خلاف ہے۔

ہمارے اس دعویٰ کی تائید قرآن کریم کی درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے:

﴿ وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ۚ ..... فَإِذَآ أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ۚ ﴾ (النساء ٤/ ٢٥)

اور تم میں سے جو لوگ مومن آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو وہ تمہاری مومن لونڈیوں سے نکاح کر لیں..... پھر اگر وہ لونڈیاں نکاح کے بعد بھی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں کو دی جائے۔

لونڈی کی سزائے زنا: اب دیکھئے اس آیت میں پہلی بار جو لفظ مُحْصَنٰت ہے اس کا معنی تو آزاد غیر شادی شدہ عورت کے سوا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ جس سے نکاح کی ہدایت کی جا رہی ہے۔ اور دوسری بار جو اسی آیت میں مُحْصَنٰت کا ذکر آیا ہے تو اس کا معنی بھی لامحالہ "آزاد غیر شادی شدہ عورت ہی" لینا پڑے گا۔ اور آزاد غیر شادی شدہ زانیہ کی سزا سو درے ہے۔ تو اس لحاظ سے منکوحہ لونڈی جو زنا کرے اس کی سزا غیر شادی شدہ آزاد عورت سے نصف یعنی ۵۰ کوڑے ہے۔

نصف رجم: یہ آیت جہاں اس بات کی دلیل مہیا کرتی ہے کہ سورہ نور میں بیان شدہ سزا صرف کنوارے مرد و عورت کی ہی ہو سکتی ہے۔ وہاں یہ آیت پرویز صاحب کے ایک اعتراض کا جواب بھی مہیا کر دیتی ہے۔ منکرین حدیث کا اعتراض یہ ہے کہ شادی شدہ عورت کی سزا آپ کے خیال کے مطابق رجم ہے اور شادی شدہ لونڈی کی سزا قرآن کے مطابق شادی شدہ عورت کی سزا کا نصف ہے۔ اور یہ نصف رجم بنتی ہے۔ اور

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



نصف رجم چونکہ ممکن نہیں فلہذا حدیث میں وارد شدہ سزا درست نہیں ہو سکتی۔ درست بات یہ ہے کہ عورت اور مرد چاہے کنوارے ہوں یا شادی شدہ' بلا امتیاز سب کی سزا سو کوڑے ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ لغوی لحاظ سے مُحْصَنٰت [1] کا ترجمہ شادی شدہ آزاد عورت بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن آیت مذکورہ بالا میں چونکہ پہلی بار کا لفظ مُحْصَنٰت کا ترجمہ "محض آزاد کنواری" ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس میں سزا بھی اس کی تجویز ہوئی ہے اور شادی شدہ لونڈی کی سزا بھی اسی "آزاد کنواری" کی سزا کا نصف ہے۔ اب منکرین حدیث فریب یہ دیتے ہیں کہ مُحْصَنٰت کا ترجمہ "آزاد بیاہی عورت" کر کے اس پر مندرجہ بالا اعتراض وارد کر دیتے ہیں۔

حد رجم: اب یہ تو واضح بات ہے کہ شادی شدہ مرد و عورت کا زنا کرنا کنوارے جوڑے کے زنا کرنے سے شدید تر جرم ہے۔ زنا کی بھی کئی قسمیں ہیں ایک یہ کہ کنوارا لڑکا اور لڑکی زنا کریں۔ اس قسم کے زنا کو سابقہ تہذیبوں میں معیوب ضرور سمجھا جاتا رہا لیکن قابل دست اندازی سرکار جرم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ سابقہ شریعتوں میں بھی ایسے زنا کی سزا نسبتاً کم ہی تجویز کی گئی تھی۔ دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی کنوارا کسی شادی شدہ عورت سے زنا کرے یا اس کے برعکس اسے (Audultry) کہتے ہیں اور تیسری قسم یہ ہے کہ فریقین شادی شدہ ہوں۔ یہ اقسام سابقہ تہذیبوں اور علی ہذا القیاس شریعتوں میں بھی ایسے جرائم سمجھے جاتے رہے ہیں۔ جن میں حکومت مداخلت بھی کر سکتی ہے اور فریقین میں سے ہر کسی کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ وہ ایسا دعوی عدالت میں لے جائے۔

اسلام نے سب سے پہلے تو فحاشی کے ذرائع کا سدباب کیا۔ سورہ احزاب جو سورہ نور سے تقریباً ایک سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ میں مسلمان عورتوں کو حکماً کہا گیا کہ وہ محرم رشتہ داروں کے سوائے دوسروں کے سامنے زیب و زینت ظاہر نہیں کر سکتیں۔ ان کا اصلی مقام گھر ہے لہٰذا وہ دور جاہلیت کی طرح گھر سے باہر اپنی زیب و زینت کا اظہار بھی نہیں کر سکتیں۔ اور اگر ضرورتاً جانا پڑے تو بڑی چادر اوڑھ کر ہی جا سکتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ پھر اس سورہ نور میں۔ جس میں زنا کی سزا کا ذکر ہے مزید ایسے بہت سے احکامات دیئے گئے۔ جو فحاشی کے سدباب کا ذریعہ تھے۔ قرآن نے سابقہ تہذیبوں یا شریعتوں کے دستور کو چھوڑ کر کنوارے جوڑے کے زنا کو ہی جرم کی اصل بنیاد قرار دے کر اس کی سزا سو درے مقرر کی اور ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ معاشرہ میں جو لوگ مجرد ہیں خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد' غلام ہو یا لونڈی سب کے نکاح کر دیئے جائیں نکاح کے سلسلہ میں ان کو تمام ممکنہ سہولتیں دی گئیں۔ اس کے باوجود بھی جو

---

[1] لونڈی کا آزاد ہونا بھی احصان (یا زنا سے بچاؤ) کا ذریعہ ہے اور نکاح بھی۔ آزاد عورت تو ایک لحاظ سے پہلے ہی محصن ہوتی ہے۔ شادی کے بعد اِحصان کا دوسرا درجہ بھی حاصل کر لیتی ہے تاہم لغوی لحاظ سے ہم محض آزاد اور کنواری عورت کو بھی محصن کہہ سکتے ہیں اور شادی شدہ عورت کو بھی خواہ وہ لونڈی ہو یا آزاد۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



لوگ مہر کی رقم یا بیوی کے نان ونفقہ کی بھی طاقت نہیں رکھتے تھے انہیں پاک دامن رہنے کی ہدایات دی گئیں۔ ارشاد باری ہے:

﴿ وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ۚ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٢﴾ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ﴾ (النور ٢٤/ ٢٣-٣٣)

"تم میں جو لوگ بے زوج ہیں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہیں ان سب کے نکاح کردو اگر وہ غریب ہیں تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا اور بہت جاننے والا ہے۔ اور جو لوگ نکاح رشتہ یا بیوی کا مہر اور نان ونفقہ نہ پائیں' انہیں بھی پاکدامن رہنا چاہیئے تاآنکہ اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کردے۔"

اب یہ تو واضح ہے کہ ان احکامات اور حدود وقیود کے بعد بھی زنا کا زیادہ خطرہ نوجوان اور بے زوج قسم کے لوگوں یعنی کنوارے مردوں اور کنواری عورتوں سے ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس شہوت کی تکمیل کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن نے ایسے ہی لوگوں کے زنا کے جرم کو اصل بنیاد قرار دیا ہے۔ رہا شادی شدہ مرد وعورت کا زنا تو یہ دو لحاظ سے اصل جرم سے شدید تر ہوتا ہے ایک یہ کہ ایسے اشخاص معاہدہ نکاح کی عہد شکنی کرتے ہیں۔ دوسرے ایک جائز ذریعہ تکمیل خواہش موجود ہونے کے باوجود اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کی سزا بھی شدید تر ہونی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی سزا وہی رہنے دی جو شریعت موسوی میں موجود تھی اور جس کی طرف قرآن میں واضح اشارات بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ارشاد باری ہے:

﴿ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ ۚ قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ ﴾

"اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا جو تم پر ایسی بہت سی باتیں ظاہر کر دیتا ہے جنہیں تم کتاب سے چھپاتے ہو اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر دیتا ہے۔ بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور حق نما کتاب آگئی۔" (المائدۃ ٥/ ١٥)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے ہاں تین طرح کے احکام تھے۔

1. ایک وہ جن پر یہود کا عمل تھا۔ قرآن نے ایسے احکام سے تعرض نہیں کیا۔
2. دوسرے وہ احکام جنہیں وہ چھپاتے تھے۔ خواہ اس طرح وہ انہیں کتاب سے گم کر دیتے اور خواہ اس طرح کا کہ ان کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کے احکام سے قرآن نے تعرض کیا اور ایسے احکام پھر دو طرح کے تھے۔

(الف) ایسے احکام جنہیں وہ چھپاتے تھے اور آپ ﷺ نے انہیں ظاہر کر دیا اور یہ بھی بہت سے تھے۔

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



(ب) ایسے احکام جنہیں وہ چھپاتے تھے اور آپ نے ان سے درگزر فرمایا اور ایسے بھی بہت سے احکام تھے۔

پھر ظاہر کرنے کے لحاظ سے بھی دو صورتیں تھیں ایک یہ کہ ایسے احکام کا اظہار قرآن کریم کے ذریعہ کر دیا۔ اور دوسرے یہ کہ رسول اللہ نے ان کا اظہار زبانی طور پر کر دیا اور وہ قرآن کریم میں مذکور نہیں۔ حد رجم اسی قبیل سے ہے۔ جس کی تفصیل بخاری میں یوں مذکور ہے۔

یہودی زانی جوڑے کا رجم: ''عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم کے پاس ایک یہودی اور ایک یہودن لائے گئے جنہوں نے بدکاری کی تھی۔ آپؐ نے یہودیوں سے پوچھا۔ تم اپنی کتاب میں اس کی کیا سزا پاتے ہو؟'' انہوں نے کہا کہ ''ہمارے عالم تو اس کی سزا منہ کالا کرنا اور دم کی طرف منہ کر کے گدھے پر سوار کر کے پھرانا بتاتے ہیں'' یہ سن کر عبداللہؓ بن سلام نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ! ان سے تورات منگوایئے۔ ''جب تورات آگئی تو ایک یہودی نے رجم کی آیت پر ہاتھ رکھ دیا اور اس سے پہلے اور بعد کی آیتیں پڑھنے لگا۔ عبداللہؓ بن سلام نے اس سے کہا ذرا اپنا ہاتھ تو اٹھا جب اس نے ہاتھ اٹھایا تو رجم کی آیت اس کے ہاتھ تلے سے نکلی۔ آخر آپ نے ان دونوں کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ دونوں بلاط کے پاس رجم کیے گئے اور میں نے دیکھا کہ یہودی یہودن پر جھک گیا تھا۔'' (بخاری 'کتاب المحاربین' باب الرجم فی البلاط)

امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث کو کتاب الحدود کے بجائے کتاب المحاربین میں لائے ہیں۔ شادی شدہ مرد وعورت جو زنا کے مرتکب ہوں۔ امام بخاری کا ان کے متعلق اجتہاد یہ ہے کہ ایسے لوگ محض زانی نہیں بلکہ ایسے لوگ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ﴾ کے ضمن میں آتے ہیں اور ایسے لوگوں کے لیے جو سزائیں قرآن میں مذکور ہیں ان میں ایک یُقَتَّلُوْا بھی ہے یعنی کسی کو ایذائیں دے کر بری طرح سے مار ڈالنا۔ اور وہ رجم کو بھی اسی قسم کی سزا سمجھتے ہیں۔ لہٰذا کتاب المحاربین میں درج کیا۔ دوسرے محدثین صحاح اسے کتاب الحدود میں لائے ہیں۔ واقعہ سب کتابوں میں ملتا جلتا ہے اور سزائے رجم پر سب متفق ہیں۔

اب اگر مسلم [1] اور ابوداؤد [2] کی روایات کو بھی دیکھا جائے تو اس واقعہ کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں۔

خیبر کے یہودیوں میں سے ایک شادی شدہ عورت اور شادی شدہ مرد نے زنا کیا۔ تورات میں اس کی سزا رجم تھی۔ انہوں نے سوچا کہ مسلمانوں کی شریعت' شریعت موسوی سے نرم ہے۔ لہٰذا رجم سے بچنے کے لیے یہود کا ایک وفد مجرموں کو ساتھ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دل میں یہ طے کیا تھا کہ اگر فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق طے ہوا تو تسلیم کر لیں گے۔ ورنہ نہیں۔ اس وفد نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ ''اگر شادی شدی مرد وعورت زنا کریں تو اس کی سزا کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے پوچھا ''میرا فیصلہ مانو

---

[1] مسلم کتاب الحدود' باب حد الزنا [2] ابو داؤد' کتاب الحدود' باب رجم الیہودیین

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



گے؟" فریقین نے اقرار کیا۔ اسی وقت جبریل امین یہ حکم لے کر نازل ہوئے کہ ان کی سزا رجم ہے۔ آپ نے فیصلہ سنایا تو انہوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ ان کے عالموں کو بلائیں اور بالخصوص صوریا کے بیٹے کو۔ پھر ان کا حلیہ بھی آپ نے بیان کر دیا۔ آپ ﷺ نے یہود سے کہا اچھا ابن صوریا کو جانتے ہو وہ کہنے لگے ہاں۔ اس سے بڑھ کر بڑا عالم روئے زمین پر نہیں جب وہ آگیا تو آپ نے اسے کہا میں تمہیں اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ پر تورات نازل فرمائی۔ تورات میں اس جرم کی سزا کیا ہے؟ اس نے کہا آپ نے بہت بھاری قسم دی ہے مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے غلط بیانی سے کام لیا تو یہ مجھے جلا ڈالے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ تورات میں اس جرم کی سزا رجم ہی ہے۔ مگر جب ہمارے اشراف میں زنا کی کثرت ہوئی تو کچھ عرصہ تک تو یہ رہا کہ اشراف کو چھوڑ دیتے اور کمزوروں پر حد جاری کرتے۔ پھر ہم نے طے کر لیا کہ رجم کی بجائے ایسی سزا مقرر کی جائے جو شریف و وضیع سب پر جاری کی جا سکے۔ اور وہ تھی منہ کالا کرنا' جوتے لگانا' گدھے پر اس طرح سوار کرنا کہ منہ دم کی طرف ہو" آپ نے ان دونوں پر رجم کا حکم جاری کیا۔ اور فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ اَوَّلُ مَنْ اَحْيَا اَمْرُكَ إِذَا أَمَاتُوْا» "یا اللہ! میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے ایسے حکم کو زندہ کیا جسے یہودیوں نے ختم کر ڈالا تھا۔"

چنانچہ آپ ﷺ کے حکم سے ان دونوں پر حد جاری کی گئی اور سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۴۱ تا ۵۰ یہود کے اس قصہ رجم کے متعلق نازل ہوئیں"

اب دیکھئے بخاری میں عبداللہ بن سلام کا ذکر ہے مسلم کی ایک روایت میں عبداللہ بن سلام اور دوسری میں دو علماء کا ذکر ہے۔ اور ابوداؤد میں عبداللہ بن سلام کے علاوہ ابن صوریا کا بھی ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے آپ نے دو علماء کی شہادتیں لینے کے بعد اور ان پر اتمام حجت کر کے ان کے رجم کا فیصلہ کیا تھا۔

اب متعلقہ آیات میں سے صرف پہلی آیت نمبر ۴۱ کا درج ذیل حصہ ملاحظہ فرمایئے جس میں اس واقعہ رجم کا پس منظر بتایا گیا ہے۔

﴿ وَمِنَ ٱلَّذِينَ هَادُواْ سَمَّٰعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّٰعُونَ لِقَوْمٍ ءَاخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ يُحَرِّفُونَ ٱلْكَلِمَ مِنۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهِۦ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِن لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَٱحْذَرُواْ ﴾ (المائدۃ ۵/ ۴۱)

اور یہودیوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو جھوٹ کے لیے جاسوسی کرتے پھرتے ہیں اور ان لوگوں کو بہکانے کے لیے جاسوسی کرتے ہیں جو تمہارے پاس نہیں آئے وہ تورات کی آیات کو ان کے مقامات سے آگے پیچھے کر ڈالتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر تم کو ایسا حکم ملے تو اسے قبول کرنا اور ایسا نہ ملے تو اس سے احتراز کرنا۔

رجم کی سزا فی الواقع قرآن میں تصریحاً مذکور نہیں۔ تاہم تورات میں تصریحاً مذکور تھی۔ جسے یہودی

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



لوگوں نے اوجھل کر دیا تھا۔ آپؐ نے اسی منزل من اللہ سزا پر عمل فرمایا۔ اسی کے مطابق یہودی جوڑے کا فیصلہ کیا۔ اور اسی کے مطابق مسلمان شادی شدہ زانیوں کو بھی سزا دی۔ اور ایسے واقعات ایک دو نہیں۔ چار پانچ ہیں۔ جن میں حضور ﷺ نے رجم کی سزا دی۔ اور صحاح ستہ میں یہ واقعات مختلف طرق سے اتنی زیادہ تعداد میں مذکور ہیں۔ کہ ایسی احادیث حدِ تواتر کو پہنچتی ہیں جن سے انکار ممکن نہیں"

**کیا حدِ رجم قرآن کے خلاف ہے؟:** منکرینِ حدیث کی طرف سے اکثر یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے۔ کہ یہ سزا قرآن کے خلاف ہے۔ حالانکہ حقائق اس کے خلاف ہیں۔ زنا کے جرم کی نسبت سے معاشرہ میں ان کی چار قسمیں ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

① اصل بنیاد کنوارے مرد اور کنواری عورت کے زنا کو قرار دیا گیا ہے اور اس کی سزا سو کوڑے مقرر کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم بہ دلائل قرآنیہ یہ بات ثابت کر چکے ہیں۔

② غلام یا لونڈی کا زنا جب کہ شادی شدہ ہوں۔ ان کی سزا قرآن نے اصل سزا سے نصف مقرر کی ہے۔ ایسے غلام یا لونڈی جو شادی شدہ نہ ہوں اور زنا کے مرتکب ہوں۔ تو ان کے لیے حد نہیں بلکہ تعزیر ہے جو قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے۔ اور یہ قرآن میں مذکور نہیں۔

③ میاں بیوی سے کوئی ایک دوسرے پر زنا کے جرم کا مدعی ہو تو یہ لعان ہے۔ اس میں بدنی سزا کچھ بھی نہیں۔ البتہ اپنی صداقت میں چار گواہوں کی بجائے چار قسمیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ اور پانچویں بار جھوٹے پر لعنت ڈالنا ہوتی ہے۔ اس عمل کے بعد ان میں دائمی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

④ شادی شدہ مرد و عورت کی سزا قرآن میں نہیں۔ تورات میں مذکور ہے۔ آپ نے اسے من و عن قبول کر کے اس پر عمل کیا۔

لیکن آپ کے اس عمل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے چونکہ کسی قسم کا مواخذہ یا گرفت نہیں ہوئی لہٰذا یہ شریعت اور کتاب اللہ کا حصہ ہے حالانکہ..... بعض بالکل چھوٹی چھوٹی باتوں پر جو کہ منشائے الٰہی کے خلاف ہوئیں۔ آپ پر مواخذہ ہوا' مثلاً ایک نابینا سے اِعراض پر' منافقین کو جنگ سے رخصت دینے پر' یا بدر کے قیدیوں کو فدیہ کے عوض چھوڑ دینے پر وغیرہ۔ اگر آپ کا یہ عمل قرآن یا کتاب اللہ کے خلاف تھا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مواخذہ کیوں نہ ہوا؟

عرب میں کچھ دستور ایسے بھی تھے جنہیں اسلام نے جوں کا توں اپنا لیا اور وہ شریعت کا حصہ بن گئے۔ جیسے انسانی جان کی قیمت کا سو اونٹ ہونا یا ایسا مقتول جس کے قاتل یا قاتلوں کا پتہ نہ چل سکے۔ کے سلسلے میں قسامت یہ عرب کے دستور تھے۔ قرآن میں ان دونوں امور کے متعلق کچھ تذکرہ نہیں۔ اس کے باوجود آپ نے ان کے مطابق فیصلے کیے جن پر قرآن نے کوئی گرفت نہیں کی۔ لہٰذا یہ شریعت قرار پائی۔ اور انہیں خلاف قرآن نہیں کہا جا سکتا تو آخر رجم کو' جو تورات میں مذکور ہونے کی وجہ سے منزل من اللہ بھی ہے کیسے قرآن کے خلاف قرار دیا جا سکتا ہے؟

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



**حدِ رجم سے انکار کی اصل وجہ:** حد رجم سے انکار سب سے پہلے اولین منکرینِ حدیث یعنی معتزلہ نے کیا تھا۔ ان کے انکار کی وجہ محض انکار حدیث کے سلسلہ میں ان کی عصبیت تھی۔ مگر آج کے دور میں ایک اور وجہ بھی اس میں شامل ہو گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مغرب ایسی سزاؤں کو وحشیانہ سزائیں سمجھتا ہے۔ لہٰذا آج کا منکرِ حدیث ایسی سزاؤں کو کم سے کم تر کر کے دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ خواہ اسے اس سلسلہ میں اپنے بنیادی نظریات سے ہاتھ کیوں نہ دھونا پڑے۔ اس کی مثال یہ سمجھئے کہ قرآن میں چور مرد اور چور عورت کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے اور لغوی لحاظ سے اس کا اطلاق (الف) اس چور پر بھی ہو سکتا ہے جو ایک پیسہ کی بھی چیز چرائے اور (ب) اس کی سزا کندھے سے کاٹنے پر بھی ہو سکتی ہے۔ (ج) اس کا اطلاق دونوں ہاتھ کاٹنے پر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ منکرینِ حدیث' حدیث میں دی گئی مراعات کو من وعن قبول کر لیتے ہیں۔ طلوع اسلام اکتوبر سن ۱۹۴۹ء میں پرویز صاحب نے لکھا تھا کہ "قرآن نے جو سزائیں بتائی ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ سزائیں ہیں۔ حدود شرعی نافذ کرنے والے احوال و ظروف اور جرم کی نوعیت کے پیش نظران سے کم سزا بھی دے سکیں گے۔" (قرآنی فیصلے ص۱۶۵)

اب سوال یہ ہے کہ قرآن نے جو سزائیں مقرر کر دی ہیں۔ اگر قاضی ان سزاؤں میں احوال و ظروف کے مطابق کمی بیشی کر سکتا ہے۔ تو یہ حد کیا ہوئی؟ حالانکہ خدا تعالیٰ انہیں حدود اللہ کہتا ہے قاضی یہ تو کر سکتا ہے کہ اثبات جرم میں شبہات اور موانعات کا لحاظ رکھے لیکن اثبات جرم کے بعد اسے ہرگز یہ اختیار نہیں کہ ان مقررہ سزاؤں میں کمی یا بیشی کر سکے۔ قاضی احوال و ظروف کے مطابق تعزیر میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ حدود میں کمی وبیشی کرنے کا وہ مجاز نہیں اگر شبہات و موانعات آڑے آتے ہیں تو قاضی یہ کر سکتا ہے کہ حد کو موقوف کر دے لیکن اس میں کمی بیشی نہیں کر سکتا۔

پرویز صاحب کے اس نظریہ سے متعلق کسی نے سوال لکھ بھیجا کہ کیا یہ آپ ہی کا اجتہاد ہے۔ یا اس سے پہلے کہیں اس کی مثال بھی ملتی ہے؟" تو اس کا جواب دیتے ہوئے پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ:

**حدِ سارق:** "جی نہیں۔ یہ ہمارا ہی اجتہاد نہیں تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً چوری کی سزا قطع ید ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ سزا ہے جو قرآن نے متعین کی ہے۔ کس قدر چوری اور کن حالات میں چوری کے جرم میں مجرم اس سزا کا مستحق ہو گا اور کن حالات میں اس سے کم سزا کا سزاوار ہو گا۔ اس کے متعلق فقہ اور روایات دونوں میں تفصیلی مباحث موجود ہیں۔ روایات (مسلم اور بخاری) میں ہے کہ دینار سے کم کی چوری میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ فقہ میں اس کو نصاب کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک نصاب ایک دینار ہے اور بعض کے نزدیک ربع (ایک چوتھائی) دینار یہ تو رہا مقدار کا سوال۔ اب لیجیے احوال و ظروف کو' فقہ کی رو سے چور کو اس وقت تک قطعِ ید کی سزا نہیں دی جائے گی جب اس نے کسی محفوظ جگہ سے نہ چرایا ہو۔" (قرآنی فیصلے ص۱۶۶)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



پھر اس کے بعد مال محفوظ کی تعریف میں "سارق کسے کہتے ہیں" کے ذیلی عنوان کے تحت نسائی کی ایک روایت' ایک اور روایت' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول اور امام ابن حزم کا ایک قول بطورِ حجت پیش فرما رہے ہیں۔ اور نتیجہ یہ پیش فرما رہے ہیں کہ پہاڑوں پر آوارہ چرنے پھرنے والے جانوروں میں سے اگر کوئی جانور لے جائے تو وہ چور نہیں ہوتا۔ بھوکا شخص باغ سے پھل توڑ کر کھالے تو وہ بھی چور نہیں ہوتا۔ قحط کے زمانے میں چوری کرنے والا بھی چور نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان پر قطع ید کی حد جاری نہیں ہوگی۔ البتہ قاضی جرم کی نوعیت کے مطابق اسے سزا دے سکتا ہے۔ (قرآنی فیصلے ص۱۶۶)

ان اقتباسات سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

① بوقتِ ضرورت آپ احادیث تو ایک طرف تاریخ کو بھی بطور استشہاد و حجت پیش فرما سکتے ہیں اور اس پر اپنے نظریہ کی بنیاد قائم فرما سکتے ہیں۔ یہ نصاب سرقہ' یہ مال محفوظ کس قدر چوری اور کن حالات میں چوری یہ سب کچھ آپ کو گوارا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کسی بات کا بھی ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کریم کے مطلق احکام کو خواہ مخواہ مقید بنا رہی ہیں۔

② یہ جو کچھ آپ نے بیان فرمایا یہ سب شبہات اور موانعات ہیں۔ یعنی ایسے چوروں پر چوری کا اطلاق اور جرم کا اثبات نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان پر سے حد ساقط ہو جاتی ہے۔ اور اگر چور اور اس کی چوری ثابت ہو جائے تو اس صورت میں اس پر حد جاری ہوگی اور وہ پوری ہوگی اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اور جب چور یا اس کی چوری ثابت ہی نہ ہو تو حد کیسی؟ پھر تو قاضی نوعیت جرم کے مطابق اسے تعزیر ہی دے سکتا ہے چاہیئے تو یہ تھا کہ کوئی ایسی مثال پیش فرماتے جس میں چور اور اس کی چوری ثابت ہو جانے کے بعد کسی نے خدا کی مقرر کردہ حد میں کمی کی ہو۔ لیکن اتنی لمبی چوڑی تفصیل کے باوجود آپ ایسی دلیل پیش نہیں کر سکے۔

③ چونکہ نسائی کی حدیث ایک اور روایت حضرت عمر کا قول اور امام ابن حزم کا قول یا فقہاء کے اقوال اس قطع ید جیسی وحشیانہ سزا سے رہائی کی صورتیں پیش کر رہے ہیں۔ اس لیے اس وقت ان کی ہر ہر بات قابل قبول اور گوارا ہے۔ لیکن اگر جرم کی شدت کی نوعیت کے پیش نظر خود اللہ کا رسول بھی سزا میں شدت یا کوئی دوسری سزا تجویز کرے تو یہ حضرات دہائی دینا شروع کر دیتے ہیں۔ کہ یہ سزا قرآن کے خلاف ہے۔ قحط کے زمانہ میں چور کو چھوڑ دینا حتیٰ کہ اسے لوٹ مار کی اجازت دینا کیا یہ باتیں صریحاً قرآن کے خلاف نہیں؟ ان کے متعلق دہائی دینا تو درکنار آپ اسے برضا و رغبت قبول فرما لیتے ہیں۔ سَاءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔

آیۃ رجم؟ آیت منسوخ حکم باقی: آیت رجم کا ثبوت حضرت عمر کے آخری ایام کے اس خطبہ میں ملتا ہے۔ جو آپ نے مسجد نبوی میں جمعہ کے دن مسلمانوں کے ایک کثیر مجمع کے سامنے دیا تھا۔ اور اس واقعہ خطبہ کو تقریباً سب محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ اس خطبہ میں قابلِ اعتراض بات حضرت عمر

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ہیں۔

"اس کتاب اللہ میں رجم کے حکم کی بھی آیت تھی۔ جسے ہم نے پڑھا یاد کیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں رجم ہوا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضہ کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا۔ چھوڑ کر مرجائیں کتاب [1] اللہ میں رجم کا حکم، مطلق حق ہے اس پر جو زنا کرے اور شادی شدہ ہو۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت جب کہ اس کے زنا پر کوئی شرعی ثبوت یا حمل موجود ہو....." اس پر اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ آیت موجود تھی تو گئی کہاں؟ (قرآنی فیصلے ص ۱۸۲)

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ وہ منسوخ ہوگئی۔ یہ ناسخ و منسوخ کی بحث چونکہ الگ تفصیل کی محتاج ہے۔ لہٰذا ہم نے اس بحث کو کسی دوسرے مناسب مقام پر درج کر دیا ہے مختصراً یہ کہ جب اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ۔

﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ ۝ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ﴾ "ہم تمہیں پڑھائیں گے جو تم فراموش نہ کرو گے مگر جو اللہ چاہے۔" (الأعلی ۸۷/ ۶۔۷)

تو پھر آخر ان لوگوں کو کیوں اعتراض ہے؟

اب رہی یہ بات کہ اگر آیت منسوخ التلاوت ہے تو اس کا حکم کیسے باقی رہ گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حکم کو باقی رکھنے کا ذریعہ یہ منسوخ التلاوت [2] آیت نہیں بلکہ وہ متواتر احادیث ہیں۔ جن میں مذکور ہے کہ تین صورتوں کے علاوہ کسی کو جان سے مار ڈالنا حرام ہے اور وہ صورتیں یہ ہیں (۱) شادی شدہ، زانی یا زانیہ کو سنگسار کر کے مار ڈالنا (۲) بطور قصاص یعنی قتل ناحق کے بدلے میں قتل اور (۳) قتل مرتد۔ اور ان تمام صورتوں میں قتل کرنا حکومت کا کام ہے۔ عوام کا نہیں۔

یا پھر اس حکم رجم کے باقی رکھنے کا ذریعہ وہ واقعات زنا ہیں جن میں آپ نے رجم کی سزا دی۔

**ایک شبہ کا ازالہ:** بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو خود تو..... سنت کو حجت تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن منکرین حدیث کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ممکن ہے جن جن مواقع پر رسول اللہ نے

---

[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول حسبنا کتاب اللہ منکرین حدیث کو بہت پسند ہے وہ دیکھ لیں حضرت عمر کی مراد کتاب اللہ سے کیا ہوتی تھی۔

[2] جس روایت میں اس منسوخ التلاوت کے الفاظ بیان کیے گئے ہیں یعنی الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھما یہ روایت سند کے لحاظ سے منقطع ہے۔ اس کو سعید بن المسیب حضرت عمر سے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حضرت عمر ﷺ سے سماع ثابت نہیں۔ لہٰذا یہ روایت ضعیف اور ناقابل احتجاج ہے۔ (تفہیم اسلام ص ۲۵۰)

www.wkrf.net (Tahafuz-e-Hadees Foundation)



رجم کی حد جاری فرمائی۔ یہ واقعات سورہ نور کی آیت کے نزول سے پہلے کے ہوں۔ لیکن یہ خیال بھی غلط ہے۔ سورہ نور سن ٦ ھ میں نازل ہوئی تھی اور ہمیں چند ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن میں یہ داخلی شہادت موجود ہے۔ کہ رجم کے یہ واقعات مابعد کے ہیں۔ مثلاً:

1 غامدیہ عورت کا رجم ہوا۔ حضرت خالد بن ولید نے اسے پتھر مارا۔ جس سے خون کے چند چھینٹے حضرت خالد پر پڑ گئے۔ تو آپ نے اس عورت کو گالی دی۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے حضرت خالد کو سخت تنبیہ کی۔ اب دیکھئے یہ حضرت خالد صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سن ۸ھ کے درمیانی عرصہ میں اسلام لائے تھے۔ صلح حدیبیہ سے واپسی پر سورہ فتح نازل ہوئی جس کا ترتیب نزول کے لحاظ سے نمبر ۱۱۱ ہے۔ جب کہ سورہ نور کا نمبر ۱۰۲ ہے۔ لہٰذا غامدیہ عورت والا واقعہ سورہ نور کے نزول سے بہت بعد کا ہے۔

② عسیف یا مزدور لڑکے کے مقدمہ کی پیشی کے وقت ابو ہریرہ خود وہاں موجود تھے۔ اور وہ خود اس روایت کے راوی بھی ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ کُنّا عندالنبی صلی اللہ علیہ وسلم" (بخاری۔ کتاب الحدود۔ باب اعتراف بالزنا) اور اس واقعہ میں اس مزدور کی مالکہ کو رجم کیا گیا۔ اور حضرت ابو ہریرہ جنگ خیبر (سن ۷ھ) کے موقعہ پر آپؐ کے پاس حاضر ہو کر ایمان لائے اور سورہ نور اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

③ یہودی اور یہودیہ کے رجم کے وقت حضرت عبداللہ بن ابی الحارث وہاں موجود تھے وہ خود کہتے ہیں۔ کُنتُ فِیْ مَنْ رجمها جب کہ آپ اپنے دادا کے ساتھ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے۔ (فتح الباری' باب: احکام اهل الذمة' ج: ۱۲' ص: ۱۴۴)

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر رجم کے واقعات سورہ نور کے نزول سے پہلے کے ہوتے تو اس کا سب سے زیادہ علم صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن آپ کی زندگی کے آخری ادوار میں اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس حد رجم پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا تو بھی مجمع میں سے کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان پر اعتراض نہ کیا۔ حالانکہ اس وقت صحابہ کرام کی تعداد بکثرت موجود تھی۔ پھر اس وقت سے لے کر آج تک یہ مسئلہ متفق علیہ چلا آرہا ہے۔ جس کا سوائے منکرین حدیث کے کسی نے انکار نہیں کیا اور آج وحشیانہ سزا کے مغربی تخیل سے مرعوب ہو کر طلوع اسلام ایک طرف تو اس مسئلہ کو پھپھڑوں تک کا زور لگا کر اچھال رہا ہے۔ اور دوسری طرف قرآن میں مذکور شرعی حدود کو "زیادہ سے زیادہ شرعی سزائیں قرار دے رہا ہے۔ اور جہاں کہیں سے بھی کوئی بات ان میں رعایت کی مل جائے وہ تسلیم کرنے پر فوراً آمادہ ہو جاتا ہے۔